قصوروار کون؟

پاکستان شکست وریخت کے دہانے پر

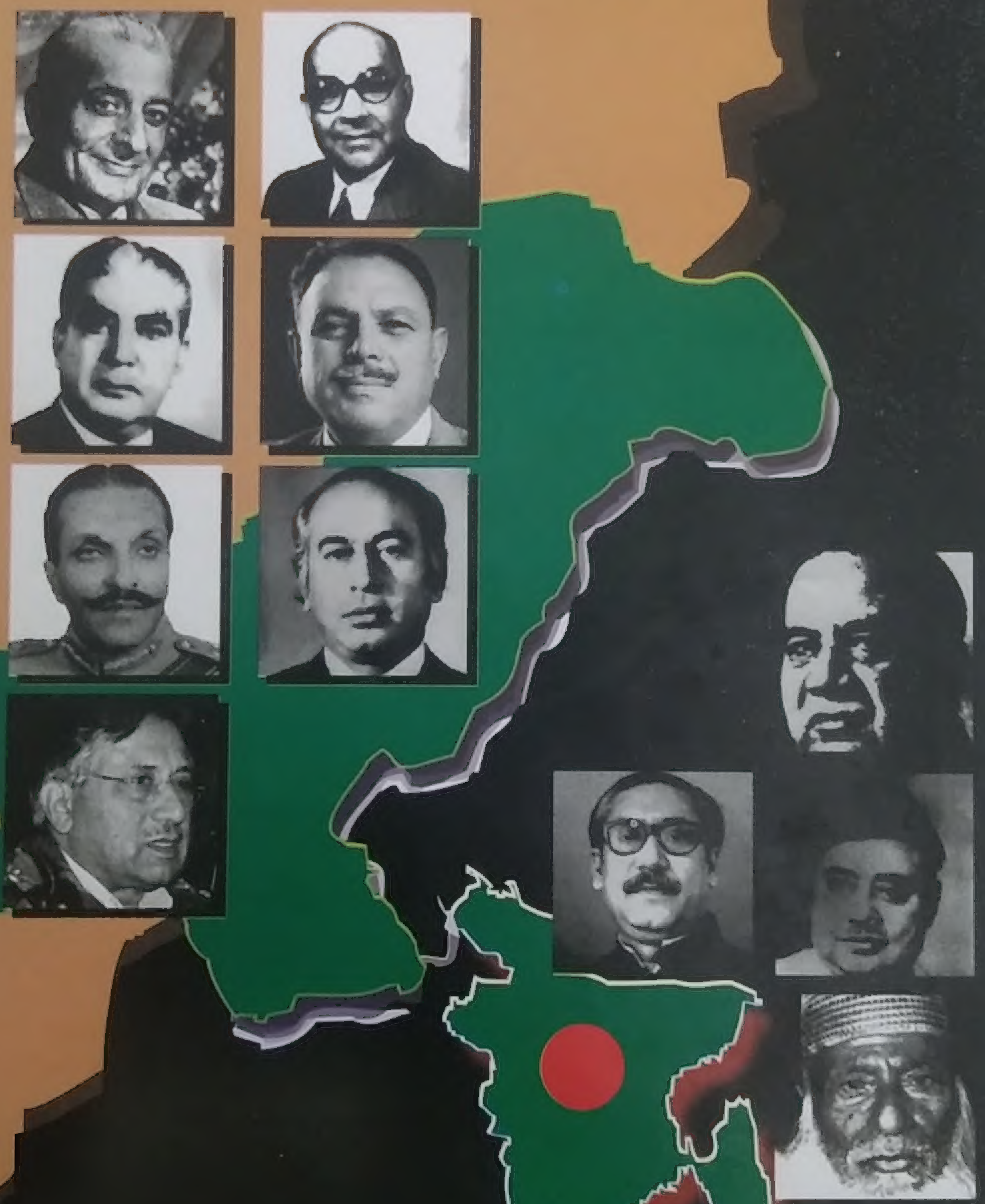

میجر (ریٹائرڈ) عبدالوحید ظفر

شرپسندوں کی سرکوبی کیلئے ایک فوجی دستہ بھیجا گیا جس کی رہنمائی کیلئے ایک رضا کار اُن کے ساتھ گیا۔ مشن کامیاب رہا اور باغیوں کو ٹھکانے لگا دیا گیا لیکن جب وہ رضا کار اپنے گاؤں واپس پہنچا تو پتہ چلا کہ شرپسندوں نے اُس کے تین بیٹوں کو شہید اور اُس کی اکلوتی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے۔ اسی طرح راجشاہی کے قریب گماس پور پُل کی حفاظت کیلئے ایک رضا کار ڈیوٹی پر تھا۔ باغیوں نے اُسے آ دبوچا اور سنگینیں مار مار کر مجبور کرنے لگے کہ جے بنگلہ کا نعرہ لگاؤ۔ مگر وہ سنگینوں کے ہر وار پر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا تا رہا۔ اس طرح وہ پاکستان کیلئے قربان ہو گیا۔

دوسری طرف جو جذبہ بنگلہ دیش کی آزادی کا مکتی باھنی اور اُس کے حامیوں میں پایا جاتا تھا وہ بھی بے مثال تھا۔ راجشاہی ہی کے علاقے روحانپور میں تخریب کاری کے شک میں ایک بنگالی نوجوان کو پکڑ کر پاکستانی فوجی اپنے کمپنی ہیڈ کوارٹر میں لے گئے۔ اُس سے پوچھ گچھ شروع کی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ جب سارے حربے ناکام ہو گئے تو کمپنی کمانڈر نے اپنی سٹین گن اُس کے سینے پر رکھ کر کہا: ''سیدھی طرح بتاؤ ورنہ ساری گولیاں تیرے سینے کے پار کر دوں گا!!'' وہ نیچے جھکا، زمین کو بوسہ دیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے پہلی دفعہ زبان کھولتے ہوئے بولا: ''جے بنگلہ! میں موت کی آغوش میں جانے کیلئے تیار ہوں۔ میرا خون اس مقدس زمین کو یقیناً آزادی سے ہمکنار کر دے گا۔''

مکتی باھنی اور اُس کے حامیوں میں کھلے بندوں نہ سہی مگر دلی طور پر ساری بنگالی قوم شامل تھی لیکن پاکستان کیلئے قربانی دینے والی رضا کار تنظیموں کے ممبران کی تعداد کل ملا کر پچیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ایک طرف تو یہ رضا کار اپنے خاندانوں کی زندگیوں کو داؤ پر لگا کر پاکستان کی سلامتی کی خاطر پاک فوج کے ساتھ تعاون کر رہے تھے دوسری طرف بھٹو اور اُس کے گماشتے جنہوں نے اپنی ہوس اِقتدار کی خاطر پوری بنگالی قوم اور پاک فوج کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک رکھا تھا، اِن محب وطن رضا کاروں کے شانہ بشانہ آ کر قربانیاں دینے کی بجائے مغربی پاکستان میں بیٹھے اِنہیں اپنی مخالف سیاسی جماعتوں کی پرائیویٹ آرمی قرار دے رہے تھے۔ اِن لوگوں کا منہ بند کرنے کیلئے جنرل نیازی نے حکم دیا کہ آئندہ سے اِن رضا کاروں کو 'الشمس' اور 'البدر' کے نام سے پکارا جائے اور اِن میں تمام پارٹیوں کے کارکن شامل ہوں۔ بھٹو کو اپنے رضا کار تو مشرقی پاکستان بھیجنے کی توفیق نہ ملی لیکن اِن لوگوں کا مُنہ ضرور بند ہو گیا۔ (۹۸)

ایک طرف شیخ مجیب کو جیل میں بند کر کے اِنتقال اِقتدار کی بندر بانٹ کے منصوبے بن

رہے تھے دوسری طرف اِندرا گاندھی اور اُس کے جرنیل مشرقی پاکستان پر بھرپور حملے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ مکتی باہنی [illegible] میں "جدوجہد نجات" کے منصوبے [illegible] کے تحت بنگالی فوجیوں اور آبادی کے بیشتر حصے کا اپنے گھر بار چھوڑ [illegible] بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان، حکومتی نظام کو درہم برہم کرنے اور [illegible] پیدا کرنے کیلئے مکتی باہنی کے ذریعے طویل المیعاد گوریلا جنگ کا آغاز، چین [illegible] حصول اور بھارتی فوج کی مدد سے انجام کار حصول آزادی تھا۔

بھٹو کی ہوسِ اِقتدار

فوجی جنتا کی اقتدار سے چمٹے رہنے، بھٹو کی اُن کے شانوں پر سے پھلانگ کر اِقتدار پر قبضہ کرنے کی اُمنگ اور مغربی پاکستان کے دیگر سیاسی رہنماؤں کی آپس کی تکرار بازیوں نے اُنہیں اس قدر بے حس بنا دیا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان کے سیاسی حالات کی سنگینی اور بھارت کے جارحانہ عزائم سے بے نیاز باہمی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ ایک طرف بھٹو صاحب فوجی جنتا کو انتقالِ اِقتدار کے نت نئے فارمولے پیش کرتے دوسری طرف اُن کے مخالف اسے اُن کی ہوسِ اِقتدار قرار دے کر ملکی سالمیت کے خلاف ایک سازش گردانتے۔ مگر عملی طور پر اُن کے خلاف کچھ کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔

شیخ مجیب کی حراست کے بعد فوجی حکومت نے بھٹو صاحب کی ملی بھگت سے عوامی لیگ کو ملک دشمن قرار دے کر اُس کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ اپنے سب سے بڑے سیاسی حریف کو بے بس کرنے کے بعد بھٹو نے جنرل یحییٰ پر زور دینا شروع کر دیا کہ چونکہ بنگالی اب ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتے اِس لئے مشرقی پاکستان میں بے شک مارشل لاء قائم رہے لیکن مغربی پاکستان میں سیاسی حکومت بحال کر کے اِقتدار اُس کے حوالے کر دیا جائے۔ اِس پر نوابزادہ نصراللہ خان نے شدید ردِعمل کا اِظہار کرتے ہوئے کہا: "میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں مغربی پاکستان کی اِس نام نہاد اکثریتی پارٹی کے رویّے کی مذمت کر سکوں۔"

"جب بھٹو کو انتقالِ اِقتدار کی اُمید بر آتی دکھائی نہ دی تو اُس نے شراکتِ اِقتدار کا فارمولا پیش کر دیا۔ جس پر عوامی لیگ کے چند ایک ممبران کو ساتھ ملا کر یحییٰ خان اور دیگر شکست

اور دو سیاست دانوں نے بھی اتفاق کا اظہار کیا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ عوامی لیگ کے جو ممبران اسمبلی جو بغاوت میں ملوث پائے گئے ہیں اُن کو نااہل قرار دے دیا جائے۔ اُن کی نشستوں پر ضمنی انتخابات کروا کر اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۶۹ میں سے ۷۸ عوامی لیگی ممبران قومی اسمبلی کو نا اہل قرار دے کر باقی ماندہ ۹۱ ارکان کی رکنیت اس شرط پر برقرار رہی کہ وہ نہ تو عوامی لیگ کے نام سے اور نہ ہی کسی اور نام سے نئی پارٹی بنا سکتے ہیں۔ البتہ پہلے سے موجود سیاسی پارٹیوں میں شمولیت کے علاوہ وہ اپنی آزاد حیثیت بھی قائم رکھ سکتے ہیں۔ یحییٰ خان نے بھٹو کو مشورہ دیا کہ عوامی لیگ کے ممبران سے رابطہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے ۲۸ جولائی کو عوامی لیگ کے ایس بی اعوان سے ملاقات کی۔ چالیس ارکانِ اسمبلی کی حمایت کے بدلے میں بھٹو نے مشرقی پاکستان کی وزارت علیہ کا اُن سے وعدہ کیا۔" (۶۹)

کٹھ پتلی حکومت

بعض ملکی اور غیر ملکی بہی خواہوں کے اسرار پر سول حکومت کی بحالی کی طرف پہلے خیر سگالی کے قدم کے طور پر ۲۸ اگست کو ٹکا خان کی جگہ ڈاکٹر اے ایم مالک کو مشرقی پاکستان کا نیا گورنر نامزد کیا گیا۔ قبل ازیں مسٹر نور الامین کو یہ عہدہ پیش کیا گیا لیکن اُنہوں نے صحت کی خرابی کا عذر پیش کر کے یہ ذمہ داری قبول کرنے سے اِنکار کر دیا۔ ڈاکٹر مالک نے ۳ ستمبر کو اپنے عہدے کا چارج سنبھالا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے ڈاکٹر مالک کو مشرقی پاکستان میں بہت اِحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُنہوں نے اپنی تقرری کے بعد شہر کی سب سے بڑی مسجد بیت المکرم میں نماز جمعہ ادا کی اور شیخ مجیب الرحمٰن کے گھر جا کر اُن کے اہل وعیال کی خیریت دریافت کی۔ ڈاکٹر مالک کے گورنر بننے کے اگلے دن دوسرا اہم فیصلہ یہ کیا گیا کہ حکومت کے خلاف کارروائیوں میں ملوث تمام لوگوں کیلئے عام معافی کا اعلان کر کے اُنہیں بے خوف اپنے گھروں کو واپس آنے کی اجازت دیدی گئی۔ اِس فیصلے کے تحت اُن لوگوں کے سوا جن پر فرد جرم عائد کی جا چکی تھی حکومت کے خلاف شرانگیزی کے الزام میں ملوث زیر حراست تمام افراد کو رہا کر دیا گیا۔ اگر چہ حکومت کے یہ دونوں فیصلے بنیادی طور پر اچھے تھے اور اِن سے ڈھاکہ اور دیگر بڑے شہروں میں وقتی طور پر کشیدگی کی فضا میں کمی بھی واقع ہوئی لیکن یہ فیصلے اِتنی دیر سے کئے گئے کہ اِن کی افادیت بہت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اِسلئے کہ ستمبر تک

تمام باغی بھارتی علاقہ میں جا چکے تھے اور اُن میں سے اکثر اُن سے تربیت حاصل کر کے مکتی باہنی میں شامل ہو چکے تھے۔ اب اُن سے نپٹنے کیلئے تو بہت مشکل تھا۔ البتہ یہی فیصلہ اگر اس وقت کیا جاتا جب اپریل میں ڈاکٹر مالک نے صدر کو ایسا کرنے کیلئے خط لکھا تھا تو اس کے مفید نتائج برآمد ہونے کا امکان تھا۔ اُس وقت تک اکثر عوامی لیگی رہنما ملک کے اندر ہی زیرِ زمین تھے جو ذاتی تحفظ کی ضمانت پر سامنے آ کر حکومت سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔ لیکن اب وہ کلکتہ پہنچ کر بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت کا حصہ بن چکے تھے۔

مزید یہ کہ گوریلا جنگ اور تخریبی کارروائیوں کی کامیابی سے بہت سے مفرور بنگالی بنگلہ دیش کی آزادی کے بارے میں پُر اُمید تھے۔ وہ جان چکے تھے کہ حالات کا رُخ اُن کی طرف مڑ کر عالمی رائے عامہ اب اُن کی جدوجہد آزادی کے حق میں اُستوار ہو چکی ہے۔ مجیب کی رہائی اور وطن کی آزادی کا اب اُن کو یقین ہو چکا تھا۔ چنانچہ مکتی باہنی کے کسی رکن یا مفرور سیاسی رہنما نے عام معافی کے اعلان کے بعد اپنی وفاداریاں تبدیل نہ کیں۔ البتہ مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر بعض شر پسند لوگ وطن واپس آنے والے پناہ گزینوں کے بھیس میں ملک میں داخل ہو کر تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہو گئے۔

حکومت نے سرحدوں کے ساتھ ساتھ اِستقبالیہ کیمپ بھی قائم کئے جہاں وطن واپس آنے والوں کی بحالی کیلئے راشن اور نقدی کے علاوہ طبی امداد کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ لیکن اِن کیمپوں میں بہت کم لوگ آئے۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لوگوں کا اِعتماد بحال نہیں ہوا تھا۔ وہ ہندوستانی پراپیگنڈے سے اِس قدر متاثر تھے کہ وہ پاکستانی حکومت کی اِن یقین دہانیوں کو کہ ملک میں حالات معمول پر آ گئے ہیں محض پراپیگنڈہ خیال کرتے اور ہندوستان کے اِس پروپیگنڈے کو حقیقت گردانتے تھے کہ واپس جانے سے اُن کی جان، عزت اور بچی کھچی پونجی کو بھی خطرہ ہے۔ حمود الرحمٰن کمشن کی رپورٹ کے مطابق

"وہ تمام سینئر آرمی کمانڈر جن کا تعلق مشرقی پاکستان کی مارشل لاء اِنتظامیہ سے تھا اور وہ سول ملازمین جو مشرقی پاکستان کی سول اِنتظامیہ سے وابستہ تھے، سب نے متفقہ طور پر اِس رائے کا اِظہار کیا کہ ملٹری ایکشن کسی بھی طرح سیاسی تصفیے کا متبادل نہ تھا۔ اِس قسم کے سیاسی تصفیے کیلئے ستمبر ۱۷ء کا درمیانی زمانہ اِنتہائی موزوں تھا جس کے دوران امن وامان کی صورتحال خاصی حد تک معمول پر آ چکی تھی۔ تاہم اِن مہینوں کے دوران مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کے ساتھ سیاسی مذاکرات کے آغاز کی

کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس فضول اور فریب کارانہ اقدامات کا سہارا لیا گیا۔

ملٹری ایکشن کے دوران طاقت کے بے محابہ استعمال اور پاکستانی فوج کے کچھ افسران اور اہلکاروں کے رویوں نے مشرقی پاکستان کے عوام کی ہمدردیاں کھونے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سامان کی نقل وحمل اور رسد کی فراہمی کے ناکام اسباب کی بنا پر دیہاتی علاقوں میں ملٹری آپریشن کے دوران فوجیوں کو لوٹ مار میں ملوث ہونے کا موقع ملا۔ معزز مشرقی پاکستانیوں سے معاملات طے کرنے میں مارشل لاء انتظامیہ کا من مانی کا رویہ اور ماورائے عدالت نوعیت کی ہلاکتوں نے صورت حال کو مزید ابتر کر دیا۔ ہندو اقلیت کے بارے میں فوجی حکام کے رویے نے انہیں بڑے پیمانے پر بھارت منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ پاکستان کے حصے بخرے کرنے کی بھارتی خواہش کوئی ڈھکا چھپا راز نہ تھی۔ اس کے باوجود یحییٰ خاں نے فوری سیاسی تصفیے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ان کی طرف سے کیا گیا عام معافی کا اعلان بھی غیر مؤثر ثابت ہوا۔ اس لئے کہ اول تو یہ کافی تاخیر سے کیا گیا تھا۔ دوسرے اس پر عمل درآمد کرنے میں بھی کافی لیت ولعل سے کام لیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں اُن منتخب نمائندوں کی واپسی بھی نہ ہوئی جو بھارتی حکام کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے تھے۔ وہ اُن کی مرضی کے بغیر واپس آ ہی نہیں سکتے تھے۔'' (۱۰۰)

''چنانچہ وہ قیمتی وقت ضائع کر دیا گیا جس کے دوران بھارت نے موقع پا کر مکتی باہنی کو تربیت دینا شروع کر دی اور اس طرح پاکستانی علاقوں میں گوریلا چھاپہ مار حملوں کا آغاز ہو گیا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے جنرل یحییٰ خاں نے عوامی لیگ کے نااہل قرار دئے گئے منتخب نمائندوں کے حلقوں میں ضمنی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اُن کا یہ منصوبہ بری طرح ناکامی سے دوچار ہوا۔ اسلئے کہ یہ انتخابات مارشل لاء حکام کی نگرانی اور کنٹرول میں منعقد ہوئے تھے جن میں حصہ لینے والے اُمیدواروں کا انتخاب بھی پاکستانی فوج کے ایک میجر جنرل (راؤ فرمان) نے کیا تھا۔ اس صورت حال میں ان نو منتخب نمائندوں کو عوامی ترجمانی کا کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے سویلین گورنر کی حیثیت سے ڈاکٹر مالک کے تقرر اور اُن کی کابینہ کے بھی خاص اثرات برآمد نہ ہو سکے کیونکہ ان حضرات کو عوام کا اعتماد حاصل نہیں تھا۔ ویسے ایک بزرگ سیاستدان ہونے کی حیثیت سے ڈاکٹر مالک کا شخصی طور پر کافی احترام کیا جاتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی حکومت کو اس انداز سے سویلین قالب میں ڈھالنے کی تمام تر کوششیں کسی نہ کسی طرح عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اصل طاقت اب بھی زونل مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے پاس تھی۔ اور اُس زمانے کے مروجہ سیاسی حالات کے تناظر میں امن عامہ کی بحالی اور مواصلاتی نظام کو قائم رکھنے کے حوالے سے فوج کا کردار بدستور ایک غالب عنصر کی حیثیت کا حامل تھا۔''

''ہم نے بھارت کی اُن کوششوں کا بھی جائزہ لیا جو وہ ملٹری ایکشن کے نتیجے میں بھارت جانے

والے پناہ گزینوں کے مسئلے کو بین الاقوامی طور پر اُجاگر کرنے کی غرض سے کر رہا تھا۔ بھارتی پراپیگنڈہ اِس قدر کامیاب تھا کہ فوجی حکومت کی جانب سے مشرقی پاکستان میں بہتری کی تمام تر کوششوں کا عالمی رائے عامہ پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوا۔ 1971ء میں روس بھارت معاہدے کے بعد صورتحال اور پیچیدہ ہوگئی۔ تمام دوست ملکوں بالخصوص ایران، چین اور امریکا نے جنرل یحییٰ کو واضح طور پر بتا دیا تھا کہ وہ بھارت سے جنگ چھڑ جانے کی صورت میں پاکستان کو کسی بھی قسم کی مادی امداد فراہم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہونگے۔ تاہم اِس بین الاقوامی صورتحال کی اہمیت اور نزاکت کو جنرل یحییٰ خان اور اُن کے رفقا سمجھنے میں سے قاصر رہے۔ وہ غلطی پر غلطی کرتے چلے گئے۔ اِنہیں اِس بات کا کوئی اِحساس نہیں تھا کہ یوں پوری دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور کٹ کر رہ جانے کے نتیجے کتنے مہلک اور تباہ کن ہوسکتے ہیں۔'' (۱۰۱)

''جس دِن سے فوجی کارروائی شروع ہوئی تھی بھارتی حکومت نے اپنے بیانات اور عمل سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ بنگالیوں کی بغاوت کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیں گے۔ وہ اِس نادر موقع کو ہاتھ سے جانے دینے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔ جنرل یحییٰ تو ہندوستان سے جنگ نہ چاہتا تھا لیکن ہندوستان مشرقی پاکستان میں امن وامان کے خلاف تھا۔ ایک طرف تو وہ پناہ گزینوں کی واپسی کا واویلا کر رہا تھا دوسری طرف جب پاکستان نے پناہ گزینوں کو واپسی کی اجازت دے دی تو اُس نے اُن کی واپسی کے تمام راستے بند کردئے۔ بلکہ اُس نے اِس سلسلے میں اقوامِ متحدہ کی کوششوں کو بھی ناکام کردیا۔ اِسلئے کہ پناہ گزینوں کی واپسی سے ہندوستان کے پاس پاکستان کی شکست وریخت کا کوئی بہانہ نہ رہتا تھا۔ ہندوستان کے اُس وقت کے وزیرِ دفاع سردار سورن سنگھ کا مؤقف تھا کہ پناہ گزین پاکستان نہیں بنگلہ دیش واپس جائیں گے۔ جبکہ اندرا گاندھی علی الاعلان کہتی تھیں کہ ہمارا اِرادہ ان کو یہاں آباد کرنے کا نہیں ہے لیکن سرحد پار کے دوستوں سے متعلق ہماری کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ چنانچہ ہندوستانی حکومت نے اپنی عوام کو پاکستان کے خلاف اِس قدر جنگی جنون میں مبتلا کردیا تھا کہ ہر جگہ پاکستان کے خلاف جنگ کی باتیں ہونے لگیں۔ ماہرین نے لاکھوں پناہ گزینوں کے بوجھ کو برداشت کرنے کی نسبت برق رفتار جنگ کو بہتر اور کم خرچ قرار دیا۔'' (۱۰۲)

''جس وقت ہم خانہ جنگی میں اُلجھے ہوئے تھے بھارتی فوج کے سربراہ اُس وقت اپنی وزیرِ اعظم کی ہدایات کے تحت اپنی جنگی مشینری کو صیقل کرکے پاکستان پر حملہ کرنے کی بھرپور تیاری میں مصروف تھے۔ اور اُس کی وزیرِ اعظم ازسرِ نو اِنتخابات میں کامیابی کے بعد نئے حوصلے اور ولولے کے ساتھ غیر ملکی رائے عامہ کو پاکستان کے خلاف ہموار کرنے میں مصروفِ عمل تھیں۔ علاوہ ازیں بھارتی وزارت خارجہ نے 9 اگست کو روس کے ساتھ دوستی کے معاہدے کو دفاعی معاہدے میں بدل کر پاکستان پر ایک اور فوجی برتری حاصل کرلی۔

''پاکستان اور چین کے درمیان بھی دوستانہ تعلقات کا معاہدہ موجود تھا جس کے تحت چین نے پاکستان کو اُس کی حاکمیت اور ملکی آزادی کی یقین دہانی کرا رکھی تھی۔ لیکن پاکستان کی اس یقین دہانی کو علاقائی سالمیت اور پاکستان کے اتحاد تک بڑھانے کی بار بار کی کوششیں ناکام رہیں۔ چینی آخر دم تک حاکمیت اور ملکی آزادی کے فارمولے پر قائم رہے۔'' (۱۰۳)

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جس وقت پاکستان اپنی زندگی کے مشکل ترین سیاسی بحران میں مبتلا تھا اور ملک کی بقا کیلئے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ ملک کی سات کروڑ آبادی کی واحد نمائندہ جماعت سے صلح کر کے پاکستان کی سلامتی یا باعزت علیحدگی کی راہ نکالی جاتی اُس وقت بعض گدھ خصلت سیاستدان اُس کے ہیرو کو ٹھکانے لگوا کر ایک دفعہ پھر عقبی دروازے سے اِقتدار پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

جنرل کے ایم عارف اِس اِمر کی تصدیق میں یحییٰ خان کے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے وزیر پروفیسر جی ڈبلیو چودھری کی جنرل ضیاءؔ سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جنرل ضیاءؔ نے جب اُن سے مجیب کے بارے میں پوچھا تو پروفیسر چودھری نے اُنہیں بتایا:

''ستمبر 1971 میں جب صدر یحییٰ ایرانی بادشاہت کے دو ہزار سالہ جشن کی تقریبات میں شرکت کیلئے ایران جا رہے تھے تو بھٹو نے مجھ سے کہا تھا کہ میں صدر کو اِس بات پر راضی کروں کہ مجیب کو جانے سے پہلے ٹھکانے لگا دیا جائے۔ ...... بھٹو نے مجھے کہا تھا کہ یحییٰ ایک کمزور آدمی ہے اور ہوسکتا ہے کہ عالمی دباؤ کے تحت وہ اِقتدار شیخ مجیب الرحمٰن کے حوالے کردے۔ اِس لئے ضرورت اِس امر کی تھی کہ 1971 کے اواخر میں تہران جانے سے پہلے مجیب کا خاتمہ کردیا جائے۔ جب میں نے مرحوم بھٹو کی اس شر انگیز تجویز کا دستاویزی ثبوت جنرل ضیاءؔ کو دیا تو وہ حیرت سے ہکا بکا رہ گئے۔'' (۱۰۳)

پروفیسر چودھری کے بیان کو اگر فوجی ایکشن کے معاً بعد روئیداد خان کی ۲۶ مارچ کو ڈھاکہ ائرپورٹ پر بھٹو سے ملاقات کے دوران اُن سے اِس استفسار کہ ''گولی کس کس کو ماری ہے؟'' کی روشنی میں پرکھا جائے تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ بعض فوجی جرنیلوں سے ساز باز کر کے مجیب کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اس امر کی تصدیق پروفیسر جی ڈبلیو چودھری نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''یہ ایک حقیقت ہے کہ فوج کے بعض جوشیلے (HAWKISH) جرنیل بھٹو کے ساتھ ملی بھگت کر کے اِس بات کے حق میں تھے کہ موقع ملے تو مجیب کو تہہ تیغ کردیا جائے۔'' (۱۰۴)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسٹر ZAB شیخ مجیب کو کیوں مروانا چاہتے تھے؟ کیا مجیب

کی موت کے بعد عوامی لیگ کی اکثریت ختم ہو جاتی ؟ کیا مجیب کے بعد عوامی لیگ کی لیڈر شپ میں خلا پیدا ہو جاتا؟ کیا قمر الزمان، خوندکر مشتاق، تاج الدین احمد اور اسی نوع کے دیگر سرکردہ عوامی لیگی رہنما اِس قابل نہ تھے کہ مجیب کی موت کے بعد عوامی لیگ کی قیادت سنبھال لیتے ؟ کیا شیخ مجیب الرحمٰن کی حراست کے دوران اِن لوگوں نے جد وجہدِ آزادی کو جاری نہیں رکھا تھا؟ شیخ مجیب کے چھ نکات تو بنگالی قوم کی ایک تحریک بن چکے تھے۔ شخصیتوں کے مر جانے سے تحریکیں ختم نہیں ہو جاتیں۔ بلکہ اُن کا قتل تحریکوں کی تکمیل کیلئے مہمیز کا کام دیتا ہے۔ شیخ مجیب کی حراست نے بھی یہی کام کیا۔

مسٹر ZAB جیسے جینئس سیاستدان سے یہ بات ڈھکی چھپی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ عوامی لیگ کی تحریک مرنے نہ پائے۔ وہ اسے نہ صرف زندہ رکھنا چاہتے تھے بلکہ اُس کو مہمیز لگا کر بنگلہ دیش کا قیام یقینی بنانا چاہتے تھے۔ اسلئے کہ قومی سطح پر متحدہ پاکستان میں مسٹر بھٹو کو مجیب کی زندگی میں اِقتدار میں آنے کیلئے خاصی محنت اور وقت کی ضرورت تھی اور یہ دونوں چیزیں اُن کے پاس نہ تھیں ۔ خاص طور پر وقت۔ چنانچہ اُنہوں نے ہر وہ حربہ اِستعمال کیا جس سے بنگلہ دیش کا قیام یقینی ہو سکے۔ اُن کا یہ مطالبہ کہ مشرقی پاکستان میں مارشل لأ قائم رکھا جائے مگر مغربی پاکستان میں اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کردیا جائے بھی اِسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ اِسی لئے وہ آئے دن حکومت پر اِنتقال اقتدار کیلئے دباؤ ڈالتے رہتے۔ چنانچہ انہوں نے ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ کو اپنے ایک پر زور احتجاجی بیان میں حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے کہا:

''ہم حکومت سے تصادم نہیں چاہتے ۔ بہتری اسی میں ہے کہ اِقتدار ہمارے حوالے کردیا جائے۔ اُنہوں نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر حکومت نے اِس سال کے آخر تک جمہوریت بحال کرتے ہوئے اِقتدار اُن کے حوالے نہ کیا تو پاکستان کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بھٹو ملک کی بقا اپنے اِقتدار سے مشروط کر رہے تھے۔'' (۱۰۵)

مشرقی پاکستان کیلئے نامزدگی

مشرقی پاکستان پر متوقع ہندوستانی حملہ کے نتیجہ میں مغربی پاکستان سے فوجی یونٹیں دھڑا دھڑ وہاں منتقل کی جا رہی تھیں۔ جس پلٹن کو مشرقی پاکستان کیلئے نامزد کیا جاتا اُس میں ایک قسم کی صفِ ماتم بچھ جاتی اور بلا امتیاز ہر آفیسر اپنی پہنچ کے مطابق ''ایلی ایلی لما شبقتنی'' کا ورد

الاپتے ہوئے ہر ممکن کوشش کرتا کہ ''کسی نہ کسی طرح یہ پیالہ اُس سے ٹل جائے۔'' جس کی جتنی لمبی پہنچ اُتنے ہی کامیابی کے زیادہ اِمکان۔ اس عرصہ میں انسانی فطرت کا ایک بے حد گھناؤنا پہلو بہت کھل کر سامنے آیا۔ اور وہ ہے منافقت۔ ہر شخص کے دِل میں ایک چور تھا۔ ہر کوئی خود تو کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اپنے آپ کو وہاں جا کر دادِ شجاعت دینے سے معذور ٹھہراتا لیکن دوسروں کو ملکی سلامتی کیلئے قربانی کا درس دینے کیلئے بڑی دور کی کوڑیاں ڈھونڈ کر لاتا اور جو اپنی بدلی کروانے میں ناکام ہوتا وہ پھر بھڑکیں مارنے لگتا کہ ''بھا جی گل ای کوئی نئیں۔ اسیں اُدّ کر دیواں گے۔ اسیں ایہہ پاڑ دیواں گے وغیرہ وغیرہ۔'' آخرِ جی ایچ کیو کو فیصلہ کرنا پڑا کہ ہر وہ فوجی جس کی مشرقی پاکستان بدلی کی جائے گی بلا کسی نہایت ہی ناگزیر عذر کے اُسے ہر صورت میں وہاں ڈیوٹی پر حاضر ہونا پڑے گا۔ چاہے وہ کسی پلٹن کے ساتھ جا رہا ہو یا اکیلا۔

ابھی چند ہی دن قبل ہم نے ۲۱ پنجاب کو مشرقی پاکستان روانہ کیا تھا۔ ہماری پلٹن کی طرف سے دیئے گئے الوداعی بڑے کھانے میں کرنل اِمتیاز وڑائچ اور اُس کے آفیسروں کا مورال بظاہر تو خاصا بلند تھا۔ دلوں کی حالت اللہ جانتا تھا۔ ان میں میرا ایک کلاس فیلو کیپٹن منور احمد بھی تھا۔ اُڑتی اُڑتی خبر تھی کہ مشرقی پاکستان جانے کیلئے ہماری پلٹن کا نمبر بھی لگ گیا ہے۔ چند دن بعد اس خبر کی تصدیق بھی ہوگئی۔ مجھے ابھی مشرقی پاکستان میں چار سال گزار کر آئے ہوئے صرف دو سال کا عرصہ ہی گزرا تھا۔ رولز کے مطابق میں نے اپنی مشرقی پاکستان کی مدت ملازمت مکمل کر لی تھی۔ بہرحال کرنا کیا تھا۔ قہرِ درویش برجان درویش۔ صبر شکر درگاہے لیکھا۔ ان حالات میں انگریزی زبان کا محاورہ تو بہت گندا سا ہے مگر جرمن زبان کا محاورہ ہے: "Abwarten und Tee trinken" جس کا مطلب ہے ''انتظار کرو اور چائے پیو!!'' یعنی حالات کو اللہ کی رضا پر چھوڑ کر صبر سے انتظار کرو! چنانچہ میں نے بھی واویلا کرنے کی بجائے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔ جی ایچ کیو کے احکام کے مطابق نومبر کے پہلے ہفتے میں ہماری پلٹن مشرقی پاکستان جانے کیلئے تیار تھی۔

باب ۱۰

بھارتی جارحیت

۲۱ نومبر کو عید تھی مگر حالات کی سنگینی کی بنا پر کرنل نسیم کو اڈوانس پارٹی کو لے کر عید سے صرف چند دن قبل مشرقی پاکستان کیلئے روانہ ہونا پڑا۔ میجر محمد سعید سیکنڈ اِن کمان اور مجھے دو ہفتے بعد مین باڈی کو لے کر آنے کیلئے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ بھارتی فوج کی طرف سے مکتی باھنی کی آڑ میں مشرقی پاکستان میں اگست ستمبر سے ہی تخریبی کارروائیاں شروع تھیں لیکن اکتوبر کے آخر تک بھارتی افواج نے مشرقی پاکستان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر سرحدی خلاف ورزیاں تیز تر کر دیں۔ بھارتی افواج اب پوری تیاری کے ساتھ حملے کیلئے مناسب موقع کے اِنتظار میں تھیں۔ چنانچہ نومبر کے پہلے ہفتے میں بغیر کسی رسمی اعلان جنگ کے بھارتی فوجیں مختلف سمتوں سے مشرقی پاکستان میں داخل ہو گئیں۔ بھارتی حملہ کوئی ناگہانی نہ تھا۔ اگست ۱۹۷۱ء کے وسط میں مانک شا کی طرف سے جو آپریشنل ہدایات بھارتی فوج کو جاری کی گئی تھیں اُن کی ایک کاپی آئی ایس آئی ڈائریکٹریٹ نے ۶ ستمبر ۱۹۷۱ء ہی کو صدر پاکستان، مسلح افواج کے تینوں سربراہوں اور سیکریٹری دفاع کو مہیا کر دی تھی۔ ۲۱ اور ۲۲ نومبر کی درمیانی شب کو بھارت کی طرف سے ہونے والے ایک بھرپور حملے کی اطلاع بھی اسی ادارے نے حملہ سے ایک ماہ قبل دے دی تھی لیکن پاکستان کا ردِعمل سست گامی اور بے عملی کا شکار رہا۔ البتہ اتنا ضرور کیا گیا کہ فوجی جنتا نے اقتدار کیلئے بے چین بھٹو کو مطمئن کرنے اور اُس کے ذریعہ ہندوستانی حملہ کی صورت میں چین کی حمایت کی یقین دہانی کے حصول کیلئے ایک دفعہ پھر اُسے عقبی دروازے سے اِقتدار میں شامل کر لیا۔ چنانچہ ۵ نومبر ۱۹۷۱ء کو اُن کی قیادت میں ایک

اعلیٰ سطح کا فوجی وفد ترتیب دے کر چینی وزیر اعظم سے بات چیت اور امداد کیلئے چین روانہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں سردار شوکت حیات کا تبصرہ ملاحظہ ہو:

''میڈیا کی پبلسٹی کی چمک دمک میں بھٹو چین روانہ ہو گیا۔ ..... واپسی پر اُس نے اپنی ڈپلومیسی کی نمایاں کارکردگی کو بڑے زور شور سے پیش کیا۔ حالانکہ افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ چین والوں نے بھٹو کے وفد کی سربراہی کو ٹیڑھی نظر سے دیکھا ہے۔ اُنہیں شک تھا کہ اس کا جھکاؤ امریکہ کی طرف ہے۔ ایک طرف بھٹو ہیرو بن کر پاکستان میں ڈھنڈورا پیٹ رہا تھا کہ اُس نے چین کو اپنا ہم نوا بنا لیا ہے۔ دوسری طرف یحییٰ بغیر کسی فکر کے اپنی رنگین محفلوں میں غرق تھا۔'' (۱۰۶)

بھٹو کے دورۂ چین کے بارے میں اُس وقت کے سیکریٹری اطلاعات کا بیان ہے:

''یہ بات بھی پھیلائی گئی کہ چین اپنے قومی مفاد کی خاطر ہندوستان کو یہ اجازت نہیں دے گا کہ ہندوستان مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے مشرقی پاکستان پر غلبہ پا لے۔ وزارتِ اطلاعات اِس قسم کی بے سروپا باتیں عوام کا حوصلہ بلند کرنے کیلئے پھیلاتی رہی حالانکہ چینیوں نے اِس قسم کا کوئی تاثر نہیں دیا تھا بلکہ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ چینیوں نے ہمارے ایک وفد کو جس کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کر رہے تھے، سمجھایا تھا کہ ہم مشرقی پاکستانیوں سے اپنے اختلافات سیاسی طریقے سے سلجھالیں۔'' (۱۰۷)

بھارت نے اگرچہ اکتوبر کے آخر تک اپنی دس ڈویژن کے قریب تازہ دم فوج سے مشرقی پاکستان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر اِشتعال انگیز سرحدی خلاف ورزیاں شروع کر رکھی تھیں لیکن اُس نے اپنی پوری فوجی طاقت سے اُس وقت حملہ کیا جب ۲۱ نومبر ۱۹۷۱ء کو ساری پاکستانی قوم رمضان المبارک کے بعد روایتی طور پر عیدالفطر کی خوشیاں منانے میں مصروف تھی۔ ۲۱ اور ۲۲ نومبر کی رات بھارتی فوج نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مشرقی پاکستان کی مغربی سرحد پر بوہرہ اور غریب پور پر، شمال مغرب میں پٹ گرام، ہلی، برنگا ماڑی پر اور مشرق میں اکھوڑہ پر بیک وقت ہلہ بول دیا۔ پاکستانی فوج اگرچہ تعداد میں ہندوستانی فوج سے بہت کم تھی لیکن اُس نے دشمن کا ہر جگہ پر اِس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ بھارت کا یہ منصوبہ کہ چوبیس گھنٹوں میں مشرقی پاکستان پر قبضہ کر کے بنگلہ دیش بنا دیا جائے گا دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اُدھر پاکستانی فوج اپنی کم مائیگی کے باوجود دادِ شجاعت دے رہی تھی اِدھر مغربی پاکستان میں اربابِ اقتدار ابھی تک عدم توجہ اور بے حسی کا شکار تھے۔ اُن کے خیال میں مشرقی پاکستان پر حملہ ہندوستان کی متحدہ پاکستان کے خلاف جارحیت کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ بہت سے دوست ممالک کے مشورے کے باوجود پاکستانی وزارت خارجہ نے اِس

معاملے کو اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں لے جانے سے روکے رکھا۔ اگرچہ ۲۳ نومبر کو مغربی پاکستان میں بھی ایمرجینسی نافذ کردی گئی لیکن محاذ پر فوجوں کی موجودگی کے باوجود اس طرف سے ہندوستان کے خلاف کسی قسم کی جوابی کارروائی نہ کی گئی۔ البتہ ہندوستان کے اس حملے کے نتیجے میں ہماری پلٹن کی مشرقی پاکستان کیلئے روانگی منسوخ ہوگئی۔ اور ہمیں دوبارہ سیالکوٹ ظفروال روڈ کے ساتھ ساتھ عمومی علاقہ معراجکے میں ہندوستان کے جموں کی طرف سے ممکنہ حملہ کے خلاف دفاعی پوزیشن اختیار کرنے کے احکام مل گئے۔ مشرقی پاکستان کیلئے روانگی کی منسوخی ہمارے لئے زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری تھی لیکن ہمیں اپنے اُن ساتھیوں کی جدائی کا بے حد صدمہ تھا جنہیں ابھی چند ہی دن قبل ہم نے مشرقی پاکستان کیلئے الوداع کیا تھا۔ ہم ابھی بارڈر پر جانے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ ایک دن اچانک کرنل نسیم اپنی ساری کی ساری اڈوانس پارٹی کے ساتھ واپس پلٹن میں آ دھمکے۔ اُن کی واپسی سے ساری پلٹن میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب ہمارے حوصلے بلند تھے اور ہم دشمن کے خلاف دادِ شجاعت دینے کیلئے ایک نئے ولولے کے ساتھ تیار تھے۔

ہماری پچاس آدمیوں پر مشتمل اڈوانس پارٹی کی چٹاگانگ پہنچ کر اگلے دن ہی واپسی ایک معجزہ تھی۔ کرنل نسیم نے چٹاگانگ پہنچ کر ٹرانزٹ کیمپ میں رپورٹ کی تو ہندوستان کے مشرقی پاکستان پر حملے کی وجہ سے ہر طرف افراتفری کا سماں تھا۔ کسی کو نہ پتہ تھا کہ کون سی یونٹ کہاں ہے اور کس نے کہاں جانا ہے۔ جس کے ہتھے جو آدمی چڑھتا وہ اُسے پکڑ کر اپنے ساتھ بارڈر پر لے جاتا۔ کسی پلٹن کی ایک کمپنی کہیں تھی اور دوسری کہیں۔ ایسے میں کرنل نسیم کو اُن کا ایک دوست مل گیا جو ٹرانزٹ کیمپ میں مغربی پاکستان کے درمیان فوجیوں کی آمدورفت کے سیل میں کام کرتا تھا۔ اُس نے کرنل نسیم کو بتایا کہ باوثوق ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ ہندوستان کی متوقع مداخلت کے خطرے کے پیشِ نظر مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان مزید فوجی یونٹوں کی نقل و حمل ممکن نہ ہے جس کی وجہ سے ۲۹ پنجاب کی مشرقی پاکستان کیلئے روانگی بھی رُک گئی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اگلے دن سے ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان فضائی رابطہ بھی کٹ جائے۔ اُس نے کرنل نسیم کو مشورہ دیا کہ قبل ازیں کہ ہیڈ کوارٹر ایسٹرن کمان کو اُن کی آمد کی اطلاع ہو وہ خاموشی سے اُسی دن واپسی فلائٹ سے مغربی پاکستان چلے جائیں ورنہ دیگر انفرادی طور تبدیل ہو کر آنے والے فوجیوں کی طرح اُن لوگوں کو بھی الگ

الگ یونٹوں میں مختلف محاذوں پر بکھیر دیا جائے گا۔ چنانچہ اُسی کی مدد سے وہ اپنی پارٹی کے ساتھ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہر قسم کی نقل وحمل کا رابطہ منقطع ہونے سے ایک دن قبل دوبارہ سیالکوٹ اپنی پلٹن میں پہنچ گئے۔ اُن کے آنے کے ایک دو دن بعد ہم بھی ظفروال سیکٹر میں اپنے آپریشنل ایریا میں پہنچ گئے۔

سرحدی علاقوں سے شہریوں کا اِنخلاٗ

۱۹۶۵ء کی ہندوپاک جنگ کے دوران سرحدی آبادی کو خاصا جانی اور مالی نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ اِس لئے اس دفعہ حکومت نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے سول انتظامیہ کو حکم دیا کہ سرحدی علاقے کے شہریوں کو بروقت مطلع کر دیا جائے کہ ہندوستان سے متوقع جنگ کے خطرے کی بنا پر اپنے گھروں کو خالی کر کے محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں۔ چنانچہ جب ہم دوبارہ اپنی دفاعی پوزیشن میں پہنچے تو لوگ اپنے مال اسباب اور ڈھور ڈنگر کے ساتھ اندرون ملک کی طرف رواں دواں تھے۔ جس کو جو میسر تھا اُس پر اُس نے اپنا سرمایہ حیات لاد رکھا تھا۔ تانگوں، ریڑھوں، بیل گاڑیوں کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار نے سڑک پر ٹریفک کی صورت کو بے حد مشکل بنا رکھا تھا۔ ہر طرف افراتفری کا سماں تھا۔ بسوں کے انتظار میں لوگوں کے غول کے غول سڑک کے کنارے جمع تھے۔ بوڑھے بچے عورتیں مرد اپنی گٹھڑیاں سنبھالے بیٹھے تھے۔ جونہی کوئی بس آتی سب کے سب ایک دم اُس پر ہلہ بول دیتے۔ جو طاقتور ہوتا، وہ بچوں کی چیخ وپکار، جوان عورتوں کی ''وے بھائی شرم کر، حیا کر''، بوڑھی مائیوں کی بددعاؤں اور بوڑھے بابوں کے بامعنی گالی گلوچ سے بے نیاز سب کو اُلٹتا پلٹتا اپنا سامان بس کی کھڑکیوں میں سے دھکیل کر سیٹوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ آناً فاناً چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی پھٹیچر بس مسافروں سے یوں بھر جاتی جیسے روئی کا بورا۔ بس کے اندر اور چھت پر جگہ نہ پا کر لوگ اسے چاروں طرف سے یوں چمٹ جاتے جیسے چھتے سے شہد کی مکھیاں۔ کچھ دیر ہنگامہ برپا کر کے بس سڑک پر رینگنے لگتی اور جب تک لوگوں کی نظر سے اوجھل نہ ہو جاتی پیچھے رہ جانے والے اُس کے ڈرائیور کو صلاواتیں سناتے رہتے۔

یہ سب پرائیویٹ ٹوٹی پھوٹی لوکل بسیں ہی تھیں جو لوگوں کی خدمت کر رہی تھیں ورنہ حکومت کی طرف سے اِن بے چارے سرحدی باشندوں کے اِنخلاٗ کے واسطے کوئی باقاعدہ

بندوبست نہ تھا۔ نہ ٹرانسپورٹ کا انتظام، نہ کوئی کیمپ، نہ خیمہ، نہ روٹی نہ پانی!! جن غاصب شرابیوں اور زنا کاروں نے اپنے اقتدار کی خاطر سات کروڑ مشرقی پاکستانی بھائیوں کو پورے ایک سال سے ہاوِیہ میں جھونک رکھا تھا اُن کے پاس چند لاکھ سرحدی پنجابیوں کے مصائب کے بارے میں سوچنے کا وقت کہاں تھا۔ بہر حال چند ہی دِنوں کے اندر اندر ہمارے دفاعی علاقے سے تو لوگ اپنے گھروں سے یوں بھاگے کہ گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ اکثر نے تو بھاگتے وقت اپنے گھروں کو تالے بھی نہ لگائے۔ اگرچہ فوجیوں کیلئے کسی بھی گاؤں میں بلا عذر جانے کی ہر قسم کی ممانعت تھی لیکن کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے ایک آدھ دفعہ مجھے اِن اُجڑے ہوئے دیہات کی گلیوں میں سے گزرنے کا اِتفاق ہؤا۔ ہنستے بستے گھروں پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے صدیوں سے یہاں کوئی رہتا ہی نہ تھا۔ اکثر گھروں کے دروازے چوپٹ کھلے تھے مگر گھروں کے باسی غائب تھے۔ وقفے وقفے کے بعد اِدھر اُدھر سے کُتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی تھیں جو اپنے وطن سے وفاداری کا حق نبھا رہے تھے۔

معراجکے گاؤں سے باہر شمال میں ایک بڑے درخت پر میری کمپنی کی آبزرویشن پوسٹ تھی۔ ایک دن میں اُس پوسٹ کے معائنہ کے بعد واپس جا رہا تھا۔ اچانک خیال آیا کہ آج اِس گاؤں کا معائنہ کرتے ہیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سارے گاؤں پر ایک ہُو کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس سنسنی خیز ماحول میں ڈرتے ڈرتے ایک گھر میں داخل ہؤا۔ پنجاب کی نوآبادیات مثلاً فیصل آباد، جھنگ، ساہیوال اور سرگودھا وغیرہ کے چکوک منصوبہ بندی کیساتھ ایک خاص ترتیب سے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں ہر چک ایک مربع شکل کا تھا۔ شمالاً جنوباً اور شرقاً غرباً دو کشادہ مین بازار ہر چک کے عین وسط میں ایک دوسرے کو عموداً کاٹتے ہوئے ایسے گزرتے ہیں کہ وہاں پر ایک بہت بڑا چوک بن جاتا ہے۔ اس چوک میں شروع شروع میں ایک کنواں ہؤا کرتا تھا جہاں سے سارے گاؤں کیلئے پانی مہیا ہوتا تھا۔ اکثر چکوک میں یہ کنواں اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ چوک میں چند ایک دوکانیں ہوتی ہیں جن میں دیہاتیوں کی ضروریاتِ زندگی کی تقریباً ہر شے مل جاتی ہے۔

سیالکوٹ کی تہذیب چونکہ خاصی پرانی ہے اِس لئے گاؤں بھی پرانی طرز کے بے ترتیب ہیں۔ گاؤں کے کھاتے پیتے گھرانوں کے مکان عموماً پکے اور کشادہ۔ اُن کی گلیاں بھی پکی اینٹوں سے فرش شدہ۔ لیکن سرحدی دیہات میں اکثر غریب طبقہ بستا تھا جن کے گھر بھی اکثر و

بیشتر گارے مٹی کی دیواروں اور سرکنڈے لکڑی کی چھت والے تھے۔ گلیاں بھی ٹیڑھی میڑھی جن کی بھول بھلیوں میں ایک دفعہ اگر کوئی انجان گھس جائے تو باہر نکلنے کا راستہ ندارد۔ یہ مکان بھی اسی قسم کی ایک تنگ سی منحنی قسم کی گلی میں واقع تھا۔ کچا مگر صاف ستھرا۔ سیالکوٹ کی باسلیقہ دیہاتی تہذیب کا مظہر۔ ضرورت کے مطابق مناسب صحن۔ سامنے ڈیوڑھی نما برآمدہ جس سے آگے ایک بڑا دالان۔ دالان کے پیچھے دو چھوٹے چھوٹے کوٹھڑی نما کمرے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس گھر کی رہنے والی خواتین نہایت باسلیقہ اور سگھڑ تھیں۔ کچا گھر ہونے کے باوجود بے حد صاف ستھرا۔ صحن میں ایک طرف پانی کے دو گھڑے لکڑی کی گھڑونجی پر ننگے مُنہ سر جھکائے اُداس بیٹھے تھے۔ ایک طرف کونے میں فرش سے کوئی فٹ بھر اونچے تھڑے پر کھانا پکانے کیلئے بڑے سلیقے سے مٹی اور گارے کے دو جڑواں چولہوں میں راکھ اور ان جلی لکڑیاں پڑی تھیں۔ گھر کا فرش کچا مگر بڑی صفائی سے گارے اور گوبر سے لیپا ہوًا۔ لیکن اب کہیں کہیں سے افراتفری میں سامان کی کھینچا تانی کے باعث اکھڑا ہوًا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیواروں پر بالکل تازہ تازہ پوچا کیا گیا ہو۔ پوچا بھی ایسا جس کے آگے موجودہ دور کی پلستر شدہ دیواروں پر گاریگروں کا اپنے ماڈرن اوزاروں سے کیا ہوًا ڈِس ٹیمپر (distemper) بھی شرمائے۔ برآمدے میں چھت کے ساتھ سرکنڈے کا بنا ہوًا خوبصورت رنگین ڈوریوں والا چھینکا لٹک رہا تھا جس پر پتہ نہیں گھر والوں کی غیر موجودگی میں کیسے ایک بلی چڑھ کر آرام سے سو رہی تھی۔ میرے پاؤں کی آہٹ سے وہ وہاں سے چھلانگ لگا کر میاؤں کرتی ہوئی میرے پاس سے یوں اچانک گزری کہ میں یکدم ہڑ بڑا سا گیا۔ پیچھے والے دونوں کمروں میں نہایت مہارت سے انگیٹھیاں بنائی گئی تھیں۔ ایک کا خاک آلود انگیٹھی پوش زمین پر پڑا تھا اور دوسری کا آدھا اوپر تھا اور آدھا نیچے لٹک رہا تھا۔ میں اِس گھر کے مکینوں کو اپنے تصور ہی تصور میں اُن کے کسی رشتہ دار کے ہاں بن بلائے مہمانوں میں یا پھر ڈسکہ اور اگوکی کے کسی پرائمری سکول میں ڈھونڈ رہا تھا۔ انہیں خیالوں میں ڈوبا پتہ نہیں میں کب اور کیسے اِس گاؤں کی بھول بھلیوں سے گزرتا باہر آیا اور پھر اپنی منزل کی طرف چل دیا۔

مشرقی پاکستان میں ہندوستان کی جارحیت پر دس دن گزر گئے۔ وہاں پر جنگ پوری شدت سے جاری تھی۔ لیکن حکومتی جنتا جس میں ۹ نومبر سے عملی طور پر بھٹو صاحب بھی شامل تھے کے کان پر ابھی تک جوں تک نہ رینگی تھی۔ مغربی پاکستان میں ہم اپنی جنگی پوزیشنوں میں

ہونے کے باوجود ابھی تک اِس انتظار میں تھے کہ کب ہمیں حکم ملے اور کب ہم اپنے مشرقی پاکستان میں لڑنے والے بھائیوں پر بھارتی فوج کے دباؤ کو کم کرنے کیلئے اُسے مغربی پاکستان میں اُلجھائیں۔ ہمیں تو آج تک یہی پڑھایا اور سکھایا جاتا تھا کہ ہندوستان کو ہم نے اپنے ملک کے دونوں بازوؤں سے ایک طرح سے سینڈوچ کر رکھا ہے۔ اور یہ کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان میں ہے۔ لیکن مشرقی پاکستان تو پچھلے ایک ماہ سے ہندوستانی فوج کی زبردست جارحیت کا شکار تھا۔ اور چند خودغرض سیاستدانوں کی ہوس اقتدار کی خاطر فوجی جنتا نے اپنے سپاہیوں کو اُن کے خون کی پیاسی بنگالی قوم کی تحریک آزادی کو دبانے کی خاطر، اُنہیں بیک وقت بنگالی عوام، مکتی باہنی، بھارتی اور روسی فوج کے خلاف جنگ میں جھونک کر خود ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ جدید سامان حرب سے لیس ہندوستان کی بری، بحری اور ہوائی افواج کی تہہ در تہہ لہروں نے روسی مشیروں کے سائے میں ہمارے اِن بے سروسامان فوجیوں کو چاروں طرف سے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ اِن بے چاروں کے پاس نہ تو ڈھب کے ٹینک تھے، نہ ہوائی فوج تھی اور نہ ہی بحری۔ مگر اِس لنگڑی لولی فوج کے کماندار کو حکم یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی سرزمین کا ایک اِنچ بھی دشمن کے قبضے میں جانے نہ پائے اور وہ بھی صدیق سالک کے مطابق روسٹ چکن ڈکار کر اپنی اوقات سے بڑھ کر بڑھکیں مارنی شروع کر دیتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنرل نیازی کے پاس وہ کونسی جادو کی چھڑی تھی جس کے ذریعے وہ اپنے سے دس گنا کیل کانٹے سے لیس بھارتی فوج کو قریب تین ہزار کلومیٹر پر پھیلی ہوئی سرحد کے پار ہی روکے رکھتا؟؟؟

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کیا اقبال نے ایسے موقعوں کیلئے کہا تھا؟ ہرگز نہیں!! یہ تو اُس صورت میں ہے جب سپاہی مومن ہو اور حق پر ہو۔ شجاعت کے پیکر، ہادیٔ برحق، ہمارے پیارے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں:

"اے نبی! تو مومنوں کو (کافروں کے خلاف) لڑنے کی ترغیب دلاتا رہ۔ اگر تم میں سے بیس ثابت قدم رہنے والے مومن ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے۔ اور اگر سو ہوں گے تو وہ ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے۔ اِسلئے کہ وہ ایک ایسی قوم ہے (کافروں کی) جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتی۔ لیکن فی الحال اللہ تعالیٰ نے یہ جان کر کہ تم میں ابھی کمزوری پائی جاتی ہے تمہارے لئے آسانی پیدا

کردی ہے۔اس لئے فی الحال اگر تم میں سو صبر شکر کرنے والے مومن ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں ایک ہزار مومن ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار کافروں پر غلبہ پائیں گے۔'' (سورۃ الانفال آیت ٦٦۔٦٧)

چنانچہ جنگ بدر میں ایک ہزار مسلح کفار کے مقابلے میں تین سو تیرہ اوّلین صحابہ میں سے تھے، جنگ اُحد میں تین ہزار کے مقابلے میں سات سو اور جنگِ احزاب میں انداز اُ بارہ سے پندرہ ہزار کفار کے مقابلے میں تین ہزار جانثار عشاقانِ رسول شامل تھے۔اور فتح مکہ کے وقت بھی دس ہزار قدوسی آپؐ کے ہم رکاب تھے۔ یہاں پر تو معاملہ ہی اُلٹ تھا۔ نہ تو سپاہی مومن تھا اور نہ ہی حق پر۔اور مقابلہ اگرچہ کافر سے تھا لیکن یہ کافر سوج بوجھ بھی رکھتا تھا اور لڑائی بھی اُس مسلمان کی لڑ رہا تھا جو اپنے بھائی سے اپنا حق مانگ رہا تھا جو اُس کا حق بزور بازو دبائے بیٹھا تھا۔حق دبانے والے بھائی کے ایمان کی حالت یہ کہ نہ مومن اور نہ ہی حق پر بلکہ فاسق اور فاجر۔اور مقابلہ؟؟ مقابلے پر اپنے سے دس گنا دشمن!! دشمن کی یہ وہ تعداد تھی جسے زیر کرنے کیلئے نبیؐ پاکؐ کے اُن صحابہ کے ایمان کی ضرورت تھی جو ایمان کی اعلیٰ ترین معراج پر فائز ہوں اور اُن میں کوئی اِخلاقی کمزوری نہ پائی جاتی ہو۔ یہاں پر تو یہ حال تھا کہ خدا کے فرشتے پکار پکار کر کہہ رہے تھے: ''یاایھا لکفارُ قتلِ الفُجار یعنی ایک کافر وان فاسقوں فاجروں کو مارو!''

مغربی پاکستان میں جنگ

آخرِ جب مشرقی پاکستان میں ہندوستانی فوج نے ملک کا آدھے سے بھی زیادہ علاقہ اپنے قبضہ میں لے کر بنگلہ دیش کی حکومت قائم کردی اور بتدریج تمام بڑے بڑے شہروں کے گرد دائرہ تنگ کرنا شروع کر دیا اور مشرقی کمان کے سپہ سالار نے واویلا مچانا شروع کردیا۔ اور اِدھر مغربی پاکستان میں بھی وہاں پر پھنسے ہوئے سول اور فوجی ملازمین کی ماؤں، بہنوں اور بیویوں نے نہ صرف احتجاجی جلوس نکالے بلکہ ملتان چھاؤنی سے تو فوجیوں کی بیگمات نے صدر یحیٰی خان اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل حمید کو چوڑیاں اور حنا بھیجنے کی دھمکیاں دیں۔اور ایک کور کمانڈر نے چیف آف آرمی سٹاف کے دفتر میں داخل ہو کر اُسے اِس بات سے خبردار کیا کہ جونیئر آفیسر اور جوان اُنہیں ڈرپوک اور بزدل کے نام سے یاد کرتے ہیں۔(١٠٨)

جنرل گل حسن نے بھی اُس وقت کے سیکریٹری اطلاعات مسٹر روئیداد خان کے روبرو

اس بات کا اعتراف کیا کہ حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ ان کیلئے مشرقی پاکستان کا دفاع مشکل ہو چکا تھا۔ ان کے خیال میں اس سے اعلیٰ چارہ نہ تھا کہ مغربی پاکستان کی طرف سے ... دیا جائے۔ فوجی جنتا کی مشرقی پاکستان کے بارے میں عدم دلچسپی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں

"مشرقی پاکستان نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ مغربی پاکستان میں کاروبارِ حیات اپنے معمول کی ڈگر پر چل رہا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں دل میں ایک بے چینی سی رہتی تھی۔ مجھے پتہ تھا حالات دگرگوں ہیں اور مستقبل غیر یقینی ہے۔ جب مغربی پاکستان میں یہ بے چینی یہ گھٹن زیادہ ہو جاتی تو میں ہر مہینے دو کم ایک مرتبہ مشرقی پاکستان کا دورہ ضرور کرتا۔ مشرقی پاکستان میں بھی صرف ڈھاکہ میں رہنے کی بجائے وہاں سے باہر نکل جاتا۔ میں اِن دوروں سے حد درجہ افسردہ اور پژمردہ لوٹتا۔ حالات جو رُخ اختیار کر رہے تھے وہ اطمینان بخش نہیں تھے۔ ان دوروں سے واپس آ کر میں جی ایچ کیو کی میٹنگوں میں صدر کو اپنی رپورٹیں پیش کیا کرتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک تو جی ایچ کیو کی میٹنگیں کم ہوتی جا رہی ہیں اور دوسرے اِن میٹنگوں میں صدر مملکت جنرل یحییٰ خان کی دلچسپی بھی کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے دیکھا کہ ان کے گرد فوجی افسروں کا جو حلقہ تھا اس میں بھی کشیدگی تھی۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل حمید اور صدر کے پرنسپل سٹاف افسر (جنرل ایس جی ایم پیرزادہ) کے درمیان تعلقات ٹھیک نہ تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل حمید اور چیف آف جنرل سٹاف (جنرل گل حسن) کے درمیان کشیدگی تھی۔ اسکے ساتھ ساتھ جنرل گل حسن اور جنرل پیرزادہ کے مابین بھی شکررنجی تھی۔ غرض کہ سب کے سب ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔" (۱۰۹)

ان جرنیلوں کی تن آسانی اور اُن کے درمیان اِقتدار کی کھینچا تانی کی بنا پر باہمی چپقلش اور شکررنجی سے نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ دشمن ہمارے وطن کے مشرقی حصے کو اپنے پاؤں تلے روندتا چلا جا رہا تھا لیکن یہ ابھی تک دنیا و مافیہا سے بے نیاز خوابِ خرگوش میں محو تھے۔ نہ تو یہ مشرقی پاکستان کی عوام کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے کسی سیاسی حل پر رضامند ہوئے اور نہ ہی اب یہ اُن کا دفاع کرنے میں سنجیدہ تھے۔ اور ابھی تک یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ امریکہ اور چین آ کر ہندوستان کو مشرقی پاکستان پر قبضہ کرنے سے روکیں گے۔ جب عوام کی طرف سے دباؤ نے شدت اِختیار کی تو ۲۸ نومبر کو صدر نے اپنے سیاسی گرو ذوالفقار علی بھٹو کو یاد فرمایا جس کے مشورہ پر مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کیلئے ہر قسم کی کمک روک دی گئی تاکہ مغربی پاکستان کا دفاع کیا جا سکے۔ اس فیصلے سے یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ حکومتی جنتا مشرقی پاکستان کے دفاع کے بارے میں مایوس ہو چکی تھی۔ (۱۱۰)

۳ دسمبر کی شب سے فوجی جنتا نے نائب صدر نورالامین کے اِصرار پر بادلِ نخواستہ ہندوستان کے بڑے بڑے ہوائی اڈوں پر فضائی حملوں کا آغاز کر دیا تھا۔ اِس طرح مغربی پاکستان میں بھی لڑائی شروع ہوئی۔ حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھٹو نے ایک دفعہ پھر اقتدار کے انتقال کیلئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ یحییٰ خان نے بھٹو کو اس شرط پر اقتدار میں شامل کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ نورالامین کو کٹھ پتلی وزیرِاعظم کے طور پر قبول کریں۔ آخر کار بھٹو صاحب کی مراد پوری ہوئی اور ۷ دسمبر سے انہوں نے وزیرِاعظم نورالامین کے ماتحت نائب وزیرِاعظم اور وزیرِ خارجہ کا عہدہ سنبھال لیا۔

ہمارے ہوائی حملوں کے جواب میں ہندوستانی فضائیہ نے اسی رات جوابی کارروائی کرتے ہوئے ہمارے سرگودھا، میانوالی، رفیقی (شورکوٹ)، رسالیوالہ اور دیگر ہوائی اڈوں پر زبردست حملے کئے لیکن ہمارے اڈوں کو خاطر خواہ نقصان نہ پہنچا سکے۔ ہمارے جانبازوں نے دشمن کے بارہ میں سے تین کینبرہ طیارے مار گرائے۔ اگلے دن پاکستان اور انڈین ائرفورس کے درمیان پاکستانی ہوائی اڈوں کی فضا میں گھسان کی جنگ ہوئی۔ اُس دن ہندوستان کے دس ایس یو۔ ۷ فائیٹر طیارے کام آئے۔ اِن میں سے سات ہماری طیارہ شکن توپوں کے جانبازوں کا نشانہ بنے اِسی شام ۸ویں ڈویژن نے نارووال ایریا میں دھرم پر اچانک حملہ کر کے جسڑ کے پُل تک کے ہندوستانی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں سے میں نے ۳ پنجاب کے ساتھ ۱۹۶۵ کی جنگ لڑی تھی۔ اِسلئے میں آج بھی مغربی پاکستان کی جنگ کا مختصر سا حال اُسی ۳ پنجاب کے جنگی کارناموں سے شروع کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جس میں میرے فوجی کیریئر کا آغاز ہوا۔ اور جس کے ساتھ کچھ یادیں بھی وابستہ ہیں۔

۴ دسمبر کی شام کو ۱۱ویں ڈویژن کی ۱۰۶ بریگیڈ کے ماتحت ۳ پنجاب کو قصور کے جنوب میں دریائے ستلج پر واقع حسینی والہ ھیڈ ورکس کے پُل پر قبضہ کرنے کا حکم ملا۔ اِس اہم ہندوستانی نہری سلسلے کے دفاع کیلئے دشمن نے کنکریٹ کے مضبوط مورچوں کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے بندوں کا تہہ در تہہ سلسلہ تعمیر کر رکھا ہے جس کا ہندوستان کی طرف کا حصہ فخرِ ھند اور پاکستان کی طرف کا قیصرِ ھند کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندوستان کی دو پلٹنیں ۱۵ پنجاب اور ۲۵ بی ایس ایف اِن مضبوط قلعوں میں مورچہ زن تھیں۔ ۳ پنجاب کا مقصود جنوب کی طرف سے حملہ کر کے مین برج پر قبضہ اور پھر فخرِ ہند کی طرف سے دشمن کی کمک کو روکنا تھا تاکہ دوسری

دو پلٹنوں کو قیصر ہند پر قبضہ کرنے میں سہولت ہو۔ پنجاب کے دل '' ا ہوز'' کے دو سپوتوں کیپٹن عارف سعید اور کیپٹن آفتاب عزیز نے کرنل غلام حسین چوہدری کی ولولہ انگیز قیادت میں دشمن کے محفوظ قلعوں سے برستی ہوئی آگ اور اُس کی دفاعی سرنگوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بیک وقت اپنے اپنے مقصود کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ہمارے شیروں کی یلغار کے شروع ہوتے ہی قلعہ بند دشمن نے چاروں طرف سے مشین گنوں، مارٹروں، ٹینکوں اور آرٹلری کی توپوں کے دہانے کھول دئے۔ لیکن ہمارے جیالے جانیں ہتھیلی پر رکھے دشمن کی طرف بڑھتے رہے۔ نوجوان عارف جسے ہم سب پیار سے 'گھوڑا' کہا کرتے تھے دُڑکی لگاتا دشمن کے مورچوں میں جا گھسا لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے اُس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ جب وہ ڈھیر ہوا تو کرنل چوہدری نے موقع پر پہنچ کر خود کمپنی کی کمان سنبھال لی۔ اُنہوں نے بہادری کی اعلیٰ ترین مثال پیش کرتے ہوئے خود دشمن کے بنکروں کو صاف کرنا شروع کر دیا۔ دو بنکروں کو تباہ کر کے وہ تیسرے پر چڑھائی کر رہے تھے کہ خود بھی شہید ہو گئے لیکن اُس وقت تک وہ اپنے مقصود پر پہنچ چکے تھے۔ اِسی اثنا میں کیپٹن آفتاب عزیز بھی مین برج کے دہانے پر پہنچ کر قبضہ کر چکے تھے۔ بہادری کی اعلیٰ ترین مثال پیش کرنے کی بنا پر کرنل چوہدری کو ہلال جرأت اور کپٹین عارف اور کپٹین آفتاب کو ستارۂ جرأت کا مستحق قرار دیا گیا۔

اُسی شام ۶ ایف ایف نے نیچے سلیمانکی پر قبضہ کر لیا تھا۔ دشمن کے لئے یہ علاقہ بے حد اہمیت کا حامل تھا۔ اِسلئے وہ اِس علاقے کو ہر صورت میں دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دشمن کے حملوں کا زیادہ تر رخ میجر شبیر شریف کی کمپنی کی طرف تھا۔ دشمن نے میجر شبیر شریف کی شہرت کے پیشِ نظر اپنی پیادہ فوج کی شہرت یافتہ پلٹنوں کو یکے بعد دیگرے آزمایا۔ اِن میں سب سے ثابت قدم حملہ ہندوستان کی ۴ جاٹ بٹالین کا تھا جس میں اُس کا ایک جیدار آفیسر میجر نارائین سنگھ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شبیر شریف کی کمپنی میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا لیکن آگے اُس کا شبیر شریف سے ٹاکرہ ہو گیا۔ آخر دست بدست جنگ میں شبیر شریف کے ہاتھوں مارا گیا۔ اگلی رات دشمن نے پھر ٹینکوں کے ساتھ زبردست حملہ کیا لیکن ۶ ایف ایف کے شیر دل جوانوں نے دشمن کے دانت کھٹے کر دئے۔ اِس رات شبیر شریف کی پوسٹ کو ٹینک کا ایک براہ راست گولا لگا جس سے وہ بھی شہید ہو گئے۔ اِس طرح اُس نے بھی عزیز بھٹی شہید کی یاد تازہ کر دی۔ شہادت کے بعد بجا طور پر اُسے نشان حیدر کا حقدار قرار دیا گیا۔ (۱۱۱)

ہماری جنگ

۴ دسمبر کو ۱۲ بجے کے قریب ہمارے سامنے والی ہندوستان کی دیوی گڑھ پوسٹ کے علاقے سے اُن کی توپوں نے ہماری دفاعی پوزیشنوں پر زبردست گولہ باری شروع کردی۔ ہندوستان کی یہ پوسٹ جنگ بندی لائن سے کوئی ۲۵۰۰ میٹر کے فاصلے پر ایک اونچی ٹیکری پر واقع ہے۔ ہندوستانی متبوضہ علاقے میں دیوی گڑھ سے آگے اُن کی جبووال بارڈر پوسٹ کے علاوہ کوئی آبادی نہ تھی۔ البتہ موسمی گنے اور مکئی کی فصلیں سارے علاقے میں اپنے جوبن پر تھیں۔ اِن فصلوں کی آڑ میں چھوٹی موٹی فوجی ٹولیاں دن کے وقت بھی بارڈر کی طرف بڑھ سکتی تھیں۔ فصلیں تو ہماری طرف بھی تھیں لیکن دیوی گڑھ کی ٹیکری سے دن کے وقت دشمن ہماری ہر حرکت کو نظر میں رکھ سکتا تھا۔ میری کمپنی کی ذمہ داری کے علاقے میں دو چھوٹی چھوٹی آبادیاں تھیں جو اب خالی پڑی تھیں۔ بائیں طرف والی آبادی نسبتاً چھوٹی اور لائن آف کنٹرول سے صرف تین سو میٹر کے فاصلے پر دیوی گڑھ کے بالکل سامنے واقع تھی۔ پکی سڑک سے یہاں تک بیل گاڑیوں کا راستہ موجود تھا۔ اگر بارش وغیرہ نہ ہو تو اِس آبادی تک کار وغیرہ بھی آسانی سے جا سکتی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں پر ۱۴ پیرا بریگیڈ کے بنگالی بریگیڈ میجر منظور احمد نے اتوار کے دن اپنی کار کھڑی کی اور سیر کے بہانے ٹہلتا ٹہلتا اپنی بیگم کو لے کر پوری کور کے دفاعی منصوبہ کے ساتھ بارڈر پار کر گیا۔ میجر منظور نے بنگلہ دیش فوج میں میجر جنرل کے عہدے تک ترقی پائی۔ بعد میں بنگالی فوج کی آپس کی خانہ جنگی میں جنرل اِرشاد کے ہاتھوں قتل ہُوا۔

دوسری آبادی نسبتاً بڑی اور سڑک سے کوئی ۵۰۰ میٹر اور لائن آف کنٹرول سے تقریباً ہزار بارہ سو میٹر کے فاصلے پر واقع تھی۔ ہمارے دفاع کی پہلی لائن کے مورچے لائن آف کنٹرول سے دو ڈھائی سو گز کے فاصلے پر واقع تھے۔ جبکہ دوسری لائن سیالکوٹ۔ظفروال روڈ کے ساتھ ساتھ ایک خودساختہ دفاعی بند پر پکے بنکرز میں تھی۔ ڈویژن کے دفاعی پلان کے مطابق پہلی اور دوسری دفاعی لائن کے درمیان اینٹی ٹینک اور اینٹی پرسنل مائن فیلڈ تھا۔ دونوں دفاعی لائنوں میں رابطے کیلئے ایک راستہ چھوڑا گیا تھا جسے فوجی زبان میں لین کہتے ہیں۔ ہم ابھی تک دوسری دفاعی لائن کے علاقے میں تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۴ دسمبر کو دن کے بارہ بجے کے قریب اچانک دیوی گڑھ ایریا سے ہماری پوزیشنوں پر ہندوستانی توپوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ یہ گولہ باری کسی متوقع حملہ کی پیش خیمہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے ایک بجے دن کے قریب ہمارے کمانڈنگ آفیسر کرنل نسیم کا فیلڈ ٹیلیفون پر آرڈر موصول ہوا کہ میں فوراً اپنی کمپنی کو لے کر اگلی دفاعی پوزیشن میں پہنچ جاؤں۔ میں نے اپنی کمپنی کی دونوں فارورڈ پلاٹونوں کو ساتھ لیا اور اگلی دفاعی پوزیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ دن کے وقت اگر ہم مقررہ راستہ کو اختیار کرتے تو اس سے ایک تو دشمن کو اُس راستے کا پتہ چل جاتا دوسرے وقت بھی زیادہ لگتا اور ہمیں دشمن کے گولوں کی زد میں زیادہ دیر رہنا پڑتا۔ ایک پرانی پگڈنڈی سیدھی ہماری موجودہ پوزیشن کو اگلی دفاعی پوزیشن سے ملاتی تھی۔ یہ راستہ چھوٹا اور دشمن سے قدرے اوٹ میں تھا مگر اب یہ مائن فیلڈ میں آ جانے کی وجہ سے متروک تھا۔ حالات کی نزاکت دیکھ کر میں نے اس راستے کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اپنے پلاٹون کمانڈروں کو اپنے پیچھے پیچھے آنے کا حکم دے کر اُن کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور مائن فیلڈ کے اندر سے گزرتی ہوئی پگڈنڈی پر اگلی دفاعی پوزیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ میرے ماتحت بلاتوقف میرے پیچھے پیچھے بھاگ پڑے۔ ہمارا نعرہ سن کر دشمن سمجھا کہ ہم نے اُن پر حملہ کر دیا ہے۔ اُس نے ہماری دفاعی پوزیشن پر گولہ باری شروع کر دی۔ اوپر سے دشمن کی توپوں کے گولے برس رہے تھے اور نیچے ہماری اپنی لگائی ہوئی مائنز تھیں۔ لیکن خدائے بزرگ و برتر نے میری لاج رکھ لی۔ اور اپنے فرشتوں کی فوج کو ہماری مدد کیلئے اس طرح سے مقرر کیا کہ نہ تو ہم میں سے کسی کا قدم کسی مائن پر پڑا اور نہ ہی ہم دشمن کی گولہ باری کی زد میں آئے۔ سب کے سب گولے ہمارے دائیں بائیں گر کر پھٹ رہے تھے۔ اور ہم بجلی کی سی تیزی سے آناً فاناً اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے نعرے بلند کرتے اپنے اگلے مورچوں میں پہنچ گئے۔ ہماری اس چال کو دشمن نے یہ خیال کیا کہ ہم دیوی گڑھ پر قبضہ کرنے کیلئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ دشمن رات بھر وقفے وقفے کے بعد ہماری طرف سے متوقع حملے کے ڈر سے ہماری پوزیشنوں پر گولہ باری کرتا رہا اور ہم اُس کے ممکنہ حملے کے انتظار میں رات بھر اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے۔

جب ذرا گولہ باری میں کمی آئی تو میں نے فرداً فرداً ہر مورچے کا ملاحظہ کرنا مناسب سمجھا۔ میں نے محسوس کیا کہ سب جوانوں اور کمانڈروں کے حوصلے بلند تھے۔ پلٹن کے ریزر

ایریا سے اگرچہ کھانا تیار ہوکر پیچھے کمپنی میں پہنچ چکا تھا لیکن بمباری کی وجہ سے اگلے مورچوں تک پہنچانا مشکل تھا۔ رات کے دس بجے کے قریب کچھ دیر کیلئے دشمن کی گولہ باری بند ہوئی تو اس وقفے میں اگلے مورچوں میں کھانا پہنچایا گیا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے میجر منظور کے ذریعے دشمن کے پاس ہماری پوری کور کا دفاعی منصوبہ پہنچ چکا تھا۔ اُسے ہمارے اہم ہتھیاروں کی ہر پوزیشن کا علم تھا۔ اگلا سارا دن بھی وقفے وقفے کے بعد ہم پر گولہ باری ہوتی رہی۔ دشمن دراصل ہمیں یہاں (Pin down) کر کے ہیڈ مرالہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کا منصوبہ تھا کہ ہیڈ مرالہ پر قبضہ کر کے سیالکوٹ پر حملہ کرے۔ ہمارے ۱۵ویں ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل عابد علی زاہد نے پھکلیاں کے وسیع علاقے کو صرف رینجرز کے رحم وکرم پر چھوڑ کر اپنی ساری توجہ مرالہ ہیڈ ورکس کے دفاع کی طرف مرکوز کیے رکھی۔ چنانچہ ۵ دسمبر کی رات جب دشمن نے شکر گڑھ اور ہیڈ مرالہ پر بیک وقت حملہ کیا تو ہمارے ہراول دستوں نے شکر گڑھ ایریا میں تو اُس کی پیش قدمی روک دی لیکن پھکلیاں میں رینجرز کی چند ایک چوکیوں کے سوا کوئی فوجی دستہ نہ پا کر دشمن بھی حیران رہ گیا اور اِسے ہماری کوئی فوجی چال سمجھ کر تھوڑی سی پیش قدمی کے بعد محتاط ہوکر خود بخود رُک گیا۔ جنرل عابد اور کور کمانڈر جنرل اِرشاد کا خیال تھا کہ اِس علاقے میں دشمن کے حملے کا کوئی امکان نہیں اِسلئے اسے خالی چھوڑ دیا گیا۔ نتیجۃً دشمن کسی مزاحمت کے بغیر اپنے ٹینکوں سمیت دھیرے دھیرے اِس راستے سے مرالہ ہیڈ ورکس کی طرف بڑھتا گیا اور جب ہمارے سینئر کمانڈروں کی آنکھیں کھلیں تو دشمن کے ٹینک مرالہ ہیڈ ورکس سے صرف ۱۵۰۰ میٹر کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ اگرچہ ایک سخت مقابلے کے بعد دشمن کی پیش قدمی کو روک دیا گیا لیکن پھکلیاں کا وسیع علاقہ بلا کسی مزاحمت کے دشمن کے قبضے میں جا چکا تھا۔ اِس کے بعد جنگ کا سارا زور ہمارے دائیں طرف ظفروال سے آگے شکر گڑھ ایریا میں رہا۔ دشمن کا منصوبہ تھا کہ پہلے مرحلے میں ٹانڈہ، مرالہ، سیالکوٹ، پسرور اور نارووال پر قبضہ کیا جائے اور دوسرے مرحلے میں مرالہ راوی لنک تک پیش قدمی کر کے بیک وقت جی ٹی روڈ پر پہنچ کر وزیر آباد اور گجرات پر قبضہ کیا جائے تاکہ ہماری سپلائی لائن کو منقطع کیا جا سکے۔ اِس مقصد کیلئے دشمن کے پانچ ڈویژن دس دن تک ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے لیکن ہمارے مجاہدوں نے اُنہیں شکر گڑھ سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

جیسا کہ جنرل فضل مقیم نے اپنی کتاب Pakistan`s Crisis In Leadership کے صفحہ ۲۱۵ پر نشان دہی کی ہے ہماری ساری کور کی جنگ کا مدار (Passive Defence) یعنی دفاع مجہول پر تھا۔ اِس لئے ہم اپنے مورچوں میں صرف اس مقصد کی خاطر بیٹھے تھے کہ دشمن نے اگر ہم پر حملہ کیا تو اُس کو آگے بڑھنے سے روکنا ہے۔ جو جنگ کے مجوزہ اصول "offence is the best defence" یعنی "جارحانہ کارروائی بہترین دفاع ہے" کے سراسر خلاف تھا۔ زمانہ ٔامن میں یہی پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے کہ دفاع کی حالت میں دشمن کو اپنی پوزیشن سے دور رکھنے کیلئے No man's land پر جارحانہ کارروائیاں جاری رکھنی ضروری ہیں۔ لیکن ہم تو پہلے ایک ہفتے تک یونہی پڑے رہے۔ سوائے ایک آدھ ریکی یا فائٹنگ پٹرول کے ہم سارا دِن اپنے دفاع میں بور ہوتے رہتے۔ ایک دن ایک لنگڑی بھینس چرتے چرتے ہماری دفاعی لائنوں میں پہنچ گئی۔ جسے میرے سینئر جے سی او نے اپنی دفاعی لائن کے پیچھے ایک باغیچہ میں بھجوا دیا۔ ہندوستانی ہونے کی شک میں میرے جوانوں نے اس کا نام اندرا گاندھی رکھ دیا۔ چند دن کی خاطر تواضع سے اُس پر جوبن آ گیا اور اُس نے اچھا خاصا دودھ دینا شروع کر دیا۔ جو ہم خود بھی پیتے اور دوسروں کی بھی خاطر کرتے۔

آہستہ آہستہ اِس کی خبر برگیڈ ہیڈ کوارٹر تک بھی پہنچ گئی۔ ہمارے برگیڈ کمانڈر برگیڈئر درانی بڑے زندہ دل اور خوش مزاج قسم کے اِنسان تھے، چھوٹا سا قد، مضبوط جسم کے ساتھ ساتھ بے حد چست و چالاک۔ ایک رات سی او صاحب کا پیغام ملا کہ کمانڈر صاحب اگلے دن گیارہ بجے کے قریب میری کمپنی کا ملاحظہ کریں گے۔ میں نے اپنے سینئر جے سی او صوبیدار بشیر احمد کو حکم دیا کہ کمانڈر صاحب کی ویزٹ کیلئے تیاری اور اُن کی خاطر تواضع کیلئے ہلکی پھلکی ریفریش منٹ کا بندوبست بھی کر لے۔

اگلے دن سوا گیارہ بجے کے قریب برگیڈئر صاحب کرنل نسیم اور سی او فیلڈ رجمنٹ کے ہمراہ میری کمپنی میں پہنچ گئے۔ غالباً یہ ۱۱ یا ۱۲ دسمبر کا دن تھا۔ میں نے اُنہیں اپنے اگلے مورچوں اور دشمن کے بارے میں بریف کیا۔ اس کے بعد ہم ریفرش منٹ کیلئے پیچھے سکول میں آ گئے۔ صوبیدار بشیر نے گرما گرم چائے کے ساتھ پکوڑوں وغیرہ کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ سی او فیلڈ رجمنٹ بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی بہانے کمانڈر صاحب کو یہ بتایا جائے کہ ہم نے بارڈر پر بھینس رکھی ہوئی ہے۔ اُس نے چائے کی چسکی لگاتے ہوئے مسکرا کر

مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''وحید بڑی مزیدار چائے ہے۔لگتا ہے اندرا گاندھی کا دودھ ڈالا ہے!''

اِس پر بریگیڈیئر درانی نے چونک کر ان اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے فوراً وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ سر آپ کو نہیں پتہ؟؟ وحید کی کمپنی نے انڈیا والوں کی ایک بھینس قیدی بنا رکھی ہے جس کا نام انہوں نے اندرا گاندھی رکھا ہوا ہے۔

اِس پر بریگیڈ کمانڈر کھل کھلا کر ہنس پڑے اور ساری مجلس زعفران زار بن گئی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ہمارے سامنے دشمن کی جبووال بارڈر پوسٹ تھی۔ یہ پوسٹ کنٹرول لائن سے کوئی ۵۰۰ میٹر اور میری دائیں فارورڈ پلاٹون سے کوئی ایک ہزار میٹر کے فاصلے پر واقع تھی۔ جس کے ٹاور سے ہمارے پورے دفاع کو زیرِ نگاہ رکھا جا سکتا تھا۔ کرنل صاحب بات کا رُخ پھیرنے کیلئے جبووال پوسٹ کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے پھر بولے:

''وحید وہ جو تمہارے سامنے دشمن کے دو چار آدمی بیٹھے ہیں۔ کیا تم اُن کو وہاں سے بھگا نہیں سکتے؟''

'سر ہم تو تیار ہیں لیکن آپ نے تو اپنی گنوں کو تیل لگا کر رکھا ہوا ہے۔ کہیں میلی نہ ہو جائیں! آپ ہمیں فائر سپورٹ دیں ہم تیار ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

'' نہیں نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں! تم فائر مانگو ہم دیں گے!!'' کرنل سنجیدہ ہو کر بولا

''ٹھیک ہے، آپ تو دو چار گولے چلا کر خاموش ہو جائیں گے لیکن اگلے دو تین دن تک دشمن اپنی مارٹروں اور فیلڈ گنوں سے ہماری پٹائی کرتا رہے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

کرنل نسیم نے مجھے آنکھ ماری اور میں خاموش ہو گیا۔ میری اِس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ بریگیڈ کمانڈر کے دورے کے اگلے دِن ہی مجھے سی او کی طرف سے آرڈر مل گیا کہ آج رات میں نے دو پلاٹونوں سے حملہ کر کے جبووال پوسٹ کو ختم کرنا ہے۔ توپخانے کی کوئی سپورٹ نہیں ہوگی۔ اُس کی جگہ اپنی اینٹی ٹینک گنوں کو کام میں لایا جائیگا۔ اندھے کو کیا چاہیئے تھا دو آنکھیں۔ ہم تو پہلے ہی بوریت کا شکار تھے۔ سورج غروب ہوتے ہی میں نے اپنی دونوں اینٹی ٹینک گنوں کو پوزیشن میں کیا۔ اور گن کمانڈر کو حکم دیا کہ ہمارے فائر کے ساتھ اُنہوں نے نشان شدہ ہدف پر گولے داغنے ہیں۔ اِس کے بعد میں نے دونوں پلاٹونوں کو دشمن کی پوسٹ سے کوئی سو گز کے فاصلے پر پوزیشن میں کر کے فائر شروع کروا دیا۔ اِس کے ساتھ ہی میری دونوں ٹینک شکن گنوں نے دو دو گولے داغ دیئے جو دشمن کی آبزرویشن پوسٹ پر براہ راست جا کر لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری مشین گن کا فائر درست نہیں ہو رہا۔ چنانچہ میں نے فائر

کرنے والے کو ایک طرف کر کے خود لیٹ کر فائر کرنا شروع کر دیا۔ ابھی میں نے ایک دو برسٹ ہی مارے تھے کہ کسی نے مجھے بیلٹ سے پکڑا اور اُٹھا کر پرے پھینک دیا۔ میں سنبھل کر اُٹھا تو حوالدار قربان یہ کہتے ہوئے گن پر لیٹ کر فائر کرنے لگا کہ ''صاب ہم مر گئے ہیں جو آپ فائر کریں گے!'' بہر حال کوئی آدھے گھنٹے تک ہم جبو وال پوسٹ پر گولہ باری اور فائرنگ کرتے رہے۔ جب ہمیں یقین ہو گیا کہ پوسٹ تباہ ہو گئی ہے تو ہم وہاں سے اپنے دفاع کی طرف چل پڑے۔ ہمارے فائر کے پانچ منٹ کے اندر اندر ہندوستانی توپوں نے ہماری پوزیشن پر جوابی گولہ باری شروع کر دی۔ تاہم دشمن کی گولہ باری کے باوجود ہم صحیح سلامت واپس اپنے مورچوں میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم خوش تھے کہ ہم نے دشمن کی پوسٹ تباہ کر کے اُس کا اُدھار چکا دیا ہے۔ اگلے دن میں نے قربان کو بلا کر پوچھا کہ کل مجھے مشین گن سے ہٹا کر میری جگہ وہ خود کیوں فائر کرنے لگا تھا؟ اُس نے جو جواب دیا وہ سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کا جواب تھا:

''سر آپ کو پتہ ہے کہ مشین گن کے فائر سے شعلہ پیدا ہوتا ہے۔ رات کے وقت دشمن کا جوابی فائر بھی اُس شعلے پر ہی آتا ہے۔ آپ ہمارے کمپنی کمانڈر ہیں!! اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو کمپنی کی کمان کون کرتا؟

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے ہمارے فرنٹ پر چند دنوں سے سکوت تھا لیکن پچھلی رات کے ہمارے حملے سے پھر سے گہما گہمی ہو گئی۔ ہندوستانی فیلڈ گنیں اور مارٹریں وقفے وقفے کے بعد ہماری پوزیشنوں پر اگلے دن بھی گولہ باری کرتی رہیں۔ دوپہر کے بعد میں اگلے مورچوں سے گزشتہ رات کے حملے کے نتیجے میں دشمن کی پوسٹ کا ملاحظہ کرنے جا رہا تھا کہ اچانک دیوی گڑھ کی سمت سے بھارتی فیلڈ گنوں نے بیک وقت فائر کر دیا۔ مارٹر کی نسبت فیلڈ گن کے فائر کی آواز اور پھٹنے کے درمیان وقفہ اتنا کم ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس آڑ میں پہنچنے کا وقت بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ قبل اِس کے کہ میں کسی اوٹ میں پہنچتا ایک گولہ مجھ سے پچاس گز کے فاصلے پر آ کر پھٹا۔ میں تو بال بال بچ گیا لیکن مجھ سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر میرے ایک سپاہی کو گولے کا ایک ٹکڑا لگا جس سے وہ سخت زخمی ہو گیا اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔ ہماری پوری پلٹن میں سے یہ واحد سپاہی تھا جسے شہادت کا رُتبہ نصیب ہوُا۔

باب ۱۱

آخری معرکہ

ہندوستان کے مشرقی پاکستان پر حملے کے بعد پچھلے تیرہ دن سے سارے بارڈر کے ساتھ ساتھ جنگ جاری تھی جس کی شدت دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ تعداد اور سامان حرب کی کمی کے باوجود پاکستانی فوج نے بڑی بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ تاہم ۳ دسمبر کی اعلانیہ جنگ تک بھارت جیسور سیکٹر میں ۶۰ مربع میل اور شمال مغربی سیکٹر میں ٹھاکر گاؤں کے ۱۵۰ مربع میل کے علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ لیکن اس کیلئے اُسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ برہمن باڑیہ اور کومیلا میں ہماری فوج نے دشمن کو ابھی تک پاکستانی حدود کے اندر گھسنے نہیں دیا تھا۔ اس کے باوجود ایسٹرن کمان کو ابھی تک اصل خطرے کا احساس نہیں ہُوا تھا۔ خاص کر جنرل نیازی ابھی تک اِسی بھول میں تھے کہ بھارتی باغیوں کیلئے مشرقی پاکستان کی حدود میں زمین کے کچھ حصے پر قبضہ کرنے کی کوشش میں ہیں جس کیلئے اُن کے حملے صرف بارڈر ایریا تک محدود رہیں گے۔ اور نہ ہی یحییٰ اور اُس کے ساتھیوں نے اس بارے میں کسی قسم کی پریشانی اور فوری توجہ کی ضرورت محسوس کی۔ اِسلئے کہ اُن کو بھی یقین تھا کہ ہندوستان کی جنگ کا مقصد صرف اور صرف باغیوں کیلئے بنگلہ دیش کی نام نہاد حکومت قائم کرنے کیلئے مشرقی پاکستان کے کچھ حصے پر قبضہ کرنا ہے۔

جس وقت پاکستانی فوج ہندوستانی افواج کے ساتھ بارڈر پر نبرد آزما تھی مکتی باھنی کے باغی جانے پہچانے راستوں سے اندرونِ ملک داخل ہو کر اُن قصبوں اور Focal Points کو گھیرے میں لے چکے تھے جن کو بعد میں مضبوط قلعوں میں بدلنا مقصود تھا۔ اِس کے علاوہ

ڈھاکہ کے دفاع کو کلیۃً نظر انداز کرتے ہوئے اِس کیلئے کوئی لڑاکا فوج مختص نہ کی گئی اور نہ ہی ایسٹرن کمان نے اپنی فوج کی ڈھاکہ کی طرف پس قدمی کا کوئی منصوبہ بنا رکھا تھا۔ پاکستان کی طرف سے ۳ دسمبر کی جوابی کارروائی کے بعد ہندوستان نے مشرقی پاکستان میں اپنی جنگ کے دوسرے مرحلے کا آغاز اپنی پوری فوجی قوت سے کردیا۔ اور اپنے مستقل ریڈیائی میڈیا اور جارحانہ سفارتی پروپیگنڈہ کے ذریعے پاکستان کو جارح گردانتے ہوئے جنگ کی تاریخ کو ۲۱ نومبر سے ۳ دسمبر میں بدل دیا۔ (۱۱۱)

باوجودیکہ پچھلے تیرہ دن سے بھارتی فوجوں نے مشرقی پاکستان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر جارحیت کا شکار بنا رکھا تھا اور دشمن ہمارے ملک کے دوسو مربع میل کے علاقے پر قبضہ کرچکا تھا لیکن سرحدوں سے دور دراز ڈھاکہ کے ایسٹرن کمان میں آرام سے بیٹھے معمول کے زندگی گزارنے والوں کو ابھی تک بھرپور جنگ کے شروع ہونے کا اِحساس تک نہ ہؤا تھا۔ وہ ابھی تک مبالغہ آمیز رپورٹیں بھجوانے میں مصروف تھے۔ اُس وقت کے ایسٹرن کمان کے پبلک ریلیشنز آفیسر کے مطابق:

''مغربی پاکستان کے محاذ پر جنگ کی ابتدا پاک فضائیہ کے حملوں سے ہوچکی تھی جس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ پہل بھارت نے کی ہے اور پاکستانی جیٹ طیارے جوابی کارروائی کیلئے سات بھارتی اڈوں پر تباہی نچھاور کر آئے ہیں۔ ان کے بعد ہماری بری فوج بھی پیش قدمی کرچکی ہے۔ یہ ساری باتیں ہمیں ریڈیو پاکستان کے ذریعے پہنچیں۔ جہاں تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے بھرپور جنگ کا پہلی بار اِحساس ۳ اور ۴ دسمبر کی درمیانی رات دو بج کر چالیس منٹ پر ہؤا جب بھارتی طیاروں نے ڈھاکہ ائرپورٹ پر حملہ بول دیا۔'' (۱۱۲)

جس وقت مشرقی پاکستان پر بھارت نے چڑھائی کی تو ہماری فضائیہ کے پاس ڈھاکہ کے اکلوتے ہوائی اڈے پر سولہ [redacted] جہازوں پر مشتمل صرف ایک سکواڈرن تھا جس کے پاس صرف دو ہفتے کا گولہ بارود تھا۔ اِس کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کی سرحدوں کے قریب تینوں طرف ہندوستانی ہوائی اڈوں پر بھارتی فضائیہ کے اٹھارہ اٹھارہ طیاروں پر مشتمل دس سکواڈرن ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ بھارتی فضائیہ جدید قسم کے مِگ، ایس یو ۷، کینبرا اور ہنٹر قسم کے لڑاکا اور بمبار طیاروں سے لیس تھی۔ اِس کے علاوہ جنوب کی سمت خلیج بنگال میں ہندوستان کا طیارہ بردار جہاز آئی این ایس وکرم موجود تھا جس کے طیارے چٹاگانگ سے لے

کر کا کسز بازار اور ٹیکناف تک کے علاقے پر چھائے ہوئے تھے۔

ہماری بحریہ کی حالت تو فضائیہ سے بھی پتلی تھی۔ اُس کے پاس ایک رئیر ایڈمرل اور چند سو ملاحوں کے سوا تھا ہی کیا؟ ۶۰ ر۴۰ ملی میٹر کی ہلکی توپوں سے مسلح صرف چار کشتیاں جو محض بحری راستوں سے سمگلنگ کی روک تھام کے کام آ سکتی تھیں۔ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے دریاؤں اور نالوں کے راستے شرپسندوں کی تخریبی کارروائیوں سے نپٹنے کیلئے مشین گنوں سے لیس مزید چند ایک کشتیاں بھی حاصل کر لی گئی تھیں۔ اِس محدود وسائل والی بحریہ کے ذمے ہزاروں میل لمبے دریاؤں اور نالوں کو شرپسندوں سے پاک رکھنے کے علاوہ چھ سو کلومیٹر پرمحیط ساحل کا دفاع بھی شامل تھا۔ ہماری بحریہ کے مقابلے میں بھارت کے بحری بیڑے میں ائر کرافٹ کیریئر کے علاوہ کئی تباہ کن بحری جہاز اور آبدوزیں شامل تھیں۔ (۱۱۲)

بھارتی فضائیہ نے سب سے بڑا ہوائی حملہ ۴ دسمبر کو کیا۔ اِس دن اُس نے ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر اکیس ائر ریڈز کئے۔ ہمارے تجربہ کار اور دلیر ہوابازوں نے اپنے پرانے [redacted] جہازوں سے جدید قسم کے طیاروں سے لیس نو آموز بھارتی ہوابازوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ اُنھوں نے دشمن کے ۹ جہاز مار گرائے۔ اِس کے علاوہ ہماری طیارہ شکن توپوں نے بھی دشمن کے جہازوں کو ڈھاکہ ائرپورٹ کے نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ اور دشمن کے ۷ طیارے اُن کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ جو چار بم دشمن کے جہازوں نے گرائے وہ بھی ائرپورٹ ایریا سے خاصے دور گرے جس کی وجہ سے ڈھاکہ ائرپورٹ کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اس دن دشمن کے سولہ کے مقابلے میں ہمارے صرف تین [redacted] جہازوں کا نقصان ہوا۔ پاک فضائیہ کے دو جہاز قبل ازیں ۲۲ نومبر کو جیسور سیکٹر میں اپنی فوج کو امدادی فائر دیتے ہوئے کام آئے تھے۔ ۵ دسمبر کے بار بار کے ہوائی حملوں کے باوجود دشمن کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ۶ دسمبر کی صبح ہمارے جہاز اپنی بری فوج کے امدادی فائر سے ابھی آ کر اُترے ہی تھے کہ بھارتی فضائیہ نے ایک زبردست ہوائی حملہ کر کے ڈھاکہ کا واحد ہوائی اڈہ اِس حد تک ناکارہ کر دیا کہ اُس کی مرمت کرنا ممکن نہ تھا۔ اِس کے بعد ہمارے طیاروں کیلئے وہاں سے پرواز کرنا ممکن نہ رہا۔ فضائیہ کی بے بسی کے بعد ہماری طیارہ شکن توپوں نے ڈھاکہ پر ہندوستانی ہوائی حملوں کا آخر دم تک مردانہ وار مقابلہ کیا اور دشمن کے مزید بارہ طیاروں کو مار گرانے میں کامیاب ہوئے۔ (۱۱۳)

جب فضائیہ اور بحریہ جنگ کے ابتدائی ایاّم میں ہی اپنا اپنا کردار ادا کر کے میدانِ جنگ

سے غائب ہوگئیں تو ساری ذمہ داری جنرل نیازی کے زیر کمان پینتالیس ہزار ریگولر فوج اور تہتر ہزار نیم عسکری نفری پر آن پڑی۔ نیم عسکری نفری ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز اور مقامی البدر اور الشمس تنظیموں کے مجاہدوں اور رضا کاروں پر مشتمل تھی۔ اِن بے چاروں کے پاس دوسری جنگِ عظیم کی ۳۰۳ بور کی متروکہ رائفلوں کے سوا نہ تو ڈھنگ کے ہتھیار تھے اور نہ ہی ایمونیشن۔ اِن ہتھیاروں کے ساتھ اُن سے جدید اسلحہ سے لیس بھارتی افواج اور مکتی باھنی پر فتح پانے کی توقع رکھنا اُن کے ساتھ سراسر ناانصافی اور حماقت تھی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نومبر کے آغاز میں جب دشمن کا دباؤ ساری سرحدوں پر بڑھ گیا تو جنرل نیازی نے جی ایچ کیو پر زور دیا کہ مزید دو ڈویژن فوج مشرقی پاکستان بھیجی جائے۔ جی ایچ کیو نے اٹھارہ پلٹنوں پر مشتمل دو ڈویژنوں کی بجائے آٹھ پلٹنیں بھیجنے کا فیصلہ کیا جن میں ہماری پلٹن بھی شامل تھی۔ نومبر کے آخر تک پانچ پلٹنیں تو پہنچ گئیں جن کے حصے بخرے کر کے مختلف کمانڈروں میں تقسیم کردئے گئے لیکن بشمول ہماری پلٹن کے باقی کی تین پلٹنیں بین الصوبائی رابطہ منقطع ہونے کی وجہ سے نہ جاسکیں۔

جنرل نیازی کے ماتحت کمانڈروں کی متفقہ رائے تھی کہ دشمن کے بڑے حملے کا رُخ کلکتہ کی جانب سے جیسور سیکٹر میں ہوگا۔ چنانچہ ماتحت کمانڈروں کے مشورے کی روشنی میں مشرقی پاکستان کے دفاع کا منصوبہ تیار کر کے چیف آف سٹاف آرمی کی منظوری کیلئے جی ایچ کیو بھجوا دیا گیا جو چند ایک تصریحات کے ساتھ منظور کرلیا گیا۔ اِس منصوبے کے تحت ایک کور سے بھی کم نفری کو مشرقی پاکستان کی ۲۷۰۰ کلومیٹر لمبی سرحد پر کچھ اِس طرح بکھیر دیا گیا:

شمال مغربی بنگال کا محاذ

اس میں دریائے گنگا اور جمنا کے درمیان کے طاس کا شمال مغربی بنگال کا سارا علاقہ شامل تھا۔ اِس علاقے کے بڑے بڑے شہر بوگرہ، پبنہ، راجشاہی، ناٹور، سراج گنج، رنگ پور اور دیناج پور تھے۔ اُس وقت تک جمنا پر کوئی پل تعمیر نہیں ہوا تھا۔ اِسلئے سوائے فیری کے صوبے کے جنوبی حصے کے ساتھ آمدورفت کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس سیکٹر کے دفاع کی ذمہ داری میجر جنرل نذر حسین شاہ پر تھی جن کے پاس ۲۳ اور ۲۰۵ بریگیڈز پر مشتمل ۱۶ ڈویژن کی کمان تھی۔ ۲۳ بریگیڈ رنگ پور اور ۲۰۵ بریگیڈ بوگرہ میں تھی۔ اِس کے علاوہ امدادی فوج کے طور

پر ڈویژنل آرٹلری کی بجائے صرف ایک فیلڈ رجمنٹ اور دوسری جنگ عظیم کے تھمے سپاہ... بھر ایم ۲۴ قسم کے ٹینکوں کے ساتھ ۲۹ کیولری رجمنٹ تھی۔ ہماری اِس فوج کا مقابلہ بھارت... تین ڈویژنوں پر مشتمل XXXIII کور کے علاوہ مکتی باہنی کی دو پلٹنوں (سیکٹر ۶، ۷) سے تھا۔

جنوب مغربی (جیسور) محاذ

یہ علاقہ مغربی بنگال کی مشرقی سرحد کے ساتھ ساتھ شمال میں دریائے گنگا سے لیکر خلیج بنگال تک چھ سو کلو میٹر پر پھیلا ہوا تھا۔ اِس علاقے کے بڑے بڑے شہر کشتیہ، جنیدہ، جیسور، کھلنا، باریسال اور فرید پور تھے۔ یہ ۹ ڈویژن جس کی کمان میجر جنرل انصاری کر رہے تھے کی ذمہ داری کا علاقہ تھا۔ یہ ڈویژن ۵۷ اور ۱۰۷ بریگیڈ پر مشتمل تھا۔ ڈویژنل آرٹلری کی بجائے ان کی سپورٹ کیلئے صرف دو فیلڈ رجمنٹیں تھیں۔ سب کمانڈروں کی متفقہ رائے تھی کہ دشمن کا سب سے بڑا حملہ یہاں سے ہوگا اِسلئے ایک ریکی اور سپورٹ بٹالین بھی اُن کے ماتحت کر دی گئی تھی۔ اِس کے بالمقابل دو مضبوط ڈویژنوں پر مشتمل بھارت کی II کور تھی۔ علاوہ ازیں مئی ۱۹۷۱ء سے مکتی باہنی نے اس علاقے کو دو سیکٹروں (۸ اور ۹) میں تقسیم کر کے یہاں پر اپنی دو گوریلا پلٹنیں لگا رکھی تھیں۔

شمالی محاذ

دریائے جمنا اور میگھنا کے طاس کا وسیع وعریض علاقہ ڈائریکٹر جنرل ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز میجر جنرل جمشید کے ذمے لگا دیا گیا۔ دریائے جمنا کے مشرقی کنارے سے لیکر سلہٹ کے بارڈر تک ۱۸۵ کلومیٹر لمبی اِس شمالی سرحد کے دفاع کیلئے سول آرمڈ فورسز کی نفری اور دو پلٹنوں پر مشتمل ۹۳ انفینٹری بریگیڈ کو ۳۶ ہنگامی ڈویژن کا نام دے کر جنرل جمشید کے حوالے کر دیا گیا۔ اِس کے مقابل پر دشمن کا ایک ۱۰۱ کمیونی کیشن زون تھا۔ جس میں ایک مضبوط ڈویژن کے علاوہ مکتی باہنی کی دو پلٹنیں بھی شامل تھیں۔

مشرقی محاذ

اِس سیکٹر میں اوپر شمال میں سلہٹ اور نیچے جنوب میں چٹا گانگ سے ملحقہ علاقہ چھوٹی

چھوٹی پہاڑیوں پر مشتمل تھا۔ سلہٹ کے مشرق میں ہندوستان کی میزو کی پہاڑیاں اور شمال میں شیلونگ کا پہاڑی سلسلہ واقع ہے اسی پہاڑی سلسلہ کے دامن میں سلہٹ کے چائے کے باغات واقع ہیں۔ درمیان میں تری پورا اور آسام کے میدانی علاقے سے ۱۰۰ میل پر میزو رام کا پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے جو چٹا گانگ ہل ٹریکٹ کے ساتھ جا ملتا ہے۔ یہاں پر چکمہ قبیلہ کے بدھ مت لوگ بستے ہیں جن کا لیڈر راجہ تری دیو رائے پاکستان کا حامی تھا۔ اس علاقے سے دشمن کے کسی حملے کا خطرہ نہ تھا۔ سب سے حساس علاقہ ریاست تری پورہ کے شہر اگرتلہ کے بالمقابل اکھوڑہ کا ریلوے پل اور جنکشن تھا جو سلہٹ کو چٹا گانگ اور ڈھاکہ سے ملاتا ہے۔ اِس پر قبضہ کر کے دشمن کا ڈھاکہ تک کا راستہ صاف ہو جاتا تھا۔ چنانچہ اِس کے دفاع کیلئے برہمن باڑیہ میں ایک بریگیڈ متعین کر دیا گیا۔ اور دوسرا بریگیڈ کومیلا میں لگا دیا گیا۔ ابتداً میں اِس سارے محاذ کے دفاع کی ذمہ داری میجر جنرل قاضی عبدالمجید کے ۱۴ ڈویژن کے سپرد تھی جس کا ہیڈ کوارٹر ابھی تک ڈھاکہ میں ہی تھا۔ لیکن جب نومبر کے آخر میں جی ایچ کیو کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ بھارت کا بڑا حملہ مشرقی جانب سے ہوگا تو جنرل نیازی نے اِس محاذ کو تین سیکٹروں میں بانٹ دیا۔ مغربی پاکستان سے مزید فوجی کمک نہ ملنے کی وجہ سے اُنہیں اپنے دیگر محاذوں سے نفری نچوڑ کر ہنگامی طور پر صرف نام کے دو مزید ڈویژن کھڑے کرنے پڑے۔ جنرل قاضی کی ذمہ داری اب سلہٹ سے برہمن باڑیہ تک رہ گئی۔ ان کا سامنا تین ڈویژنوں پر مشتمل بھارت کی IV کور اور مکتی باہنی کی ۴ پلٹنوں سے تھا۔

جنوب مشرقی محاذ

اس محاذ کی اہمیت کے پیشِ نظر جنرل نیازی نے اپنے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل رحیم کو ۳۹ ہنگامی ڈویژن کا کمانڈر لگا دیا۔ برہمن باڑیہ سے نیچے کومیلا، فینی، بلونیہ، لکشم اور چاند پور کا علاقہ اس میں شامل تھا۔ اِس چھوٹے سے علاقے کے دفاع کیلئے ۵۳ اور ۱۱۷ بریگیڈز اُن کے ماتحت کر دی گئیں۔ اس طرح دیگر ڈویژنوں کی نسبت اُن کے پاس باقاعدہ فوج کی نفری سب سے زیادہ تھی اور دفاعی علاقہ بہت کم۔ اِن کے مقابل پر مکتی باہنی کی K فورس اور سیکٹر ۲ میں ایک گوریلا پلٹن تھی جس کی کمان میجر خالد مشرف کر رہے تھے۔

چٹاگانگ سیکٹر

فینی سے نیچے جنوب کی سمت مشرقی پاکستان کا جو سرحدی علاقہ ہے وہ ایک پہاڑی سلسلہ ہے۔ اس سارے پہاڑی علاقے کے دفاع کی ذمہ داری چٹاگانگ کی ۹۷ بریگیڈ کے سپرد تھی۔ اس کی کمان بریگیڈیئر عطا ملک کر رہے تھے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں پر میجر ضیاءالرحمن بغاوت کے بعد اپنے کمانڈنگ آفیسر کرنل رشید جنجوعہ کو قتل کرکے ۸ ایسٹ بنگال کے ساتھ جا چھپا تھا اور وہاں سے پاک فوج پر گوریلا حملے کر رہا تھا۔ بعد میں اسے سیکٹر نمبر ا کا نام دے کر مکتی باہنی کی پلٹن کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کی پشت پر بھی بھارت کی IV کور کھڑی تھی۔

چنانچہ ہمارے تین ڈویژنوں کے مقابلے میں بھارت کی دس ڈویژن کے قریب تازہ دم فوج مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر صف آرا تھی۔ اِن میں سے دو ڈویژن ریزرو فوج چین کی سرحد پر پڑی تھی جسے بوقتِ ضرورت مشرقی پاکستان کی طرف موڑا جاسکتا تھا۔ ہمارے شمال مغربی علاقے پر حملہ کیلئے تین ڈویژنوں پر مشتمل ۳۳ کور تھی۔ عین شمال میں ۱۰۱ کمیونی کیشن زون تھا جو ایک لڑاکا ڈویژن کے طور پر لڑنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اِس کی کمان ایک میجر جنرل کے پاس تھی۔ رہ گئی مشرقی سرحد تو وہاں بھارت کے تین ڈویژن پڑے تھے۔ جن کی کمان IV کور کے حوالے تھی۔ ہر ڈویژن کے ساتھ جو ٹینک اور توپخانہ ضروری ہوتا ہے وہ بھی موجود تھا۔ (۱۱۴)

علاوہ ازیں چھاتہ بردار فوج کے ۳ بریگیڈ گروپ، بارڈر سکیورٹی فورس کی ۴۲ پلٹنیں، اور ایک لاکھ کے قریب مکتی باہنی کی گوریلا فورس بھی ہمارے خلاف نبرد آزما تھی۔ مزید برآں رسالے اور توپخانے کی مندرجہ ذیل اضافی یونٹیں بھی تھیں:

☆ ٹی ۵۵ قسم کے ۴۵ ٹینکوں پر مشتمل ایک رجمنٹ

☆ پی ٹی ۷۶ قسم کے ۷۰ ٹینکوں پر مشتمل ایک رجمنٹ اور دو سکواڈرن

☆ ۴۵ شرمن ٹینکوں پر مشتمل ایک رجمنٹ

☆ توپ خانے کی ایک فیلڈ اور ایک میڈیم رجمنٹ۔

ہندوستان کے ۴ دسمبر کے بیک وقت پوری طاقت کے ساتھ سہ طرفہ حملہ نے ہیڈ کوارٹر ایسٹرن کمان کو بوکھلا کے رکھ دیا اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ سب کے سب محاذوں کی جنگ پر اپنی گرفت کھو چکی ہے۔ اِس کی تین بڑی وجوہات تھیں۔ اوّل فوج کی چھوٹی چھوٹی

ٹکڑیوں کا ضرورت سے زیادہ علاقے پر پھیلاؤ۔ دوم ریل، آبی اور زمینی گزرگاہوں پر مخالف مقامی قوتوں کا اثر ورسوخ اور کسی مربوط مرکزی پس قدمی کے منصوبے کا فقدان۔ سوم فوج کے پھیلاؤ کی وجہ سے ڈویژنل اور بریگیڈ کمانڈروں کا اپنے ماتحت یونٹوں کی لڑائی پر اثر انداز نہ ہوسکنا۔ چنانچہ ٦ دسمبر تک دشمن نے اپنی فوجی طاقت اور تکنیک کی برتری نے پاکستانی فوج کو سارے محاذوں پر اگلی پوزیشنیں چھوڑ کر پیچھے دفاعی قلعوں میں محصور کر دیا۔ (۱۱۵)

مشرقی پاکستان کے دفاع کے منصوبے کی ساری کی ساری بنیاد چینیوں اور امریکنوں کی امداد اور مغربی پاکستان کی طرف سے دشمن پر حملے پر رکھی گئی تھی۔ ٦ دسمبر تک یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ مغربی پاکستان میں ہماری فوجیں سرحدی چوکیوں سے آگے پیش قدمی کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ جس نے مجموعی طور پر ہماری مشرقی پاکستان میں کئی مہینوں سے لڑنے والی افواج کی کارکردگی پر بہت بُرا اثر ڈالا۔ خاص کر ہائی کمان تو اپنے حواس تک کھو بیٹھی تھی۔ اِس کے بعد چند ایک کے سوا ہر محاذ پر ہمارے فوجیوں کو پسپا ہونا پڑا۔

۹ ڈویژن جیسور اور جنیدہ کے دفاعی قلعے خالی کر کے کھلنا اور دریائے مادھومتی کے کنارے جا پہنچا تھا۔ جنرل انصاری نے بھی اپنا ہیڈ کوارٹر منگورہ سے فرید پور منتقل کر لیا تھا تاکہ ڈھاکہ پہنچنے میں آسانی رہے۔ اگرچہ ٦ دسمبر تک ۱٦ ڈویژن کا ۲۳ بریگیڈ پس قدمی کر کے رنگ پور، سید پور اور دیناج پور میں دفاعی پوزیشنیں لے چکا تھا تاہم اِس سے نیچے ہلی میں ۴ ایف ایف جو بریگیڈیئر تجمل حسین کے بوگرہ والے ۲۰۵ بریگیڈ کا حصہ تھی ابھی تک اپنے مورچوں میں ڈٹی ہوئی تھی۔ (۱۱۸)

۴ ایف ایف سے میرا کسی نہ کسی رنگ میں تعلق رہا۔ مثال کے طور پر ۱۹٦۵ء کی جنگ میں ۱۱۵ بریگیڈ صرف ہماری پلٹن ۳ پنجاب اور ۴ ایف ایف پر مشتمل تھی۔ ۴ ایف ایف کی ایک کمپنی جنگ کے ابتدائی دنوں میں نارووال ایریا میں دریائے راوی پر جسڑ پل کی حفاظت کیلئے ہماری پلٹن کے ساتھ منسلک رہی۔ مشرقی پاکستان میں ہمارا آپریشنل ایریا بھی ہلی تھا جہاں اب میجر اکرم اپنی چارلی کمپنی کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا۔ میجر اکرم سے میری شناسائی اُس وقت ہوئی جب ہم نے ۱۹٦٦ء میں انفینٹری سکول کوئٹہ میں Officers Weapon & Junior Tactics کورس ایک ساتھ کیا۔ اُس وقت وہ کپتان تھے۔ کم گو، شرمیلے اور بے حد ملنسار انسان۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہم آپس میں گھل مل گئے۔ اور یہ تعلق بعد میں بھی قائم رہا۔

اُس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ سیدھا سادھا شرمیلا اکرم پہاڑ کے سے اٹل عزم و حوصلے اور شیر کے سے دل گردے کا مالک ہے۔

اِس علاقے کی یہ خاصیت تھی کہ ہلی کے شمال میں چورکئی سے لے کر نیچے جنوب میں بھاشانی کے گاؤں پھول باڑی تک دونوں ملکوں کی کوئی خاص سرحد بندی نہ تھی۔ ہلی کے مقام پر سید پور۔ ناٹور ریلوے لائن بارڈر کے اتنی قریب تھی کہ ہلی کا ریلوے پلیٹ فارم اور ریلوے لائن تو پاکستان کا حصہ تھے لیکن ریلوے سٹیشن کی عمارت ہندوستان میں۔ زمانۂ امن میں دونوں ملکوں کے باشندے کھلے عام یہاں سے بارڈر کے آر پار آتے جاتے۔ ۶ دسمبر تک دشمن نے سرتوڑ کوشش کی لیکن ہلی سے ۴ ایف ایف کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر کار دشمن مکتی باھنی کی مدد سے ہلی سے کوئی ۷ میل اوپر شمال میں چورکئی کے قریب سے ہمارے دفاع کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا اور میجر اکرم کی کمپنی پر شمال، جنوب اور سامنے سے انفنٹری اور ٹینکوں سے زبردست حملہ کر دیا۔ تاہم میجر اکرم اور اُس کے جوان اپنے مورچوں میں ڈٹے رہے۔ وہ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک مورچے سے دوسرے مورچے میں جا کر اپنے جوانوں کے حوصلے بلند کرتے اور اُن کو شاباش دیتے۔ اِسی کارروائی کے دوران وہ دشمن کے ٹینک کے گولے کا نشانہ بن کر شہید ہو گئے۔ شہادت کے بعد وہ خود تو امر ہو گئے لیکن اُن کی کمپنی کے قدم اُکھڑ گئے۔ کمپنی کا بیشتر حصہ شہید ہو گیا۔ صرف چالیس جوان بچ کر باقی پلٹن تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ میجر اکرم بعد از شہادت نشانِ حیدر کے اعزاز کے حقدار ٹھہرے۔ اُن کی شہادت کے ساتھ ہی دشمن نے ہلی سے لیکر بیر گنج تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ۱۶ ڈویژن کی رنگ پور کے ساتھ واحد سپلائی لائن کٹ گئی۔ چنانچہ ۷/۸ دسمبر کی رات جنرل نذر حسین شاہ جب رنگ پور کا دورہ کر کے واپس اپنے ہیڈ کوارٹر بوگرہ جا رہے تھے تو دشمن نے اُن کی جیپ پر فائر کھول دیا۔ وہ خود تو بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے لیکن جیپ دشمن نے تباہ کر دی۔ یہ جنرل نذر کا رنگ پور کا آخری دورہ تھا۔ اُن کا ڈویژن اب ۲ حصوں میں بٹ چکا تھا۔ بچی کھچی ۴ ایف ایف کو واپس بوگرہ میں بلا کر بقیہ بریگیڈ کے ساتھ اُس کے دفاع میں لگا دیا گیا۔

اُدھر ۱۴ ڈویژن کا حال یہ تھا کہ جنرل قاضی اور اُن کے بریگیڈیئر سعد اللہ سرحدی علاقے خالی کر کے ڈھاکہ کی سمت دریائے میگھنا کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ جبکہ اُن کے باقی تین

بریگیڈ کمانڈروں کو دشمن کی چھاتہ بردار فوج نے سلہٹ میں گھیرے میں لے رکھا تھا۔ میجر جنرل رحیم کے زیر کمان ۳۹ ہنگامی ڈویژن کا یہ حال تھا کہ جنگ شروع ہونے کے ساتھ ہی اس کے زیر کمان یونٹوں نے ایک ایک کر کے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے شروع کر دئے۔ دشمن سے لڑنے کی بجائے یہ زمانۂ امن کا کاغذی شیر ایک ہفتے کے اندر اندر ہی اپنا سارا ڈویژن دشمن کے حوالے کر کے معمولی خراشوں کے ساتھ ڈھاکہ میں جنرل فرمان کے گھر پر اُن کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اور موقع ملتے ہی اُس ہیلی کوپٹر کو لے کر برما کے راستے مغربی پاکستان بھاگ گیا جس پر جنرل نیازی نے نصف درجن نرسوں کو بھیجنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ یہاں مغربی پاکستان میں اُس کا کورٹ مارشل کرنے کی بجائے موصوف کو عزت و احترام کے ساتھ پھر سے جی ایچ کیو میں براجمان کر دیا گیا۔ اِسلئے کہ وہ بھٹو کا اپنا آدمی تھا۔

۳۶ ہنگامی ڈویژن کے کمانڈر میجر جنرل جمشید نے ۱۸۵ کلومیٹر لمبی سرحد میں اپنے اکلوتے بریگیڈ کو دو اہم راستوں کمال پور سے ڈھاکہ براستہ ٹنگیل اور ہلوا گھاٹ سے میمن سنگھ کے دفاع کی ذمہ داری سونپی اور خود اپنا ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ سے آگے منتقل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بریگیڈ کمانڈر بھی ۳۱ بلوچ کو کمال پور اور ۳۳ پنجاب کو ہلوا گھاٹ والے راستے پر متعین کر کے خود میمن سنگھ میں قلعہ بند گیا۔ اِن دو پلٹنوں کے مقابلے میں دشمن کا 101 کمیونی کیشن زون تھا۔ اِس محاذ پر سب سے اہم کردار میرے ایک ساتھی میجر محمد ایوب کا ہے۔ اپریل ۱۹۷۱ء میں ہم دونوں سیالکوٹ میں ۸ویں ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر میں اکٹھے نوکری کر رہے تھے۔ یہیں سے اُس کی بدلی ۳۱ بلوچ میں ہوئی تھی۔ اُس وقت وہ کیپٹن تھا۔ اونچا لمبا خوبصورت جوان، خوش خلق، خوش گفتار اور خوش مزاج۔ چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ۔ بلا کا دلیر۔ مجھے یاد ہے جب اُس کی بدلی مشرقی پاکستان میں ہوئی تو بڑا خوش تھا۔

کمال پور پوسٹ والا راستہ پکی سڑک ہونے کی وجہ سے دشمن کیلئے بہت اہم تھا۔ دشمن کئی مہینوں سے اِس پوسٹ پر حملے کر رہا تھا لیکن ہر دفعہ لاشیں پیچھے چھوڑ کر لوٹتا۔ آخر ۱۴ نومبر کو دشمن نے توپ خانے کے مسلسل چھاتے کے نیچے اپنی گارڈز بٹالین اور مکتی باھنی سے دونوں پہلوؤں سے کمال پور پوسٹ پر بیک وقت حملہ کر دیا۔ زبردست لڑائی کے بعد دشمن نے ستر افراد پر مشتمل کیپٹن احسن کی کمپنی کو گھیرے میں لے کر باقی پلٹن سے کاٹ دیا لیکن ہمارے جوانوں نے دشمن کو پوسٹ پر قبضہ نہ کرنے دیا۔ پندرہ دن کی مسلسل جدوجہد کے باوجود ۳۱

بلوچ اپنی اِس کمپنی کو نہ تو راشن سپلائی کر سکی اور نہ ہی ایمونیشن جو راشن سے بھی زیادہ اہم تھا۔ آخر ۲۹ نومبر کو میجر ایوب نے اپنے ساتھ چند رضا کاروں کو لیا اور ہر صورت میں چوکی تک کمک پہنچانے کا عزم لے کر کمال پور پوسٹ کی طرف چل پڑا۔ چھپتے چھپاتے کھیتوں کے راستے چوکی کے پاس پہنچنے ہی والے تھے کہ دشمن کو خبر ہوگئی اور اُس نے فائر کھول دیا۔ میجر ایوب تو ہمت کر کے چوکی میں پہنچ گیا لیکن رضا کار راشن اور ایمونیشن پھینک کر واپس پلٹن میں پہنچ گئے۔ ہمارے جوانوں تک نہ تو راشن پہنچ سکا اور نہ ہی ایمونیشن لیکن میجر ایوب کی آمد سے اُن کے حوصلے بلند ہوگئے۔ اِسلئے کہ کوئی اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اُن کی خبر گیری کیلئے تو آیا۔ پوسٹ میں راشن تقریباً ختم تھا، ایمونیشن نہ ہونے کے برابر تھا۔ میجر ایوب نے واپس آکر کمانڈنگ آفیسر کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ اِس کے باوجود نہ تو وہ دشمن کا محاصرہ توڑ کر اپنے جوانوں کو اُس کے نرغے سے نکال سکے اور نہ ہی انہیں راشن اور ایمونیشن سپلائی کر سکے۔ ۴ دسمبر کو دشمن نے اِس کانٹے کو اپنے راستے سے صاف کرنے کی خاطر ہیلی کاپٹروں اور زمینی فوج سے بھر پور حملہ کر دیا۔ میجر ایوب چونکہ کمال پور پوسٹ کی دگرگوں حالت سے واقف تھا اِس لئے اُس نے آخری بار وہاں کمک پہنچانے کی کوشش کی ٹھانی لیکن دشمن کا گولہ لگنے سے راستے میں ہی شہید ہو گیا اور بعد از شہادت ستارۂ جرأت کا حق دار قرار پایا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں پلٹنوں کو سرحدی چوکیاں خالی کر کے پس قدمی پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن مناسب منصوبہ بندی اور کمان اور کنٹرول کے فقدان کی وجہ سے ۹۳ بریگیڈ کا بیشتر حصہ تتر بتر ہو کر ادھر اُدھر بھٹکنے لگا اور ایک ایک کر کے دشمن کے ہتھے چڑھ گیا۔ کمانڈر ۹۳ بریگیڈ بریگیڈیئر قادر اور اُس کے دو درجن ساتھی ڈھاکہ پہنچنے کی کوشش میں تین دن اور تین راتیں دلدلی علاقے کی بلاؤں سے لڑتے لڑاتے، بھوکے پیاسے ۱۴ دسمبر کو مرکھپ کر ٹنگیل روڈ پر کلیا کیر کے نزدیک پہنچے تو دشمن کی چھاتہ بردار فوج جو اُس وقت تک ڈھاکہ جانے کے سب راستوں پر قابض ہو چکی تھی اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ اِس طرح جنرل جمشید کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے اُس کے ڈویژن سے بریگیڈیئر رینک کا ایک آفیسر دشمن کا قیدی بنا۔

بھارتی ملٹری کمانڈروں نے ۸ دسمبر سے میجر جنرل فرمان علی کو ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دینے کے پیغامات بھجوانے شروع کر دئے تھے۔ چنانچہ حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے گورنر مالک نے صدر پر زور دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ جنگ بندی کر کے سیاسی تصفیے کی کوشش

کریں لیکن اُس بے چارے کی سنتا کون تھا۔ آخر ۹ دسمبر کو جنرل نیازی نے مندرجہ ذیل سگنل کے ذریعے اپنی بے بسی کا اِعتراف کرتے ہوئے صدر سے مداخلت کی بھرپور اپیل کی:

"(۱) فضا میں دشمن کی برتری کے باعث بکھری ہوئی فوج کی صف بندی اور دوبارہ تنظیم ممکن نہیں۔ مقامی لوگوں کا رویہ اِنتہائی مخاصمانہ ہے۔ وہ دشمن کو ہر ممکن مدد دے رہے ہیں۔ رات کے وقت مکتی باہنی کی چھاپہ مار کارروائیوں کی وجہ سے نقل وحرکت مشکل ہے۔ وہ دشمن کی فوج کی رہنمائی کرتے ہوئے اُسے ہمارے عقب میں لے آتے ہیں۔ ہوائی اڈہ زبردست نقصان کے باعث ناقابلِ استعمال ہو چکا ہے جس کی وجہ سے گزشتہ تین دنوں سے ہمارے جہاز پرواز نہیں کر سکے اور آئندہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

(۲) دشمن کی فضائی کارروائیوں سے ہمارے بھاری ہتھیاروں اور جنگی سامان کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے جوان تاحال بڑی جرأت سے لڑ رہے ہیں، مگر ان پر تھکان اور دباؤ کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ وہ گزشتہ کئی دن سے سو نہیں سکے، کیونکہ دشمن کے جہاز، توپیں اور ٹینک مسلسل گولہ باری کر رہے ہیں۔

(۳) صورت حال انتہائی نازک ہے، مگر ہم اپنی استطاعت کے مطابق لڑتے رہیں گے۔

(۴) آپ سے درخواست ہے کہ اِس علاقے میں دشمن کے تمام ٹھکانوں پر فضائی حملے کا اہتمام کریں۔ اور اگر ممکن ہو، تو ڈھاکہ کے دفاع کیلئے جہازوں کے ذریعے کمک روانہ کریں۔" (۱۱۷)

جنرل نیازی کے سگنل سے دن رات خرمستیوں میں مصروف فوجی حکمرانوں کے ہوش ٹھکانے تو آئے لیکن مشرقی پاکستان کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے کا اِختیار گورنر مالک کو دے کر وہ خود پھر بری الذمہ ہو گئے۔ اُسی دن مندرجہ ذیل سگنل گورنر کو بھجوا دیا گیا:

"آپ کا پیغام مل گیا ہے۔ آپ نے جو تجویز مجھے بھیجی ہے میری طرف سے آپ کو اُس پر عمل کرنے کی پوری طرح سے اجازت ہے۔ بین الاقوامی سطح پر جو اقدامات ممکن ہیں وہ کئے جا رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ہم دونوں کے درمیان اب براہِ راست کوئی رابطہ نہیں رہا اسلئے مشرقی پاکستان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اِختیار میں کلیۃً آپ کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں۔ میں آپ کے ہر فیصلے کی توثیق کروں گا۔ جنرل نیازی کو بھی ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ آپ کے فیصلے پر عمل کرے۔ اِس بے مقصد تباہی سے بچنے کیلئے اور ہماری افواج کے تحفظ کو یقینی بنانے کیلئے ہر سیاسی ممکنہ ذریعے کو بروئے کار لا کر ہمارے مخالفین کے ساتھ آپ جو بھی کوشش کرنا چاہتے ہیں وہ کریں۔" (۱۱۸)

باب ۱۲

اور پاکستان ٹوٹ گیا

ہندو پاکستان جنگ کی مکمل تفصیل لکھنا نہ تو میرے بس میں ہے اور نہ ہی اس کتاب کا مقصد۔ یہاں پر بھارتی فوج کے کیل کانٹوں سے لیس ٹڈی دل کے مقابلے میں اپنی فوج کی حوصلہ شکن کارروائی کی ایک چھوٹی سی جھلک پیش کرنے کا مقصد محض یہ ہے کہ جب کرنل غلام حسین چوہدری، میجر شبیر شریف، کیپٹن عارف سعید، میجر اکرم، میجر ایوب اور اُن جیسے اور کئی گمنام سرفروش جام شہادت نوش کر چکے تھے اور اُن کی انمٹ قربانیوں کے باوجود جب فوج کا اکثر و بیشتر حصہ اِنتشار کا شکار ہو چکا تھا اور جب تمام سینئر کمانڈر اپنے گرد کئی مہینوں کی لگاتار جنگ کی تکان سے چور بچے کھچے فوجی جوانوں، مجاہدوں اور رضا کاروں پر مشتمل دفاعی قلعوں میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ جب بھارتی فوجیں اِن نام نہاد دفاعی قلعوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈھاکہ کی طرف مسلسل بڑھ رہی تھیں۔ جب دشمن کی فضائیہ کے جنگی جہاز چیلوں اور گدھوں کی طرح مشرقی پاکستان کی فضاؤں میں منڈھلا رہے تھے۔ جب بھارت بنگلہ دیش کو تسلیم کر چکا تھا (٦ دسمبر) اور جب مشرقی پاکستان کے گورنر ڈاکٹر اے ایم مالک یحییٰ خان کو ایک دردانگیز سگنل بھجوا چکے تھے جس میں جنرل نیازی کے بیان کا حوالہ دیا گیا تھا کہ مشرقی اور مغربی سیکٹروں میں تمام محاذ مکمل طور پر درہم برہم ہو چکے ہیں اور دریائے میگھنا کا شمالی علاقہ بھی ہاتھ سے بس نکلنے ہی والا ہے۔ چٹاگانگ سے کوئی چیز ملک کے اندر نہیں لائی جا سکتی۔ سارے صوبے میں نقل و حرکت جام ہو کے رہ گئی ہے۔ اِس کے نتیجے میں رسدات کی کمی واقع ہو کے رہ گئی ہے۔ چند دن کے اندر اندر ڈھاکے میں نہ اشیائے خوردنی دستیاب ہوں گی، نہ

اسلحہ نہ ایندھن اور نہ ہی تیل۔ بنابریں زندگی مکمل طور پر مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔۔۔۔ تب کہیں جا کر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق ہندوستان کی جارحیت کو سفارتی محاذ پر مقابلہ کر کے بے نقاب کرنے کیلئے مسٹر نورالامین کو نام نہاد وزیر اعظم اور بھٹو کو نائب وزیر اعظم اور وزارت خارجہ کے منصب پر متمکن کر دیا گیا۔(۱۱۹)

لیکن بعد کے حالات سے یہ بات عیاں ہوگئی کہ بھٹو کیلئے یہ سب معمول کا عمل تھا۔ اُنہوں نے وزیر خارجہ کا عہدہ سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل نمائندے مسٹر آغا شاہی کو وزارت خارجہ کی وساطت سے یہ ہدایات دیں کہ وہ سیکورٹی کونسل میں جانے کیلئے کوئی قدم نہ اُٹھائے اور مزید ہدایات کا اِنتظار کرے۔ اگلے ۳۶ گھنٹوں میں کچھ ہونے والا ہے۔(۱۲۰)

۱۹۷۱ء کی اس جنگ کے دوران سفارتی محاذ پر کی جانے والی پاکستان کی سرگرمیوں اور کوششوں کے گرد ایک پر اسرار پردہ لپٹا ہوا ہے۔ مسٹر بھٹو ۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اقوام متحدہ کیلئے روانہ ہوئے۔ بظاہر تو وہ بڑی عجلت میں وزیر خارجہ بننے کے اگلے دن ہی گھر سے نکل پڑے تھے۔ اور جاتے جاتے درج ذیل بیان بھی داغ گئے تھے:

"ہم آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، بلکہ اگر ایک ہزار سال تک بھی لڑنا پڑا تو پاک سرزمین سے بھارتی جارحیت کا صفایا کر کے دم لیں گے۔" (۱۲۱)

مگر ان نازک حالات میں بھی سیدھے نیویارک جانے کی بجائے ایران ہوتے ہوئے جرمنی کے شہر فرنکفرٹ جا کر ستانے لگے۔ بہانہ یہ کہ اُن کو نیویارک کیلئے سیٹ نہیں مل رہی۔ وہاں پر بیٹھ کر وہ دو دن تک مسٹر آغا شاہی سے سلامتی کونسل کی کاروائی کی لحہ لحہ کی رپورٹ لیتے رہے۔ اور ۱۰ دسمبر کو نیویارک پہنچ کر بھی اگلے تین دن تک سیکورٹی کونسل کے ممبران سے رابطہ قائم نہ کیا۔ آخر کیوں؟ ۱۸ دسمبر کو مشرقی پاکستان گنوانے کے بعد اگر اُنہیں روم سے پی آئی اے کا سپیشل طیارہ واپس لانے کیلئے جا سکتا تھا تو موقع کی نزاکت کی مناسبت سے ۸ دسمبر کو اُسی پی آئی اے کا سپیشل طیارہ اُسے نیویارک لے کر نہیں جا سکتا تھا؟

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مغربی پاکستان کے محاذ پر لڑائی شروع ہوتے ہی ۴ دسمبر کو سوویٹ یونین نے سلامتی کونسل میں ایک قرارداد کا مسودہ پیش کیا جس میں مشرقی پاکستان میں ایک سیاسی تصفیہ کیلئے کہا گیا تھا جس کا مقصد وہاں پر جاری لڑائی کو بند کرنا تھا۔ لیکن

پاکستان نے یہ قرارداد نامنظور کردی۔ کیوں......؟؟؟اِس قرارداد کے ذریعے گورنر مالک نے اقوامِ متحدہ کی وساطت سے اقتدار مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کے حوالے کرکے پاکستانی افواج کی وہاں سے باعزت واپسی کیلئے ایک آخری کوشش کی تھی۔ انہوں نے ۱۰ دسمبر کو ڈھاکہ میں موجود اقوام متحدہ کے اسسٹنٹ جنرل سیکریٹری مسٹر پال مارک ہنری کو میجر جنرل سول آفیئرز راؤ فرمان علی خاں اور چیف سیکریٹری مظفر حسن کی موجودگی میں ایک یادداشت سپرد کی جس کے اہم نکات یہ تھے: ☆فوری جنگ بندی ☆ بھارتی فوج کی مشرقی پاکستان کی حدود سے واپسی ☆ مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کو اِقتدار کی منتقلی ☆ پاکستانی افواج کی آبرومندانہ مغربی پاکستان کو واپسی ☆ وہ تمام غیر بنگالی جو مغربی پاکستان جانا چاہتے ہیں اُن کا پُر امن اِنخلا ☆ اِن تجاویز کا مقصد صرف پرامن طور پر اِنتقالِ اِقتدار ہے نہ کہ ہتھیار ڈالنے کی پیشکش۔ ☆ مذکورہ تجاویز ناقابلِ قبول ہونے کی صورت میں ہماری افواج آخری سپاہی تک لڑتی رہیں گی۔

لیکن اُس وقت تک بھٹو بھی اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کی غرض سے نیویارک پہنچ چکے تھے۔ اِدھر بھارتی فوجیں ڈھاکہ کی دہلیز پر کھڑی تھیں اُدھر بھٹو ہرممکن تاخیری حربہ بروئے کار لا کر جنگ کو طول دینے میں مصروف تھے۔ جونہی یہ یادداشت اقوام متحدہ کے سیکرٹیریٹ پہنچی بھٹو نے اِس سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے کسی بھی کارروائی سے روک دیا اور ساتھ ہی صدر پاکستان کو پیغام بھیجا کہ مذکورہ مراسلے سے اُن کی پوزیشن کمزور ہوگئی ہے ورنہ وہ چین اور امریکہ کو مدد کیلئے آمادہ کرر ہے تھے۔ عجیب منطق تھی بھٹو صاحب کی؟ پاکستانی فوج انتشار کا شکار تھی؛ بھارتی فوجیں ڈھاکہ میں داخل ہورہی تھیں؛ چینی مندوب نیویارک میں نہیں پیکنگ میں بیٹھا تھا؛ امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کا کوئی سراغ نہ تھا بھٹو صاحب پتہ نہیں کسے مدد کیلئے آمادہ کرر ہے تھے۔ بوکھلایا ہوا یحیٰی ایک دفعہ پھر بھٹو کے جھانسے میں آ گیا۔ اُس کے حکم کے تحت مرکزی حکومت کے ترجمان نے ۱۳ دسمبر کو ایک پریس کانفرنس بلا کر جنگ بندی کی تجویز کی تردید کردی۔ اِسی پر اِکتفا نہیں کیا بلکہ اِس تردید کے بارے میں گورنر مشرقی پاکستان کو مطلع کرتے ہوئے اِس بات کی تنبیہ بھی کی گئی کہ اُنہیں جو اِختیار دیا گیا تھا اُس کا اِستعمال کرتے وقت متحدہ پاکستان کی سالمیت کا تو خیال رکھا ہوتا۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بھارتی طیاروں نے ڈھاکہ پر حملہ کرکے گورنر ہاؤس تباہ کردیا۔ گورنر نے

پوری کابینہ کے ارکان اور اعلیٰ سرکاری افسران سمیت حکومت سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل میں پناہ لے لی۔ یاد رہے کہ ریڈ کراس نے اس ہوٹل کو طرفین سے غیر جانبدار پناہ گاہ تسلیم کر دیا ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان کی حکومت عملی طور پر ختم ہو گئی۔ اُس دن نہ صرف گورنر ہاؤس کا تنبہ بکھرا بلکہ خود حکومت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ (۱۲۲)

بھٹو کی شعبدہ بازی

اُدھر یو این او کی سیکورٹی کونسل میں روس کے ایماء پر پولینڈ نے مشرقی پاکستان کے سیاسی بحران کو نمٹنے کیلئے آخری کوشش کے طور پر ۱۴ دسمبر کو ایک ڈرافٹ قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ وہاں جنگ عارضی طور پر بند کر دی جائے ۲۔ مشرقی پاکستان میں اقتدار وہاں کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے ۳۔ مشرقی محاذِ جنگ سے انخلا کے پیشِ نظر پاکستانی افواج جنگ کے بعد عرصہ کے آغاز کے مقامات پر آنا شروع ہو جائیں ۴۔ اور بھارتی مسلح افواج بھی مشرقی پاکستان سے نکل جائیں۔ (۱۲۳)

پولینڈ کی قرارداد میں قریب قریب وہی اقدامات تھے جو اِس سے قبل گورنر مشرقی پاکستان کے ۱۰ دسمبر کے اقوامِ متحدہ کے نام مراسلے میں درج تھے۔ بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں یحییٰ خان نے بھٹو کو نیویارک ٹیلیفون کر کے مشورہ دیا کہ ’’ہمیں اِس قرارداد کو قبول کر لینا چاہیئے لیکن اُس نے یحییٰ کی بات سنی ان سنی کر دی۔‘‘ (۱۲۴)

وہ سب چاہتے تھے کہ جنگ بند ہو جائے۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن کر شیخ مجیب الرحمٰن کی جھولی میں چلا جائے۔ پاکستانی مسلح افواج بھارتی افواج کے شکنجے سے نکل کر عزت وقار کے ساتھ مغربی پاکستان واپس آ جائیں۔ اور ’’زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد‘‘ کے مصداق اپنے اقتدار کیلئے انہیں از سرِ تو فوج سے مغز ماری کرنا پڑے۔ اگر یہ سب کچھ ہو جاتا تو مغربی پاکستان میں بلاشرکتِ غیرے اُنہیں اِقتدار پر کون براجمان ہونے دیتا۔ اُن کا منصوبہ تو یہ تھا کہ فوج کو میدانِ جنگ میں شکست ہو؛ مجیب کو سیاسی منظر سے دور کیا جائے تاکہ یحییٰ مجبور ہو کر اقتدار اُن کے حوالے کر دے۔ اس مقصد کیلئے بھٹو ہر ایک طریقہ جائز سمجھتے تھے۔ (۱۲۵)

وہ تو پچھلے پانچ دِن سے امریکی حکام کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر مغربی پاکستان میں ہندوستان کی پیش قدمی کو رکوانے کے چکر میں تھے۔ مشرقی پاکستان اور وہاں پر موجود مغربی

پاکستان کی فوج اور سول عوام کو وہ اپنی طرف سے بھارت اور بنگالیوں کے حوالے کر چکے تھے۔

قریب چار دہائیوں کے بعد آج جبکہ بھٹو کو بھی اِس جہان سے کوچ کئے ربع صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے یہ جان کر میرا دِل خون کے آنسو روتا ہے کہ میرا ہیرو، اور مجھ جیسے اور بہت سے جذباتی وطن پرست پاکستانیوں کے دلوں کی دھڑکن محمد ذوالفقار علی بھٹو مسندِ اقتدار پر جلوہ افروز ہونے کی خاطر اپنی ہی قوم کے محافظوں اور اُن کے ہمراہ ہزاروں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت و ناموس کا اُس قوم کے ساتھ درپردہ سودا طے کرنے کا مجرم ہے جس قوم پر ہم نے سات سو سال تک حکومت کی تھی۔ میرے کانوں میں آج بھی سلامتی کونسل کے ممبران سے اِنصاف کی اپیل کرتے وقت بھٹو کی آہوں اور سسکیوں کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ۱۵ دسمبر کی یخ بستہ گھپ اندھیری رات کو میں اپنے بنکر میں دُبکا ایک چھوٹا ساٹرانسسٹر کان سے لگائے اُن کی وہ معرکہ خیز تقریر سن رہا تھا جس میں وہ کہہ رہے تھے:

''سلامتی کونسل شرمناک طریقے سے ناکام رہی ہے۔ ہمارے خلاف اِنتہائی عریاں اور بدترین جارحیت ہوئی ہے۔ اب میرے لئے یہاں کچھ نہیں رہا، اسی لئے میں اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ بات نکال رہا ہوں۔''

اُنہوں نے سلامتی کونسل کے ممبران کو لتاڑتے ہوئے کہا:

'ہم یہاں چار روز سے بحث و تمحیص کر رہے ہیں۔ سلامتی کونسل نے چار روز تاخیر کی ہے!'...... یہ تاخیر کیوں کی گئی؟ مقصد یہ تھا کہ ڈھاکہ فتح ہو جائے!!'' (۱۲۶)

اُنہوں نے سلامتی کونسل کے ممبران کو مخاطب کر کے کہا:

''ہم پر جو مرضی ہو فیصلہ تھوپ دو!! جارحیت کو جائز بنا دو اور غیر ملکی قبضے کو جائز قرار دے دو!! لیکن میں اس مکروہ کارروائی میں شامل نہیں ہونگا۔ میں یہاں پر اپنا وقت کیوں ضائع کروں؟ میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا اور جنگ کروں گا!!''

اُنہوں نے قرارداد کا مسودہ پھاڑ ڈالا اور یہ کہتے ہو باہر نکل گئے:

''میں اس شرمناک شکست میں پارٹی نہیں بننا چاہتا!!'' (۱۲۷)

بھٹو صاحب کی سسکیوں کے ساتھ میں بھی زار و قطار رونے لگا۔ وہ میرا لیڈر تو تھا ہی لیکن اس کے بعد تو میری جان بھی اُس پر قربان تھی۔ اگر وہ میرے پاس ہوتا تو میں اُس کے قدم چومتا، اُسے اپنے کندھوں پر اُٹھاتا، اور پتہ نہیں اُس کیلئے کیا کچھ نہ کرتا!! لیکن وائے افسوس کہ بعد میں، جب راز فاش ہوا تو یہ سب ایک پہلے سے طے شدہ ڈرامہ نکلا......؟؟ بھٹو

کی چال کامیاب ہوئی۔ جنرل یحییٰ کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے اپنی فوج کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ اُسی شام جس دن بھٹو نے سلامتی کونسل میں پولینڈ کی قرارداد کو نامنظور کر کے متحدہ پاکستان کے سسکتے ہوئے لاشے کو آخری ٹھوکر مار کر ہمیشہ ہمیش کیلئے موت کی نیند سلا یا تھا یحییٰ خان نے بھی مایوس ہو کر گورنر مالک اور جنرل نیازی کو جنگ بندی کر کے لوگوں کے جانی تحفظ کیلئے ضروری اقدامات کرنے کا حکم دے دیا۔ عجیب اِتفاق ہے جس وقت بھٹو صاحب پولینڈ کی قرارداد کو ریزہ ریزہ کر کے متحدہ پاکستان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہے تھے اُسی وقت بھارتی وزیرِاعظم اپنی قوم کو بنگلہ دیش کی پیدائش کے بعد ایک اور مژدہ سنانے کا عہد کر رہی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں فتح کے بعد بھارت نے اب اپنی ساری توجہ مغربی محاذ پر مبذول کر دی تھی اور اپنی فوجیں بتدریج مشرقی محاذ سے مغربی محاذ پر منتقل کرنا شروع کر دی تھیں۔

چراغِ سحری

مغربی پاکستان کے سیالکوٹ سیکٹر میں ۵ دسمبر سے دشمن ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا مگر ہمارے جوانوں نے اُسے بڑھ کر شکر گڑھ شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے دشمن کا منصوبہ یہ تھا کہ مرالہ، سیالکوٹ، نارووال اور پسرور کو مسخر کرنے کے بعد گوجرانوالہ، وزیر آباد اور گجرات کے شہروں پر قبضہ کیا جائے۔ اِس طرح جی ٹی روڈ پر کنٹرول حاصل کر کے ہماری فوج کی سپلائی لائن کو منقطع کر دیا جائے۔ اِس مقصد کیلئے پچھلے دس دِنوں سے دشمن اپنے پانچ ڈویژنوں کے ساتھ ہمارے دفاع کو درہم برہم کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا لیکن اُسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ دس دن کی مسلسل سر پھٹول کے بعد آخر ۱۵ دسمبر کو دشمن ہماری دائیں طرف ظفروال اور شکر گڑھ کے درمیان ۱۵ ڈویژن کے مائین فیلڈ میں گیپ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ دشمن نے اب عقب سے حملہ کر کے شکر گڑھ پر قبضہ کرنے کی ایک بھرپور کوشش کی لیکن ۱۹ ایف ایف رجمنٹ نے نہ صرف یہ کہ اُن کے حملے کو ناکام بنا دیا بلکہ ہندوستان کی 3/9 گورکھا رائفلز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ دشمن اپنے پیچھے چالیس لاشیں اور ۳۷ جنگی قیدی چھوڑ کر پسپا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ دشمن اب اِس طرف سے ظفروال۔شکر گڑھ روڈ پر قبضہ کرنے کیلئے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ اِس کوشش

کے نتیجے میں اُس کی دو آرمرڈ بریگیڈز اور انفینٹری کی دو پلٹنیں غازی پور اور بڑا پنڈ تک پہنچ کر مورچہ بند ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ یہاں سے دشمن کے متوقع حملے کے سدِ باب کیلئے ۱۶ دسمبر کی صبح ۱۳ لانسرز کو جوابی حملہ کرنے کا حکم ملا۔ دشمن نے ۱۳ لانسرز کے حملے کا زبردست مقابلہ کیا۔ ایک سخت خونریز معرکے کے بعد دشمن سے صرف بڑا پنڈ خالی کرالیا گیا۔ لیکن اس کیلئے ہمیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ لاگوال، جھڑپال اور غازی پور میں دشمن کے ٹینکوں اور انفینٹری کی بھاری نفری ابھی تک مضبوطی سے قائم تھی۔

اُدھر ۱۶ دسمبر کو سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے ۱۷ دسمبر کی رات بارہ بجے سے مغربی پاکستان میں بھی یکطرفہ طور پر جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ فوجی جنتا نے تو پہلے ہی ملک کے اس حصے میں بے دلی سے جنگ کا آغاز کیا تھا۔ بلی بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اُنہوں نے بھی اِسے قبول کر کے تمام فارمیشن کمانڈروں کو حکم دیا کہ جنگ بندی سے قبل دشمن کے زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضہ کیا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ بعد میں سودے بازی کی جاسکے۔ اِس حکم کی تعمیل میں ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بہادری اور قائدانہ شہرت کے مالک جرنیل بھی بوکھلا گئے اور دشمن کو حقیر اور اپنی فوج کو مافوق الخلقت خیال کرتے ہوئے ماتحت یونٹوں کو منصوبہ بندی کا موقع فراہم کئے بغیر ایک ایک کر کے دشمن کے خلاف جھونکتے رہے۔ اِسی سلسلہ میں کمانڈر ۸ ڈویژن نے چند گھنٹوں کے نوٹس پر ۳۵ ایف ایف کے کمانڈنگ آفیسر حاجی محمد اکرم کو ۱۷ دسمبر کی صبح پانچ بجے جھڑپال گاؤں پر حملہ کر کے وہاں سے دشمن کو نکالنے کا حکم دیا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے نہ تو مناسب منصوبہ بندی ہو سکی اور نہ ہی معقول امدادی فائر فراہم کیا گیا۔ چنانچہ جزوی طور پر ہمیں کامیابی تو ہوئی مگر اس کیلئے ہمیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس احمقانہ حکم کی تعمیل میں پاک فوج کے شیر دل آفیسر لیفٹیننٹ کرنل حاجی محمد اکرم اور اُن کی پلٹن کی کثیر تعداد جامِ شہادت نوش کر گئی۔ جنرل فضل مقیم اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"The few counter-attacks, which 8 Division had tried during the war were most noticeable by their lack of planning. The units were hurled into battle without having been given time for planning and preparation. The most worst example of this attack was on 17 December, when against all protestations of its very gallant commanding officer, 35 FF was sent into battle for almost certain massacre." (۱۲۸)

۱۷دسمبر کی شام ہمیں بھی حکم ملا کہ رات بارہ بجے سے پہلے پہلے خاموشی سے دشمن کے جتنے بھی علاقے پر قبضہ ہوسکتا ہے کیا جائے۔ میری نمبر ون پلاٹون کے بائیں طرف دیوی گڑھ پوسٹ کے سامنے دشمن کا کوئی ایک مربع میل کا علاقہ ایک جزیرہ نما کی شکل میں دور تک ہمارے بارڈر کے اندر تک آیا ہوا تھا فوجی زبان میں ایسے علاقے کو Enclave کہتے ہیں۔ میں نے نمبر تھری پلاٹون کو ساتھ لیا اور رات ۸ بجے کے قریب اُس علاقے کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ اُس رات دشمن نے بھی اپنی توپوں کے دہانے کھولے ہوئے تھے اور ہمارے گنز بھی گزشتہ دو ہفتے کی خاموشی کے بعد پچھلی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ بہرحال ساڑھے دس بجے کے قریب ہم نے اِس علاقے پر قبضہ کرلیا۔ ٹھیک بارہ بجے دونوں طرف کی توپوں نے خاموشی اِختیار کرلی۔ دو ہفتے کی دھمادھم، ڈھم ڈھم، تڑتڑ، تڑتڑ، تڑتڑ اور ٹھا ٹھا کے بعد آج پہلی بار یکدم ہر طرف سکوت تھا۔ اتنے دنوں کے شور شرابے کے بعد عجیب سا محسوس ہورہا تھا۔ ماحول یکدم بے حد سنسنی خیز ہوگیا تھا۔ سکوت، بے حسی، جمود، گھپ اندھیرا، اوپر سے بھرپور دسمبر کی یخ بستہ رات!! اتنے دِنوں کی گہما گہمی اور دشمن کے ساتھ دست وگریباں رہنے کی وجہ سے میں تو اپنی والدہ، بیوی اور دو ننھے مُنّے بچوں کو بھی بھول گیا تھا۔ آج پہلی دفعہ میرا دھیان اُن کی طرف گیا۔ شائد جنگ بندی کا اثر تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ میں آنکھیں بند کئے دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنے خیالوں میں کھویا بہت دور پہنچ گیا۔ میری شریکِ حیات دونوں بیٹوں کو لئے میرے سامنے سوالیہ نشان بنی کھڑی تھی۔ وہ خاموش ٹکٹکی لگائے مجھے تک رہی تھی۔ اُس کی خموش نگاہیں کہہ رہی تھیں:

''آپ ٹھیک تو ہیں؟ آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔ لیکن ہم آپ کو نہیں بھولے۔ ہم سب آپ کی سلامتی کیلئے دِن رات اللہ سے دعائیں کرتے تھے۔ عامر آپ کو بہت یاد کرتا تھا۔ شکر ہے آپ آ گئے!''

اچانک ٹھک کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ نظریں اُٹھا کر دیکھا تو حوالدار قربان دونوں ٹخنے جوڑے سب اچھا کی رپورٹ دے رہا تھا:

''نمبر تھری پلاٹون سب اچھا سر......!! آپ کے حکم کے مطابق بتائے ہوئے ایریا میں سب سیکشن پہنچ گئے ہیں! صبح تک مورچے مکمل ہوجائیں گے سر...... !''

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو رات کے دو بج چکے تھے۔ پلاٹون کمانڈر کو ضروری ہدایات دے کر میں اپنی کمان پوسٹ کی طرف چل دیا۔ کمان پوسٹ میں پہنچ کر بہت دیر فرش

ممدی پر لیٹا آنکھیں بند کئے سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا لیکن آج مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ لاشعور سے بار بار ذوالکیف کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے یہ کہتے ہوئے اُبھرآتی:

''آپ تو ہمیں بھول ہی گئے لیکن ہم آپ کو نہیں بھولے!''

اِنہیں خیالوں میں غرق پتہ نہیں کب نیند کی آغوش میں جا ڈوبا۔ نیند ہی نیند میں میں اپنے گاؤں جا پہنچا۔ سب رشتہ دار مجھے ملنے آرہے تھے۔ میری والدہ اللہ کا شکر بجالا رہی تھی۔ بہنوں کے چہرے شگفتہ تھے۔ عامر میرے کندھوں پر سوار تھا۔ ظاہر ابھی چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھے بھول چکا تھا اور سہما سہما دور کھڑا تھا۔ میں پیار سے اُسے گود میں لیتا تو وہ بل کھا کر ریں ریں کرنے لگتا۔ میری بیگم کا تو آج خوشی سے پاؤں زمین پر نہیں لگتا تھا۔ وہ سب آنے جانے والوں کی خاطر تواضع میں مصروفیت کے باوجود موقع پا کر کن اَنکھیوں سے میری طرف دیکھتی اور مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیتی۔ جب ذرا مہمانوں کا رش کم ہوا تو ہمیں بھی آپس میں ایک دوسرے کا حال پوچھنے کیلئے تنہائی نصیب ہوئی۔ اِتنے میں فیلڈ ٹیلیفون کی کھرر رکھرر رر، کھرر رکھرر رے میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ آنکھیں ملتے ہوئے ٹیلیفون اُٹھایا تو دوسری طرف پھر حوالدار میجر قربان تھا:

''سر ابھی ابھی ایجوٹینٹ صاحب کا فون آیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ۹ بجے سی او صاحب کمپنی کے معائنے کیلئے آرہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تم سب پلاٹونوں کو اِطلاع کر دو میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔''

میں نے جھلا کر جوابدیا۔ باہر سورج چمک رہا تھا۔ گھڑی کی طرف دیکھا۔ آٹھ بجنے کو تھے۔ سوا نو بجے کے قریب کرنل نسیم کی جیپ پہنچ گئی۔ اُن کے ساتھ سیکنڈ اِن کمان میجر سعید بھی تھے۔ ہم جب نمبر تین پلاٹون جس نے پچھلی رات دشمن کے علاقے پر قبضہ کیا تھا میں پہنچے تو ہماری پلاٹون کو مورچوں میں دیکھ کر ہمارے سامنے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر دشمن نے بھی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ کرنل نسیم نے مجھ سے پوچھا:

''وحید تیرے سامنے تو دشمن کی پوری کمپنی بیٹھی ہے۔ پچھلی رات اِنہوں نے مزاحمت نہیں کی؟''

''سر جہاں تک میرا علم ہے یہ لوگ۔ جنگ بندی کے بعد اِس علاقے میں مورچے بنانے کیلئے آرہے تھے لیکن ہمارے سپاہیوں کو دیکھ کر وہاں رُک گئے ہیں۔ آپ یہیں ٹھہریں میں اُن کو کہتا ہوں کہ وہ جنگ بندی کا اِحترام کرتے ہوئے پیچھے ہٹ جائیں۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے جیب سے سفید رومال نکالا اور اُس کو ہوا میں لہراتے ہوئے اُن کی طرف دوڑ پڑا۔ پیچھے سے کرنل نسیم اور میجر سعید آوازیں دینے لگے:

''وحید کیا کر رہے ہو؟ !Don't be silly رُک جاؤ! واپس آجاؤ! آگے مت جاؤ! وغیرہ وغیرہ''

میں اُن کی چیخ و پکار سے بے نیاز دشمن کے دفاع میں جا گھسا۔ دشمن کے قریب پہنچ کر میں رُک گیا۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ بھی ہوشیار ہوگئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میرے بالکل سامنے ایک مشین گنر نے لیٹ کر گن مجھ پر فٹ کر رکھی ہے۔ اور اُس کے پیچھے ایک آفیسر سٹین گن کندھے پر لٹکائے میرے قریب آنے کا اِنتظار کر رہا ہے۔ میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی تو دیکھا کہ دشمن کے سارے ہتھیار مجھے نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ مجھے رکا دیکھ کر اُس آفیسر نے جو معلوم ہوتا تھا کہ میرے ہی رینک کا تھا مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا:

"What is the matter?" "What are you doing here?" I asked him.

"We are patroling our area," he answered.

"But you are violating the cease fire. Our troops must not be so close to each other. Their is a chance of provocation," I said.

"If that is the case, then you may leave our area and get back!" he asked me. "But its in our control now." I said emphatically.

"O.K. then stay where ever you are and don`t disturb us," he said.

پیچھے سے کرنل نسیم اور باقی لوگ مجھے اِشارے کر رہے تھے کہ واپس آجاؤ۔ اُن کی بے چینی دیکھ کر میں اُسی طرح بھاگتا ہُوا واپس آ گیا۔ واپسی پر کرنل نسیم اور میجر سعید نے میری خوب خاطر کی۔ ''وحید مجھے آج پتہ چلا ہے کہ تم stupid بھی ہو۔ اگر وہ تمہیں وہاں بٹھا لیتا تو؟'' وہ غصے میں کہہ رہے تھے۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اِسلئے چپ چاپ اُن دونوں کی جھاڑ سنتا رہا۔ یہاں پر ہماری جنگ ختم ہوگئی۔

۱۶ دسمبر کی ذلت آمیز ہتھیار ڈالنے کی تقریب کے بعد مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا۔ ہندوستان یکطرفہ طور پر مغربی پاکستان میں جنگ بندی کا اعلان کر چکا تھا۔ اِسلئے اب مغربی پاکستان میں ہماری طرف سے جنگ جاری رکھنے کا بظاہر کوئی جواز نہ تھا۔ لیکن ہر طرف بے یقینی، مایوسی اور بد دلی کا ماحول پایا جاتا تھا۔ سیکورٹی کونسل کے روبرو ''میں یہاں پر اپنا وقت کیوں ضائع کروں؟ میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا اور جنگ کروں گا؟'' کا نعرہ بلند کرنے کے باوجود مسٹر بھٹو اُس وقت تک نیویارک میں ہی ٹکے رہے جب تک کہ ہماری افواج نے ۱۶ دسمبر

۱۹۷۱ء کو دشمن کے آگے ہتھیار نہ ڈال دیئے اور جب تک اُنہوں نے اس ہتھیار ڈالنے کی ذلت آمیز تقریب کو امریکن ٹی وی پر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیا اور جب تک مغربی محاذ پر بھی جنگ بندی نہ ہوگئی۔

اُدھر یحییٰ خان اور اُس کے ہم پیالہ و ہم نوالہ جرنیلوں کی اقتدار سے چمٹے رہنے کی ہوس نے اُنہیں ابھی تک اندھا کر رکھا تھا۔ اگرچہ اُن کے دن گنے جا چکے تھے اور اُن کی تقدیر کا فیصلہ نوشتۂ دیوار تھا تاہم اُنہوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کی ایک آخری مگر بہت بھونڈی کوشش کی۔ ۱۹ دسمبر کی شام کو یحییٰ خان نے ٹیلیویژن پر قوم سے خطاب کر کے پہلے سے تیار کردہ آئین نشر کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا لیکن جنرل گل حسن اور اُس کے ساتھیوں کی بروقت مداخلت سے ایسا نہ ہو سکا۔ (۱۲۹)

قبل ازیں ۱۸ دسمبر کو یحییٰ خان بھٹو کو نیویارک سے فوراً وطن واپس پہنچنے کیلئے ٹیلیفون کر چکا تھا۔ لیکن وہ محتاط انداز میں حالات کا جائزہ لینے کیلئے ایک رات روم میں رک کر اپنے دستِ راست غلام مصطفیٰ کھر کے پیغام کا اِنتظار کرنے لگے۔ مسٹر بھٹو کی لابی کے دباؤ پر جب حکمران ٹولہ اِقتدار اُن کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گیا تو اُنہیں روم سے پاکستان واپس لانے کیلئے پی آئی اے کا ایک خصوصی طیارہ بھیجا گیا۔ (۱۳۰)

اگلے دِن ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وہ راولپنڈی پہنچے۔ غلام مصطفیٰ کھر اُن کا اِستقبال کرنے کیلئے ائرپورٹ پر موجود تھے جو اُنہیں وہیں سے سیدھا ایوانِ صدر لے گئے۔ جہاں یحییٰ خان نے اُن سے بطور صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر حلف لیا۔ جمہوریت کا علمبردار بھٹو سیاسیات کی تاریخ میں شاید پہلا شخص تھا جس نے عوام کا منتخب نمائندہ ہونے کے باوجود مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بننا پسند کیا اور مزید ڈھائی سال تک ملک پر ڈکٹیٹرشپ مسلط کئے رکھی۔ شکست خوردہ قوم نے اُن سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ اُنہیں وقت کا مسیحا سمجھنے لگی۔ اپنے زورِ خطابت سے وہ لوگوں کو مسحور کر دینے میں ماہر تھے۔ اِنتخابات کے دوران اُنہوں نے اپنے عوام سے بہت بڑے بڑے وعدے وعید کر رکھے تھے۔ اب اُن وعدوں کو پورا کرنے کیلئے اُنہیں وہ تمام اِختیارات حاصل تھے جو قبل ازیں اس ملک کے نہ تو کسی سیاسی اور نہ ہی فوجی ڈکٹیٹر کو حاصل رہے تھے۔ اب وہ ملک کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ عجیب اِتفاق ہے بھٹو نے اپنے سیاسی کریئر کا آغاز بھی فوج کے کندھوں پر سوار ہو کر کیا تھا اور اب بامِ عروج پر بھی وہ

فوج ہی کو زینہ بنا کر پہنچے۔ اور اِنجام......؟؟؟ انجام کی بات ہم بعد میں کریں گے۔ ابھی تو اُنہوں نے بہت سے معر کے سرانجام دینے ہیں۔

عوام کا حافظہ واقعی بہت کمزور ہوتا ہے۔ مسٹر بھٹو سے اتنی ڈھیر ساری اُمیدیں وابستہ کرتے وقت لوگ یہ بات بھول گئے کہ اُن کا ماضی متنازعہ فیہ رہا ہے۔ اُنہوں نے ہمیشہ چڑھتے سورج کی پوجا اور ڈھلتے کو لات ماری۔ مشرقی پاکستان کے سقوط اور ہماری افواج کی ذلت آمیز شکست میں اُن کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ انقلابات ہیں زمانے کے!!

بہر حال ۲۰ دسمبر کی شام کو بھٹو نے اپنے جذبات سے لبریز سحر انگیز خطاب سے ساری قوم کو رُلا دیا۔ ہم فوجی بھی اپنے اپنے مورچوں میں بیٹھے چھوٹے چھوٹے ٹرانسسٹر کانوں سے لگائے اپنے نجات دہندہ کا ولولہ انگیز خطاب سن رہے تھے۔ ایک منجھے ہوئے سیاستدان اور فنِ خطابت کے ماہر کی حیثیت سے وہ ہاری ہوئی دل شکستہ قوم کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:

''ہم اپنے وطن کی مختصر زندگی کا بدترین بحران دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک ہولناک بحران ہے۔ ہم نے ٹکڑوں کو اکٹھا کرنا ہے۔ نہایت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو۔ اور پھر اِن سے ایک نئے پاکستان کی تعمیر کرنی ہے۔ ایک ایسا پاکستان جو ہر قسم کے اِستحصال سے پاک ہو......''

اُن کا لہجہ اعتماد سے پُر اور حوصلہ بلند تھا۔ ہم فوجیوں کو مخاطب کر کے اُنہوں نے کہا:

''میرے عزیز سپاہیو! میرے عزیز افسرو! اور میرے بھائیو! آپ نے جنگ میں بہادری اور ہمت کا مظاہرہ کیا ہے۔ آپ کو نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ ایک سسٹم کا شکار ہوئے ہیں اور ہم اِس سسٹم کو درست کر کے دم لیں گے۔'' (۱۳۱)

اُن کے اِس خطاب سے کیا فوجی کیا غیر فوجی سب کے حوصلے بلند ہو گئے۔ میرے دِل میں اُن کی محبت اور عزت اور بھی بڑھ گئی۔ روئیداد خان لکھتے ہیں:

''اُس شام اُنہوں نے پنجاب ہاؤس میں وفاقی سیکریٹریوں سے جو خطاب کیا اُس کا اثر بھی اچھا رہا۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس نے پاکستان کو قومی تاریخ کی تاریک ترین گھڑی میں ذوالفقار علی بھٹو جیسا اعلیٰ قائد عطا فرمایا۔ اُسی شام ذوالفقار علی بھٹو نے غیر ملکی نامہ نگاروں سے بھی بات چیت کی، وہ نہایت خلوص اور اعتماد سے بولے، میرا حوصلہ کچھ بلند ہُوا اور مجھے ذوالفقار علی بھٹو کی صدارت اور قیادت پر فخر محسوس ہُوا۔'' (۱۳۲)

باب ۱۳

بھٹو کا عروج

بھٹو صاحب کو اقتدار کیا ملا گویا خدائی ہاتھ آ گئی۔ اُنہوں نے صدارت کا حلف اُٹھانے کے بعد اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اوپر اعلان کردہ سسٹم کی درستی کا سلسلہ سب سے پہلے اپنے ہی محسنوں پر وار کر کے شروع کیا۔ اُن کی ہدایت پر حوصلہ ہاری ہوئی ہزیمت زدہ قوم اور فوجیوں کو دلاسہ دینے کے معاً بعد پہلے تو پاکستان ٹیلی ویژن پر اُن کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹر کی حیثیت سے حلف برداری کی تقریب کا منظر دکھایا گیا اور پھر ڈھاکہ میں پاک فوج کی ہتھیار ڈالنے کی تقریب کی فلم چلوا دی گئی۔ بظاہر اُن کا مقصد اُن فوجی آفیسروں کو جنہوں نے روم سے بُلا کر اُنہیں مسندِ اقتدار پر بٹھایا تھا، آئینہ دکھانا تھا لیکن حقیقت میں یہ ساری قوم کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ اس کے خلاف نہ صرف افواج پاکستان نے بلکہ پوری پاکستانی قوم نے سخت احتجاج کیا۔ حکومت کو فوری طور پر اِس فلم کو ٹی وی سے واپس لینا پڑا تاہم نامزد وزیر اطلاعات ونشریات عبدالحفیظ پیرزادہ نے اِس کارروائی کے حق میں جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ قوم کو سچ ضرور بتایا جانا چاہیے۔

سسٹم کی درستی کے نام پر بھٹو نے حکومت کے ہر ادارے میں عملِ صفائی کا آغاز کر دیا۔ اُن کا سب سے پہلا ہدف مسلح افواج تھیں۔ چنانچہ عنان حکومت سنبھالتے ہی اُنہوں نے ڈھیر سارے جرنیلوں، ائرمارشلوں اور ایڈمرلوں کی چھٹی کرا دی۔ ریٹائر کئے جانے والے تمام کے تمام جرنیل مغربی پاکستان میں متعین تھے۔ مشرقی پاکستان سے ایک ہی جرنیل بھگوڑا ہو کر آیا تھا اُسے بھٹو نے جی ایچ کیو میں بٹھا دیا۔ اِتنے ڈھیر سارے جرنیلوں کو ریٹائر کرنے کی سب

سے بڑی وجہ وقت کی نزاکت اور مصلحت بتائی گئی۔ بھٹو اگرچہ زبانی کلامی افواج پاکستان کو خراج تحسین پیش کرتے لیکن درپردہ عوام کو بدظن کر کے انہیں اُن کی نظروں میں گرانے میں کوشاں تھے تاکہ افواج پاکستان بد دل ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اُن کی مرہونِ منت رہیں اور اُن کے اِقتدار کیلئے کسی قسم کے خطرے کا موجب نہ بنیں۔ چنانچہ پی ٹی وی پر ہتھیار ڈالنے کی تقریب کو دکھانے کے پیچھے بھی یہی راز پنہاں تھا۔

صدر اور چیف مارشل لأ ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات سے لیس ہو کر بھٹو نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کیلئے فوری طور پر ٹھوس اقدامات اُٹھائے۔ سب سے پہلے یحییٰ خان کو نظر بند کر کے رائے عامہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی۔ یحییٰ خان نے مطالبہ کیا کہ اُسے عدالت کے ذریعے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جائے لیکن بھٹو جانتے تھے کے عدالت میں یحییٰ خان اُس کے سارے راز فاش کر کے سقوط ڈھاکہ کی ساری ذمہ دار اُس پر ڈال دے گا۔ اِسلئے نہ تو اُس پر مقدمہ چلایا گیا اور نہ ہی اُسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی اجازت دی گئی۔ بعد میں جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو جیل میں ڈال کر اُس کے خلاف کیس بنانے شروع کئے تو یحییٰ خان کو بھی عدالت عالیہ میں اپنی نظر بندی کے خلاف رٹ دائر کرنے کا موقع مل گیا۔ یحییٰ خان کی رٹ کا کیا حشر ہُوا ہمیں اُس سے کوئی سروکار نہیں البتہ جو بیان عدالتِ عالیہ میں رٹ کنندہ نے دیا اُس سے بھٹو کے کردار کا سازشی پن، اُن کی ہوس اقتدار اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ذمہ داری پر مہر تصدیق ثبت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے جالندھر سے چھپنے والے اُردو روزنامہ ہند سماچار نے اپنے ٦ جنوری ٢٠٠٦ء کے ایڈیشن میں **''بھٹو سازشی اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا ذمہ دار''** کے عنوان سے ایک تین کالمی سرخی یکم جنوری ٢٠٠٦ء کے نوائے وقت لاہور کے حوالے سے چھاپی ہے۔ یہ خبر جنرل یحییٰ خان کی طرف سے ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کو لاہور ہائی کورٹ میں اپنی نظر بندی کے خلاف دائر کی جانے والی اپنی ایک رٹ پٹیشن میں دیئے گئے بیان حلفی کے منظر عام پر آنے سے چھپی ہے۔ سابق صدر یحییٰ خان نے اپنے بیان حلفی میں کہا:

''جب فیلڈ مارشل ایوب خان نے اقتدار میرے حوالے کیا تو مسٹر ذوالفقار علی بھٹو میرے پاس آئے اور کہا کہ میں آپ کا سیاسی بازو بننا چاہتا ہوں۔ اِس طرح ہم دونوں مل کر پاکستان پر 25 سال حکومت کر سکتے ہیں۔ مگر میں نے یہ تجویز حقارت کے ساتھ مسترد کر دی۔ انتخابات کے بعد بھٹو نے پیپلز پارٹی کے ارکان اسمبلی کا کراچی میں ایک خفیہ اجلاس بلایا جس میں اُن سے قومی اسمبلی کے اجلاس

میں شرکت نہ کرنے کا حلف لیا گیا۔ جبکہ اُنہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ جو رکن اسمبلی ڈھاکہ جائے گا اُس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ میں نے ایسی باتوں پر جب بھٹو کو وارننگ دی تو اُنہوں نے کہا کہ جنرل صاحب ہم سیاسی لوگ ہیں اور ایسی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ بھٹو کی طرف سے ٹانگیں توڑنے کی دھمکی نے قومی یکجہتی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس سے مشرقی پاکستان میں صورت حال خراب ہوئی، جبکہ یہ لیگل فریم ورک آرڈر کی بھی خلاف ورزی تھی۔ بھٹو کی یہ دھمکی مشرقی پاکستان میں بغاوت کی وجہ بنی۔ یہ دھمکی 6 نکات سے کسی قدر کم خطرناک نہ تھی اور اس کا واضح مطلب ملک کے دو حصوں کی علیحدگی تھا۔ مسٹر بھٹو کی ادھر ہم اُدھر تم کی دھمکی آمیز تقریر کے جواب میں شیخ مجیب الرحمٰن نے ۱۲ مارچ ۱۹۷۱ء کو کراچی میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کے اتحاد اور یکجہتی پر زور دیا۔ رٹ گزار کی یہ رائے ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اُس وقت بھٹو کے برعکس ایک محب وطن رہنما تھے۔ اگر بھٹو اسمبلی کا رکن منتخب نہ ہوتا تو وہ کبھی ایسی غیر حب الوطنی پر مشتمل تقاریر نہ کرتا اور نہ ہی ایسے بیانات دیتا جن کی بنا پر پاکستان ٹوٹ گیا۔ رٹ گزار کو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ بھٹو ایک سازشی تھا۔ اُس نے جنرل گل حسن اور ائر مارشل رحیم کے ساتھ مل کر اقتدار پر قبضے کیلئے حکومت کے خلاف سازش کی تھی۔

''بھٹو ملک اور قوم کے ساتھ کبھی بھی مخلص نہ تھا۔ اُس نے اپنے روّیے کے باعث دشمن کو ہمارے ملک کے مفادات اور امن کو نقصان پہنچانے کے موقعے دیئے۔ اِس کے باعث ہی بھارت نے کھلم کھلا بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کی۔ بھٹو نے بعد میں جنرل گل حسن اور ائر مارشل رحیم کو برطرف کر دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اُس کی سازش کا حصہ تھے اور اُسے نقصان پہنچا سکتے تھے۔''

بھٹو کا قومی اسمبلی کے ممبران سے مشورہ کیے بغیر رازداری اور عجلت میں شیخ مجیب الرحمٰن کو جیل سے نکال کر بنگلہ دیش بھیج دینا ہی سقوط مشرقی پاکستان کے سلسلے میں اُن کے کردار کو مشکوک بنانے کیلئے کافی ہے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ جب تک تو شیخ مجیب یحییٰ خان کے قبضے میں رہے بھٹو بھی اُن کے خون کے پیاسے رہے۔ اِسلئے کہ وہ اُسے اپنے اِقتدار کے راستے میں سب سے بڑا روڑا سمجھتے ہوئے ہر ممکن طریقے سے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے اور فوجی عدالت نے غداری کے الزام میں اُنہیں جو موت کی سزا دے رکھی تھی اُس پر عمل درآمد کیلئے وہ یحییٰ خان پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہے تھے۔ لیکن اب جبکہ اُن کے منصوبے کے مطابق مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اور شیخ مجیب سے اُن کے اِقتدار کو کوئی خطرہ لاحق نہ رہا اور اُس کی قسمت کا فیصلہ خود بھٹو کے اپنے اِختیار میں آ گیا تو اُنہوں نے اُسے غیر مشروط طور پر رہا کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ جنرل یحییٰ تو اُسے تختۂ دار پر کھینچنا چاہتے تھے اور

اِس کام کیلئے وہ اپنے اِحکام پر کسی پچھلی تاریخ میں دستخط کرنے کیلئے بھی تیار تھے۔ لیکن اُنہوں نے اپنی ذاتی ذمہ داری پر اُنہیں موت بچانے کی خاطر میانوالی جیل سے نکال کر چشمہ ریسٹ ہاؤس میں منتقل کر دیا تھا۔ اور پھر قومی اسمبلی کے نمائندگان سے مشورہ کئے بغیر اُنہوں نے جنوری ۱۹۷۲ء کو نہایت عجلت اور راز داری سے پچاس ہزار ڈالر جیب خرچ دے کر شیخ مجیب کو ایک خصوصی طیارے کے ذریعے لندن روانہ کر دیا جہاں سے وہ برطانوی فضائیہ کے حکومت طیارے کے ذریعے براستہ دہلی بنگلہ دیش پہنچ گئے۔ اِس طرح آخر کار بھٹو صاحب اپنے "اُدھر تم اِدھر ہم" والے نعرے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو گئے لیکن اِس کیلئے اُنہیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ تخت تو ملا لیکن کس قیمت پر......؟؟

مرکز کے علاوہ بھٹو کی پیپلز پارٹی کی اکثریت صرف پنجاب اور سندھ میں تھی لیکن اپنے اقتدار کو مزید مستحکم کرنے کیلئے بھٹو نے حزبِ اختلاف کے احتجاج کے باوجود چاروں صوبوں میں اپنی پارٹی اور پسند کے گورنر نامزد کر دیئے۔ چیف مارشل لاء کی حیثیت سے بھٹو کے اختیارات عملاً تو پہلے ہی لامحدود تھے۔ مزید برآں یحیٰی خاں کی طرف سے نافذ کردہ ایمرجنسی اور ڈیفنس آف پاکستان رولز نے تو اُن کو پاکستان کی عوام کی جان اور مال پر خطرناک حد تک اختیارات دے رکھے تھے۔ ملک کی تباہ شدہ معیشت کی بحالی کی خاطر حکومت کا اولین فرض تو یہ تھا کہ جنگ کی تباہ کاریوں کے نتیجہ میں پیدا شدہ نقصانات کی تلافی کر کے ملک میں کاروبارِ زندگی کو جمہوری طریق سے از سر نو بحال کرے لیکن اُن کے پیشِ نظر تو اپنی پارٹی کے منشور میں اعلان کردہ معاشی اور معاشرتی اصلاحات کا ایجنڈا تھا۔ چنانچہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات سے لیس ہو کر اُنہوں نے ملکی نظم وضبط، معیشت اور سوشل سسٹم میں دور رس تبدیلیوں کا آغاز شروع کر دیا۔

استحکام

حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے چند ہی ہفتے بعد اپنے لامحدود اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے اُنہوں نے اِقتصادی اِصلاحات کا حکمنامہ جاری کر کے نجی شعبہ سے سٹیل انڈسٹری، بیسک میٹل انڈسٹری، ہیوی انجینئرنگ انڈسٹری، ہیوی الیکٹرک انڈسٹری، اسمبلی اور مینوفیکچر آف موٹر وہیکل، ٹریکٹر پلانٹ اسمبلی اینڈ مینوفیکچر، ہیوی اور بیسک کیمیکلز، پیٹرو

کیمیکل انڈسٹری، سیمنٹ انڈسٹری اور الیکٹرک، گیس اینڈ آئل ریفائنری کے ۳۲ صنعتی یونٹوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ (۱۳۳)

مارشل لاء ریگولیشن ۱۴ کے تحت سول سرونٹس کے آئینی تحفظ کو بدل کر تقریباً ۱۴۰۰ سرکاری افسران کو بلا تفتیش و تحقیق ملازمت سے نکال دیا گیا۔ اس سارے عمل کا مقصد بیوروکریسی کو زیر کرنا تھا۔ اس عجلت کی کارروائی میں اکثر دیانتدار لوگ بے قصور اور بے بنیاد الزامات کا نشانہ بنے۔ سی ایس پی اور پی سی ایس کے روایتی کیڈروں کو ختم کر دیا گیا۔ اور اُن کی جگہ بیوروکریسی کو بائیس گریڈوں میں تقسیم کر کے ملک کی واحد سول سروس میں بدل دیا گیا۔ اب اِن گریڈوں کے تحت ضلع کا ڈپٹی کمشنر اور ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر ایک ہی سطح پر کھڑے تھے۔ لیکن دونوں کے اختیارات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ پرائیویٹ کالج کا لیکچرر جو کل تک محض ایک اُستاد تھا نیشنلائیزیشن کے بعد گریڈ کے لحاظ سے اسسٹنٹ کمشنر اور مجسٹریٹ کے برابر ہو گیا۔ لیٹرل اینٹری کے ذریعے بہت سے سکول ٹیچروں، پروفیسروں اور قومیائی گئی صنعتوں کے ملازمین کو ٹیلنٹ کے بہانے وہاں سے اُٹھا کر سول سیکرٹیریٹ میں ڈپٹی سیکریٹری کی حیثیت سے کہنہ مشق سرونٹس کے اوپر بٹھا دیا گیا۔ ایک فوجی کرنل کو جب لاڑکانہ کے ایک ٹیچر کے ماتحت چند ہفتے کام کرنا پڑا تو وہ بے چارہ منت سماجت کر کے فوج میں واپس آ گیا۔ اِس بیان کو میں حمید یوسف کے اس جچے تلے تبصرے پر ختم کرتا ہوں:

"By a swift succession of reforms or changes, major sectors were thrown into a melting pot. There was excitement and hope, as well as bitterness and despair. All appeared uncertain for the time being. National life became malleable in the hands of the powerful new political leaders. The ultimate pattern was hidden from view, even perhaps from Bhutto." (۱۳۴)

اُدھر بھٹو عمل صفائی کے ذریعے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے میں مشغول تھے اِدھر ہم بے چارے فوجی جنگ بندی کے بعد بھی ایمرجنسی کے نام پر بارڈروں پر پڑے سڑ رہے تھے۔ جنگ بند ہو چکی تھی۔ فوری طور پر مزید جنگ کا بظاہر کوئی اندیشہ نہ تھا۔ فوجی سپاہیوں کو تو باہم اکٹھے بیٹھ کر ایک دوسرے سے گپ شپ کا موقع مِل جاتا لیکن ہر کمپنی میں ایک آدھ آفیسر سارا دن پڑا سڑتا رہتا۔ صبح ناشتہ کیا، وردی پہن کر دو چار گھنٹے کمپنی کا چکر لگایا، دوپہر کا کھانا لنگر

سے کھایا، آرام کیا، شام کو پھر ایک آدھ گھنٹہ جوانوں کیساتھ گپ شپ لگائی یا پھر بہت تیر مارا تو دو چار صفحے کسی کتاب یا رسالے کے پڑھ لئے، اُکتا گئے تو کچھ دیر ریڈیو سے دل بہلا لیا۔ یہ تھے ہمارے روز و شب!! دراصل آفیسرز کو فوج میں نظم و ضبط قائم رکھنے کی خاطر اپنے ماتحت سپاہیوں سے ایک حد کے اندر رہ کر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ اسلئے زمانۂ جنگ میں اُنہیں اکثر و بیشتر یکسانیت اور تنہائی کا سامنا رہتا ہے۔ جنگ بندی کے بعد یہی حال ہم سب کا تھا۔ دن کے وقت آفیسرز کو مل بیٹھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہم نے بوریت دور کرنے کا یہ حل نکالا کہ ہم سب بیک وقت اپنی اپنی کمپنی میں بیٹھے رات کو پلٹن کی ایکسچینج کے ذریعے اکٹھے نیٹ پر آ جاتے اور دیر تک گپیں مارتے رہتے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر گپ شپ شروع کرنے سے پہلے ہم آپریٹر کو کہہ دیتے کہ ہماری اس پرائیویٹ کانفرنس کے دوران کسی اور کو بیچ میں پلگ نہ کرنا لیکن بعض دفعہ وہ بھی تماشہ دیکھنے کیلئے درمیان میں سی او صاحب کو پلگ کر دیتا جو پہلے تو خاموشی سے ہماری فضول باتیں سنتے رہتے لیکن جب اُن کی برداشت سے باہر ہو جاتیں تو یا تو وہ لائن چھوڑ جاتے یا پھر آپریٹر کو ڈانٹ پلانے لگ جاتے۔ سی او کی آواز سنتے ہی ہم سب لائن چھوڑ کر اپنی اپنی رضائیوں میں گھس جاتے۔ جب ذرا ڈھیل ملی تو ہم نے اور طریقہ نکال لیا۔ ہم سب کمپنی کمانڈر اپنی اپنی جیپ لیکر کسی ایک کمپنی میں جمع ہو جاتے اور رات گئے تک چائے اور تاش کا دور چلتا۔ اِس کے ساتھ ساتھ سارے دن کی زبان بندی کے بعد گپوں، لطیفوں اور اپنے سینئر کمانڈروں کے بارے میں چوندی چوندی خبروں پر مبنی قیاس آرائیوں اور تبصروں سے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے کا موقع بھی ملتا۔ عام طور پر مجمع میری کمپنی میں لگتا۔ اِسلئے کہ میرے دفاعی علاقے میں ایک پرائمری سکول تھا جہاں ہم آرام سے گپ شپ لگاتے اور لنگڑی بھینس کے تازہ اور خالص دودھ کی چائے سے لطف اندوز بھی ہوتے اور جب نیند سے سب کی آنکھیں بند ہونے لگتیں تو تھک ہار کر اپنی اپنی کمپنیوں میں واپس چلے جاتے۔

میدان جنگ میں ہماری سب سے بڑی عیاشی یہی تھی لیکن مشرقی پاکستان کے المیے کی وجہ سے قوم فوج کی اجتماعی کارکردگی سے اِس قدر مایوس ہوئی تھی کہ اب اُسے اپنی فوج میں ہر قسم کی برائیاں نظر آنے لگی تھیں۔ جلتی پر تیل چھڑکنے کی خاطر بھٹو صاحب نے گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے کے مصداق ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اُن جرنیلوں کی پس پردہ

عیاشیوں کو جن کے ساتھ وہ خود بھی برابر کے شریک رہے تھے کچھ اس رنگ میں ملکی اور غیر ملکی پریس میں مشتہر کروایا کہ ہر شخص اب پاکستان کے فوجی افسروں کو شرابی، زانی اور عیاش ہونے کے علاوہ کاہل، کام چور، کم ہمت، کم دل، کم ظرف اور کوتاہ اندیش بھی سمجھنے لگا تھا۔

جنگ بندی کے دو ہفتے کے اندر اندر سرحدی علاقے کے باشندے آہستہ آہستہ اپنے گھروں میں واپس آنا شروع ہو گئے۔ اور چند ہی دِنوں کے اندر اندر اِن سرحدی دیہات میں زندگی پھر سے معمول پر آ گئی۔ کاروانِ حیات پھر سے رواں دواں ہو گیا۔ سڑکوں پر گڈے، ریہڑے، ریہڑیاں، ٹانگے اور موٹریں پھر سے دوڑنے لگیں۔ مسافروں سے لدی وہی پھٹیچر بسیں چیختی چلاتی دیوانوں کی طرح وقت سے آگے نکلنے میں مصروف ہو گئیں۔ زمیندار کھیتوں کھلیانوں میں پھر نظر آنے لگے۔ بازاروں اور دکانوں میں پھر سے رونق آ گئی۔ ننھے منھے بچے بستے اُٹھائے سکولوں کی طرف رواں دواں دکھائی دینے لگے اور زندگی کا کاررواں پھر سے معمول کے مطابق اپنی ڈگر پر چل پڑا۔

۵۶ پنجاب

فروری کے شروع میں میری بدلی ۵۶ پنجاب میں ہو گئی ہے۔ یہ پلٹن اُن دنوں راجستھان کے بارڈر پر عمر کوٹ کے قریب متعین تھی۔ گھر والوں نے پریشانی کا اِظہار کیا تو میں نے اُنہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں عمر کوٹ سندھ میں ہے مشرقی پاکستان میں نہیں جہاں سے واپسی کیلئے سال بھر کے بعد ہوائی جہاز کی ضرورت پڑتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ دلی طور پر ہم بھی خوش تھے کہ اب گھر سے دور مشرقی پاکستان جا کر نوکری نہیں کرنی پڑے گی جہاں کوئی ہماری زبان بھی نہیں سمجھتا۔

۵۶ پنجاب بٹالین کالجوں اور یونیورسٹیوں کے رضا کار طلبا پر مشتمل تھی۔ اِن میں سے چند ایک نے زمانۂ اَمن میں اپنے کالجوں مین تھوڑی بہت پریڈ اور ہتھیاروں کے استعمال کے بارے میں ٹریننگ حاصل کی ہوئی تھی لیکن انہیں فوجی نظم وضبط کی بالکل عادت نہ تھی۔ اُس وقت لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم شاہ پلٹن کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ وہ بعد میں ضیاءؔ دور میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی پا کر کور کمانڈر بنے۔ پلٹن کا سیکنڈ اِن کمانڈ میجر غلام جیلانی نام کا تھا۔ باقی سب کے سب جونیئر آفیسرز تھے۔ یہ طلباءؔ اپنی تعلیم چھوڑ کر ملک کے دفاع کے جذبے

کے تحت عارضی طور پر فوج میں آئے تھے۔ اور جنگ بند ہونے کے بعد اب اُن کے کالج وغیرہ دوبارہ کھل چکے تھے۔ اس لئے وہ جلد از جلد واپس جا کر اپنی پڑھائی شروع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ایمر جینسی کے تحت حکومت اُنہیں ابھی تک فارغ کرنے کو تیار نہ تھی جس کی وجہ سے نظم وضبط کے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔

ہماری یہ نام نہاد فوجی یونٹ عمر کوٹ کے نواح میں آموں کے ایک باغ میں خیمہ زن تھی۔ عمر کوٹ مٹی کے ایک اونچے سے ٹیلے پر آباد ہے۔ نہایت خشک اور ریتلا علاقہ ۔ سبزہ صرف موسمی فصلوں اور ریگستانی جھاڑیوں کی صورت میں کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ قابل ذکر مقام یہاں کا قدیم قلعہ ہے جو اب آثارِ قدیمہ کے زیرِ انتظام ہے۔ روایت ہے کہ مغل شاہنشاہ ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد اِس راستے سے ایران پہنچا۔ اِس قلعے میں قیام کے دوران اُس کے ہاں وہ فرزند پیدا ہوا جس نے شاہنشاہ جلال الدین اکبرِ اعظم کے نام سے نصف صدی سے بھی زیادہ ہندوستان پر حکمرانی کی۔ ہم نے کوئی ایک ماہ تک تھر کے اِن ریگستانوں میں گرد خوری کی۔ میرے پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد ڈویژن کی مشقیں شروع ہو گئیں۔ اِن مشقوں کے دوران اپنے نئے کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد بھٹو کا اُن سے اور ائر مارشل رحیم سے اِختلافِ رائے ہو گیا۔ ۳ مارچ ۱۹۷۲ء کو اِن دونوں کو فوج میں 'بونا پارٹزم' پھیلانے کے جرم میں فارغ کر دیا گیا۔ واضح ہو کہ اِن سے پہلے تین ماہ کے عرصہ کے اندر اندر بھٹو صاحب فوج کے ۴۳ سینئر آفیسروں کو ریٹائر کر چکے تھے۔ گل حسن کی جگہ جنرل ٹکا خان ہمارے نئے چیف بنے۔ اس کے چند ہی دنوں بعد جنگ کے دوران عارضی طور فوج میں شامل شدہ طلباً کو بھی فوج چھوڑ کر اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں جانے کی اجازت مل گئی۔ اِن کے جانے کے بعد ہمارے پاس صرف چند ایک جونیئر آفیسرز، ریزروسروس والے ریٹائرڈ جونیئر کمشنڈ اور آفیسرز اور نان کمشنڈ آفیسرز کا محض ایک ڈھانچہ سا رہ گیا تھا۔ کچھ دِن بعد ہمیں ہربنس پورہ چھاؤنی لاہور میں پلٹن کی تنظیمِ نو کیلئے بھیج دیا گیا۔

ہمارے لاہور پہنچنے کے چند ہی دنوں کے اندر اندر ہماری نفری پوری کرنے کیلئے مختلف یونٹوں سے فوجی ہمارے پاس پہنچنے لگے۔ ہر فرد کی فائل کا ملاحظہ کرکے اُس کی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق اُنہیں مختلف سب یونٹوں میں بھیجنا تھا تاکہ سب کمپنیوں کا معیار ایک ہو۔

پرانی پلٹنیں چن چن کر اپنا کچرا ہمارے پاس بھیج رہی تھیں۔ سب کے سب چھپے رستم تھے۔ جن میں چور، نشئی، بدمزاج، نظم و ضبط کی خلاف ورزیوں میں سزا یافتہ بھی تھے۔ کسی ایک کمپنی میں افراد کی علاقائی گروہ بندی کے امکان سے بچنے کیلئے اُنہیں مختلف کمپنیوں میں احتیاط سے بانٹنا بہت ہی اہم کام تھا۔ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود ۵۶ پنجاب کے نام سے ہمارے ہاتھوں ایک ایسی پلٹن نے جنم لیا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں ہمارا ناک میں دم کر دیا۔

چونکہ پلٹن میں سپاہیوں کی اکثریت ایسے نئے ریکروٹس پر مشتمل تھی جنھیں ایمرجینسی کی بنا پر معمولی ٹریننگ دے کر ہمارے حوالے کر دیا گیا تھا اور قریب قریب سب کے سب ہی ایک دوسرے کیلئے اجنبی تھے اسلئے چاہئے تو یہ تھا کہ ابتدائی ٹریننگ، ایک دوسرے سے شناسائی اور یونٹ ڈسپلن کی خاطر اُنہیں کم از کم دو تین ماہ تک یہیں پر رکھ کر تربیت دی جاتی لیکن ہوا یہ کہ ابھی بمشکل نفری ہی پوری ہوئی تھی کہ اس نیم پختہ پلٹن کو بہاول نگر کے بارڈر کے ساتھ ساتھ بے برگ ریگزار کی دھول پھانکنے کیلئے بکھیر دیا گیا۔ ہمارے پہلے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل محمد اسلم شاہ ایک ذہین اور موقع شناس آفیسر تھے۔ پلٹن کو بہاول نگر بارڈر پر پہنچا کر وہ اپنی حکمت سے تین چار ماہ گزار کر رُخصت ہوگئے۔ اُن کی جگہ لیفٹیننٹ کرنل ظہور راجہ پلٹن کے نئے کمانڈنگ آفیسر بن کر آئے۔ اِتفاق سے میجر جیلانی کا تعلق بھی اُنہی کے گاؤں سے تھا۔ کرنل راجہ کے آنے سے قبل ہی اُنہوں نے پلٹن میں مشہور کر دیا کہ وہ بہت قابل مگر سخت گیر آفیسر ہیں۔ چنانچہ سب کے سب ماتحت آفیسر اُن سے خوفزدہ اور ضرورت سے زیادہ محتاط رہنے لگے۔ کرنل راجہ کا سٹائل ابھی تک انگریزوں کے زمانہ کے آفیسروں والا تھا۔ کرنل اسلم شاہ کے برعکس وہ ڈیوٹی کے بعد بھی یونٹ کے دیگر آفیسروں سے گھلتے ملتے نہ تھے۔

۵۶ پنجاب میں جاوید چودھری نام کا ایک لیفٹیننٹ تھا۔ عمر کوئی چوبیس پچیس سال۔ چھ فٹ کے قریب قد، خوبصورت گول چہرہ، رنگ صاف زردی مائل۔ والدین لندن میں مستقل آباد۔ والد کا تعلق جہلم پاکستان سے تھا۔ والدہ انڈونیشین۔ جاوید لندن میں پیدا ہُوا، وہیں پرورش پائی اور تعلیم حاصل کی۔ اچھے ذہن کا حامل اِعتماد سے پُر نوجوان، پُرخلوص، صاف گو اور بے لوث انسان تھا۔ والدین کی آپس میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ لاہور میں ایک چچا مجسٹریٹ تھا جو پاکستان میں اُس کا سرپرست تھا۔ جس کے پاس وہ اکثر ہفتہ وار چھٹی گزارنے جاتا تھا۔ کرنل اسلم شاہ اُس کے خاندانی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس سے خاص شفقت کا سلوک

کرتے۔ مجھے بھی اُس سے ہمدردی ہو گئی۔ چند ہی دنوں میں ہم ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔ جاوید فوج میں صرف شوق اور حب الوطنی کے جذبے سے شامل ہوا تھا۔ روپے پیسے کی اُسے کمی نہ تھی۔ والد کا لندن میں اچھا خاصا کاروبار تھا۔ لیفٹیننٹی کی تنخواہ سے تو اُس کا ایک ہفتہ مشکل سے گزرتا۔ بس میں لاہور جاتا تو تین سیٹیں ریزرو کرواتا۔ کچھ ہی دنوں بعد چھٹی گیا تو آتے ہوئے لاہور سے نئے ماڈل کی سپورٹس کار لے آیا۔ یہ عیاشی تو اُن دنوں فوج کے سینئر آفیسروں کو بھی میسر نہ تھی۔ کسی کسی کرنل کے پاس اپنی ذاتی کار تھی۔

پلٹن بہاول نگر کے بے آب وگیاہ علاقے میں پڑی تھی۔ دور دور تک سوائے کچی آبادیوں کے کوئی قصبہ یا شہر نہ تھا جہاں تفریح کا کوئی سامان ہو۔ ۱۹۷۲ء کی ساری گرمیاں ہم نے اسی بارڈر پر گزاریں۔ جون جولائی میں دن کے آٹھ نو بجے کے بعد ہی فضا میں تپش پیدا ہو جاتی۔ جوں جوں سورج نصف النہار کی طرف بڑھتا اُس کی تیز شعاعیں بھی آگ برسانے لگتیں اور نسیم سحر بتدریج جھلسا دینے والی لو میں بدلتی جاتی۔ سارا علاقہ صحرائے گوبی کا منظر پیش کرنے لگتا۔ حشرات الارض اپنے اپنے بلوں میں گھس کر آرام سے سو جاتے۔ چوپائے صحرائی جھاڑیوں اور کیکر کے درختوں کے سائے تلے آکر ہانپنے لگتے۔ دور کہیں کہیں کوئی گڈریا اپنا منہ سر لپیٹے چند منٹوں کیلئے اپنے سرکش جانوروں کو گھیرتے ہوئے دکھائی دیتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ ایسے میں ہمارے ٹریننگ پروگرام بھی دن کے بارہ بجے سے شام چار بجے تک شاذ ہی ہوتے۔

زندگی آہستہ آہستہ خاصی بور ہوتی گئی۔ سوائے پی ٹی، پریڈ اور روزمرہ کی ہتھیار صفائی کے کسی تفریحی پروگرام کا بندوبست نہ تھا۔ آفیسر لوگ تو مہینہ میں ہفتہ وار تعطیل پر ایک آدھ دفعہ اپنے گھروں کا چکر لگا آتے لیکن جوانوں کیلئے یہ بھی ممکن نہ تھا۔ بارڈر ڈیوٹی کی وجہ سے ایک تو سنتری ڈیوٹیوں کا مسئلہ دوسرے بہاولنگر بارڈر ویسے بھی اکثریت کے گھروں سے اتنی دور تھا کہ ہفتہ وار تعطیل تو درکنار اُن کیلئے تو ہفتہ دس دن کی چھٹی بھی مہنگی پڑتی تھی۔ چنانچہ کرنل راجہ نے آتے ہی ایک آفس آرڈر کے ذریعے آفیسرز کیلئے بھی ہفتہ وار تعطیل پر گھر جانے اور بارڈر پر اپنی پرائیویٹ گاڑی رکھنے پر پابندی عاید کر دی۔ دیگر آفیسرز نے تو اس پابندی کو زیادہ محسوس نہ کیا مگر جاوید تو ہر ہفتہ وار تعطیل لاہور میں گزارنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اِسلئے اِس پابندی کا سب سے زیادہ اثر اُس پر پڑا۔

کرنل راجہ نے اپنی دھاک مزید بٹھانے کی خاطر فارورڈ کمپنیوں کے اچانک دورے

کرنے شروع کر دئے۔ وہ بلا اِطلاع دئے وقت بے وقت پیدل سیر کرتے کسی بھی کمپنی میں پہنچ جاتے اور بعض اوقات تو اِنسان کو نہایت ہی بے موقع پریشانی میں ڈال دیتے۔ جیسہ کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے سخت گرمی کی وجہ سے ہمارے تمام تر پروگرام ۱۲ بجے کے قریب ختم ہو جاتے۔ ایک بجے کے قریب دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے وقفے میں لوگ آرام کرتے۔ لیکن راجہ صاحب اِس وقفے میں بھی لوگوں پر چھاپے مارتے۔ غالباً جولائی یا اگست کا مہینہ تھا۔ سارے دن کی مغز ماری کے بعد دوپہر کا کھانا کھا کر ایک دن میں نے وردی اُتاری اور گرمی کی شدت کی وجہ سے صرف بنیان اور پاجامے میں ننگی چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے ستانے کی کوشش کرنے لگا۔ نیم غنودگی کی حالت میں اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی میری چارپائی کے پاس آ کر رُکا ہے۔ میں نے سوچا میرا اردلی ہوگا۔ اِسلئے میں آرام سے آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ غنودگی کی حالت میں تھوڑی دیر کے بعد کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی: "So, you have retired!!"

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھولیں تو کرنل راجہ ہاتھ میں فوجی رول پکڑے میرے سرہانے کھڑے تھے۔ اُن کو دیکھ کر میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یوں اُن کا اچانک چھاپہ مارنا مجھے سخت ناگوار گزرا۔ میں نے اُنہیں اِسی حالت میں سلام کیا۔ وہ رول کو دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے بولے:

"I would like to visit your forward platoons. Please go and dress up and show me the positions."

میں نے اپنے بنکر میں جا کر وردی پہنی۔ فیلڈ ٹیلیفون پر سارے پلاٹون کمانڈروں کو سی او کے معائنے کی اِطلاع دی اور اُنہیں لے کر اپنی قریب ترین پلاٹون کی طرف چل پڑا۔ دِن کے تین بجے تھے۔ گرمی اور لُو اپنے جوبن پر تھی۔ کرنل صاحب پہلی پلاٹون کے معائنے کے بعد ہی پسینے سے شرابور ہو گئے۔ اور ٹھنڈا شربت پی کر وہیں سے واپس ہو گئے۔ اصل میں اُنہوں نے دفاع کیا دیکھنا تھا وہ تو ہمیں یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ میں بلا اِطلاع بھی سر پر پہنچ جاتا ہوں اِسلئے ہوشیار رہنا۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے اُن کے ایجوٹنٹ کیپٹن غفور کو فون کر کے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ اگر سی او نے میری کمپنی کا دورہ کرنا تھا تو ہمیں بروقت اِطلاع کیوں نہیں دی؟ اُس نے معذرت کرتے ہوئے عذر پیش کیا کہ وہ اُسے بتائے بغیر رول اُٹھا

کہ جدھر جی چاہتا ہے چل پڑتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے آپس میں ڈیوٹی لگا دی کہ جونہی کرنل راجہ اپنی کمانڈ پوسٹ سے نکل کر کسی کمپنی کا رخ کرے، وہ فوراً ٹیلیفون پر سب کمپنی کمانڈروں کو ہوشیار کردے۔ اس طرح سے وہ جب کسی کمپنی کی حدود میں پہنچتے ساری کمپنی فوراً ہوشیار ہو جاتی۔ کرنل ظہور راجہ کی اس طرح کی حرکتوں سے اُن کے ماتحت اُن سے کنی کترانے لگے اور سوائے اشد ضرورت کے کوئی اُن کے نزدیک جانا پسند نہ کرتا۔ آفیسرز نے آہستہ آہستہ فیلڈ میس کی بجائے کمپنی لنگر میں کھانا کھانا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ ایک طرح سے یونٹ کے باقی افسروں سے کٹ کر رہ گئے۔

کرنل راجہ کے آنے کے کوئی ایک ماہ بعد میری کمپنی میں ایک بے حد دردناک حادثہ پیش آیا۔ میری ایک پلاٹون کے دو سپاہیوں نے اپنے پلاٹون کمانڈر نائب صوبیدار محمد یعقوب کو سوتے میں گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ یہ دونوں ابھی چند ہی ہفتے پہلے پلٹن میں آئے تھے۔ اس دردناک قتل سے ساری پلٹن میں سنسنی پھیل گئی۔ یہ دونوں سپاہی میانوالی کے رہنے والے تھے۔ دونوں کی عمریں کوئی سولہ سترہ سال کے قریب ہوں گی۔ سینٹر میں ٹریننگ کے دوران دونوں کی دوستی ہوگئی۔ ہماری پلٹن میں پہنچنے پر اتفاق سے دونوں میری کمپنی کے حصے آئے اور نائب صوبیدار یعقوب کی پلاٹون میں بھی دونوں ایک ہی سیکشن میں پہنچ گئے۔ کم عمری کی وجہ سے دونوں کی ابھی داڑھی مونچھ بھی پوری طرح سے نہیں آئی تھی۔ ایک کا رنگ قدرے سانولا اور قد درمیانہ مگر دوسرا چھریرے جسم والا خوبصورت نوخیز لڑکا تھا۔ سرخ وسفید رنگ۔ اور اپنے دوست سے نسبتاً پھرتیلا اور چالاک۔

نائب صوبیدار محمد یعقوب سیالکوٹ کے کسی نواحی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ۔ قد چھ فٹ۔ بھرا بھرا مضبوط جسم۔ نہایت ہی ٹھنڈی طبیعت کا مالک۔ ہمیشہ مسکراتے ہوئے دھیمی آواز سے گفتگو کرنے کا عادی۔ میری نظروں میں بے حد شریف اور تابعدار جے سی او تھا۔ تفتیش کے دوران دونوں قاتلوں نے بیان کیا کہ نائب صوبیدار یعقوب حیلے بہانے سے اُنہیں باری باری اپنے پاس بلاکر اُن کے ساتھ غیر اِخلاقی حرکات کرتا تھا۔ شرم کے مارے وہ اُس کی اِن حرکات کی رپورٹ بھی نہیں کرتے تھے۔ جب اُس نے زیادہ تنگ کرنا شروع کیا تو دونوں دوستوں نے مل کر اُسے قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ ایک رات جب یہ دونوں اکٹھے سنتری ڈیوٹی پر تھے تو دونوں نے بیک وقت اپنی اپنی بندوق کی نالی

نائب صوبیدار یعقوب کی چھاتی پر رکھ کر ایک ساتھ گولی چلا دی۔ اِتنے قریب سے فائر نے اُسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ فائر کی آواز سن کر پلاٹون ہوشیار ہوگئی۔ قتل کے بعد بھاگنے کی بجائے دونوں اپنے مورچے میں چلے گئے۔ نائب صوبیدار یعقوب کو زخمی پاکر قاتلوں کی تلاش شروع ہوگئی۔ دونوں نے رضا کارانہ طور پر اِعتراف کر لیا کہ اُنہوں نے باہمی مشورہ سے اس قتل کا اِرتکاب کیا ہے۔

میں جب جائے وقوعہ پر پہنچا تو صوبیدار یعقوب سخت زخمی تھا لیکن ابھی زندہ تھا۔ اُس کے زور زور سے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ بولے اور کچھ بتائے۔ اُس نے میرے سوال کا جواب دینے کی کوشش بھی کی لیکن اُس کے منہ سے سوائے ہوں، ہوں کے اور کوئی آواز نہ آتی تھی۔ بہرحال اُسے ہسپتال پہنچایا گیا لیکن وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔ نائب صوبیدار یعقوب کے قتل سے کئی اور لوگوں کا بھی انکشاف ہوا جو اِس قسم کا شوق رکھتے تھے۔ اِس قتل سے وہ سب سہم گئے تھے۔ بہرحال چند ایک کو گھر بھی بھیجنا پڑا۔ اِن دونوں لڑکوں کا فیلڈ جنرل کورٹ مارشل ہوا۔ دونوں مجھے اپنا وکیل صفائی نامزد کیا۔ اُن کے اِس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا موت تھی مگر کم عمری کی بنا پر خاص رعایت کے تحت اُنہیں پانچ پانچ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔

اس واقعے کے چند دن بعد پلٹن کے ایجوٹنٹ کیپٹن غفور کا پستول چوری ہوگیا۔ اب تو کرنل راجہ کی برداشت جواب دے گئی۔ پلٹن کی بدنامی کے ڈر سے اُس نے پستول چوری ہونے کی رپورٹ اِحکامِ بالا تک پہنچانے کی بجائے حکم دیا کہ پستول ہر صورت میں برآمد ہونا چاہیئے اس کے لئے چاہے مشتبہ لوگوں پر تشدد ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ کرنل صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ قریبی پولیس چوکی کے انچارج کو بُلا کر ھیڈ کوارٹر کمپنی کے افراد سے پستول برآمد کرانے میں مدد چاہی۔ پولیس والوں نے قریبی ڈاک بنگلے کے ایک کمرے میں سب کو لِٹا کر اُن کی لِتر پریڈ شروع کر دی۔ رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں اور ۵ ایف ایف کا میرا ایک دوست میجر محمد ارشد وہاں پہنچے تو ایک عجیب رونگٹے کھڑے کر دینے والا منظر تھا۔ پولیس کے سپاہی کیپٹن غفور کی نگرانی میں ساری مارٹر پلاٹون اور سگنل پلاٹون کے جوانوں اور این سی اوز کی پٹائی کر رہے تھے۔ اور پولیس کے تشدد کا تختۂ مشق بننے والوں کی چیخ و پکار سے ایک بہت ہی دلخراش منظر تھا۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ پولیس نے سب فوجیوں کو پیٹ کے بل لِٹا رکھا تھا اور اُن کی لِتر وڑ کر رہے تھے۔ سچ اگلوانے کے لئے پولیس نے مزید برآں

سب کے منہ پر گھوڑوں کی طرح توبڑے چڑھائے ہوئے تھے جس میں اِنسانی فضلہ بھرا ہُوا تھا۔ پولیس کی مار پیٹ، فوجیوں کی چیخ و پکار اور انسانی فضلے کی بدبو سے نہایت کریہہ اور بھیانک ساسماں تھا۔ میں تو وہاں سے چند ایک منٹوں کے بعد ہی پہلو بچا کر نکل گیا اور کئی دنوں تک اُن معصوم اور بے بس سپاہیوں کی آہ و پکار میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ بہرحال اس سارے ظلم کے باوجود پستول برآمد نہ ہو سکا۔ لیکن اس واقعے کے بعد پوری پلٹن میں بے دِلی اور خوف وہراس پھیل گیا۔

چند ہی دنوں کے اندر اندر اِن مظلوموں کی آہ و پکار کام کر گئی۔ مکافاتِ عمل کا پہیہ اِس تیزی سے چلا کہ اُس نے گندم کے ساتھ ساتھ گھن کو بھی پیس کے رکھ دیا۔ کرنل ظہور راجہ یکے بعد دیگرے اِن دو واقعات سے سٹپٹا کر اپنے حواس قابو میں نہ رکھ سکے۔ وہ معمولی سی بات پر چڑ کر آپے سے باہر ہو جاتے۔ خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ لیفٹیننٹ جاوید چودھری سے کرنل راجہ کا غالباً چھٹی کے سلسلے میں اِختلاف ہو گیا جس پر کرنل راجہ نے جاوید کو حسب عادت ڈانٹ پلا دی۔ جاوید ایک خوددار لڑکا تھا اور اپنی بے عزتی برداشت کرنے کا عادی نہ تھا۔ مزید برآں وہ کرنل راجہ کی طرف سے بارڈر پر کار رکھنے کی پابندی سے بھی اُن سے ناراض تھا۔ چنانچہ اُس نے اُن کے خلاف برگیڈ کمانڈر کے پاس پیشی مانگ لی۔ اُس کی زبانی درخواست کو کرنل صاحب نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جو کچھ کہنا ہے لکھ کر دے۔ چنانچہ اُس نے لکھ کر درخواست دیدی۔ اب کرنل صاحب کے ہوش ٹھکانے آئے۔ اُنہیں علم تھا کہ جاوید اُن کی غیر قانونی کاروائیوں اور پولیس مداخلت کا کچا چٹھا برگیڈ کمانڈر کے سامنے کھول دے گا جس پر اُن کے خلاف بھی کاروائی ہو سکتی تھی۔ اب اُنہوں نے جاوید کے دوستوں اور خیرخواہوں کو بُلا کر اُس کو سمجھانے کیلئے کہا۔ سب نے فرداً فرداً کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔ چنانچہ بادلِ نخواستہ کرنل صاحب کو اُس کی درخواست برگیڈ کمانڈر کے پاس بھجوانی پڑی۔ چند دن کے بعد برگیڈ کمانڈر برگیڈیئر بخاری سے جاوید کا انٹرویو ہُوا۔ اُس نے جو کچھ پلٹن میں ہُوا تھا ہوبہو برگیڈ کمانڈر کے سامنے بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

"میں تو بڑے شوق سے عیش وعشرت کی زندگی چھوڑ کر لندن سے پاک فوج میں اپنے ملک کی خدمت کیلئے شامل ہُوا تھا۔ مجھے نہ علم تھا کہ یہاں پر آفیسر اپنے ماتحتوں سے اِس قسم کا ذلت آمیز سلوک روا رکھتے ہیں۔ مجھے تو اب فوج کی وردی پہنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ میرے خیال میں تو اب تک

ہماری پلٹن میں بغاوت ہو جانی چاہیئے تھی۔ لیکن حالات ایسے ہی رہے تو کوئی بعید نہیں کہ چند دن بعد بغاوت ہو جائے۔''

کرنل ظہور راجہ کے پاس لیفٹیننٹ جاوید کے الزامات کا کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ برگیڈئر بخاری نے اُسی وقت ڈویژنل کمانڈر کو فون پر رپورٹ دیتے ہُوئے فوری طور پر پلٹن کو بارڈر سے واپس بُلا کر ریئر ایریا میں غیر مسلح کرنے کا مشورہ دیا۔ جنرل ممتاز عرف ممی جو ہمارے ڈویکمانڈر تھے نے فوراً جی ایچ کیو سے رابطہ کر کے پلٹن کو جنگ کیلیئے نااہل قرار دلوا کر بارڈر سے واپسی کا حکم جاری کر دیا۔ کرنل ظہور راجہ، میجر جیلانی، کیپٹن غفور اور پلٹن کے صوبیدار میجر کو پلٹن سے فارغ کر کے مزید قانونی کاروائی کیلیئے عارضی طور پر برگیڈ ہیڈ کوارٹر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ اور نئے کمانڈنگ آفیسر کی آمد تک اِس شکستہ دل پلٹن کی کمان مجھ ناچیز کے کندھوں پر ڈال دی گئی۔ پلٹن کو بارڈر سے ہٹا کر بہاولنگر شہر کے نواح میں جنگلات کے ایک ذخیرے میں بھیج دیا گیا۔ عام حالات میں ایک انفینٹری بٹالین میں کرنل کے علاوہ چودہ مزید آفیسر ہوتے ہیں جن میں چھ میجر اور باقی کیپٹن یا لیفٹیننٹ کے عہدے کے ہوتے ہیں۔ ایک تو ہماری پلٹن میں آفیسروں کی تعداد پہلے ہی کم تھی۔ دوسرے ہم سب ناتجربہ کار تھے۔ میری سروس بمشکل سات سال تھی۔ کرنل ظہور راجہ اور میجر جیلانی کی بدلی کے بعد پلٹن میں اُس وقت میرے علاوہ صرف ایک اور میجر تھا جو مجھ سے بھی جونیئر تھا۔ باقی سب کیپٹن یا لیفٹیننٹ تھے۔ چنانچہ نیا سی او آنے تک پلٹن کو دوبارہ جنگ کیلیئے تیار کرنے کی ذمہ داری اچانک اب ہم نوجوان آفیسروں پر آن پڑی تھی۔

پلٹن کے ذخیرہ میں پہنچنے کے اگلے دِن میجر جنرل ممتاز نے ہماری پلٹن کا معائنہ کیا اور ساری پلٹن کو جمع کر کے جو کچھ اُن سے ہو سکا اُنہوں نے ہمیں سنایا۔ اُن کی نظر میں ہم سب چور تھے، قاتل تھے، بزدل تھے، پاک فوج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا تھے۔ وہ ہم پر برس رہے تھے اور اُن کا غصہ بجا بھی تھا۔ ہم سب خاموشی سے کھڑے سر جھکائے مجرموں کی طرح سب کچھ سن رہے تھے۔ اِس کے سوا ہمارے پاس کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ جاتے وقت معمول کے خلاف جنرل صاحب نے میرے سیلوٹ کا جواب دینا بھی گوارا نہ کیا۔ جنرل صاحب چلے گئے۔ پلٹن کا پانچ سو کا مجمع بت بنا ابھی تک خاموشی سے کھڑا تھا۔ اُن کا رہا سہا حوصلہ بھی پست ہو چکا تھا۔ جنرل صاحب ہمیں وارننگ دے گئے تھے کہ وہ ایک ماہ تک اِنتظار کریں گے۔

اِس عرصہ کے دوران اگر اُنہیں پلٹن کے نظم و ضبط کے بارے میں تسلی بخش رپورٹ نہ ملی تو ٹھیک ورنہ وہ اسے (Disband) کر کے یعنی توڑ کر اس کی از سرِ نو تنظیم کی سفارش کریں گے۔ ہمارے لئے یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ میں خود بھی ناتجربہ کار تھا اور میرے ساتھی بھی۔ لیکن مجھے اللہ کے فضل سے چند ایک ایسے جے سی اوز ملے جنہوں نے میری بہت مدد کی۔ چنانچہ خدا پر بھروسہ کر کے ہم سب نے عہد کیا کہ محض چند گندی مچھلیوں اور کالی بھیڑوں کی احمقانہ حرکتوں سے جو رسوائی کے داغ ہمارے ماتھے پر لگے ہیں اُن کو دھو کر ہم ثابت کر دیں گے کہ ہماری پلٹن کسی بھی دوسری پلٹن سے کم نہیں۔

جنرل صاحب کے جانے کے بعد میں نے اپنی پلٹن کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ ہم سب ایک گھر کے باسی ہیں۔ یہ پلٹن ہمارا گھر ہے۔ کیا آفیسر کیا جوان سب اِس میں برابر کے شریک ہیں۔ جنرل صاحب نے اگر غصے میں آ کر آپ لوگوں کو چور یا اُچکے کا نام دیا ہے تو ہم سب کو دیا ہے۔ اگر اُچکے ہیں تو بھی ہم سب ہیں اور اگر سعد ہیں تو بھی ہم سب ہیں۔ آئیں مل کر ثابت کر دیں کہ ایک آدھ گندی مچھلی سے سارا تالاب گندہ نہیں ہو جاتا۔ آئیں مل کر عہد کریں کہ ہم سب مل کر اپنے درمیان سے کالی بھیڑوں کی نشان دہی کر کے خود اُن کی اِصلاح کریں گے۔ ایک ماہ تو کیا ہم آج سے ہی اِس چیلنج کو قبول کرتے ہیں کہ ہم میں اور دیگر پلٹنوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ہم کسی بھی میدان میں اُن کا مقابلہ کرنے کیلئے آج ہی سے تیار ہیں۔ میرے اِن الفاظ سے میری پلٹن کے جوانوں کے اُترے ہوئے چہروں پر پھر سے رونق تو آ گئی مگر ندامت کی وجہ سے اکثر کی پلکیں نم تھیں۔

ہم میں سے ہر ایک نے نئے سی او کے آنے تک بے حد محنت کی۔ نظم و ضبط اور وقت کی پابندی، ٹریننگ میں دلچسپی، ہتھیاروں کی سکھلائی اور کھیلوں کی مشق۔ غرضیکہ زمانہ اَمن میں جو بھی معمولات ہوتے ہیں اُن کی پابندی سے مشق کی۔ چند ہی دِنوں کے اندر وہ پھر سے سر اُٹھا کر چلنے لگے۔ چار ہفتے کے بعد لیفٹیننٹ کرنل شمشیر علی کیانی پلٹن کے کمانڈنگ آفیسر بن کر آ گئے۔ ہم دونوں نے قبل ازیں ۸ ویں ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر میں ایک ساتھ نوکری کی تھی۔ میں نے جب اُنہیں پلٹن کی کمان حوالے کی تو وہ قدرے خوفزدہ تھے لیکن چند ہی دنوں میں پلٹن کی کارکردگی دیکھ کر اُن کا خوف جاتا رہا۔ کرنل کیانی کی دھیمی طبیعت سے آفیسروں میں ایک دفعہ پھر سے بھائی چارے کا سا سماں پیدا ہو گیا۔ آفیسر میس میں پھر سے رونق آ گئی۔

کچھ عرصے بعد ہمیں ۵ پنجاب رجمنٹ کی جگہ منڈی صادق گنج کے علاقے میں بھیج دیا گیا۔ ۵ پنجاب کی اُس وقت لیفٹیننٹ کرنل آصف نواز جنجوعہ کمان کر رہے تھے۔ پلٹن کی بدلی کے سلسلے میں میرا اُن کے ساتھ کوئی ہفتہ بھر کیلئے واسطہ رہا۔ بہت ہی پیارے اور نفیس انسان تھے۔ سرخ وسفید رنگ، دراز قد، چھریرا جسم۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوش اخلاق بھی تھے۔ اِس چھوٹی سی ملاقات کے بعد یوں ملتے جیسے ہم سالہا سال سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ کرنل آصف بعد میں پاک فوج کے چیف آف سٹاف بنے لیکن نواز شریف کی گندی سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے۔

۱۹۷۲ء کا سارا سال پاکستان کی ساری فوج سرحدوں پر پڑی رہی۔ اگرچہ ہمارے نوے ہزار قیدی ہندوستان کے قبضے میں تھے۔ لیکن اُن سے کہیں زیادہ بنگالی فوجی اور سول ملازمین ابھی تک مغربی پاکستان میں موجود تھے جنہیں اُن کی ملازمتوں سے فارغ کر کے چھاؤنیوں میں کیمپوں کی صورت میں رکھا گیا تھا۔ یہ لوگ بڑی بے چینی سے بنگلہ دیش واپس جانے کے منتظر تھے۔ ہم بڑی آسانی سے ان کے بدلے اپنے قیدی رہا کرا سکتے تھے لیکن بھٹو صاحب کو کوئی ایسی جلدی نہ تھی۔ وہ اب ملک کے سیاہ وسفید کے مالک تھے اور چاہتے تھے کہ شکست خوردہ فوجی کچھ دیر اور ہندوستان کی مہمانی کا مزہ چکھ لیں۔

مارشل لاء کا خاتمہ

حزب اختلاف کا تسلسل کے ساتھ یہ مطالبہ تھا کہ ملک سے مارشل لاٗ اُٹھا کر ایمرجنسی کو فوری طور پر ختم کیا جائے۔ ان میں نیپ اور جے یو آئی پیش پیش تھیں۔ اُن کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ چونکہ بلوچستان اور سرحد میں اُن کی اکثریت ہے اِسلئے جمہوری اصولوں کے تحت اِن دونوں صوبوں میں اُن کی پارٹی کی حکومت کے ساتھ ساتھ وہاں پر گورنر بھی اُن کی مرضی کے مقرر کئے جائیں۔ بھٹو زیادہ دیر تک اِن مطالبوں کو التوأ میں ڈالنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ اِنہیں احساس تھا کہ جمہوری آئین کے تحت وہ اِن دونوں صوبوں کی خواہشات کے برخلاف اُن پر مسلط نہیں رہ سکتے۔ دلی طور وہ مارشل لاٗ کو بھی مزید طول دینے کے حق میں نہ تھے اِسلئے کہ اِس طرح اُنہیں فوج پر زیادہ اِنحصار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اپنے پروگرام کی تکمیل کیلئے اُنہیں اپنی اتھارٹی کو آئین کے مطابق دیرپا بنیادوں پر کھڑا کرنے کی ضرورت تھی۔ (۱۳۵)

چنانچہ نیپ اور جے یو آئی کے ساتھ سمجھوتے کے بعد نیشنل اسمبلی آرڈر نمبر ۲ نافذ جاری کر کے اسلام آباد میں ملک کے لئے عبوری آئین کی منظوری دینے کیلئے، ۱۴ اپریل ۱۹۷۲ء نیشنل اسمبلی کا مختصر اجلاس طلب کیا گیا۔ اس اجلاس کا مقصد ملک کیلئے عبوری آئین کی منظوری تھا۔ بھٹو کے وزیر قانون میاں محمود علی قصوری نے پہلے سے تیار شدہ صدارتی طرز حکومت کا عبوری آئین اسمبلی کی منظوری کیلئے پیش کیا۔ حزب اختلاف نے سخت احتجاج کرتے ہوئے پارلیمانی طرز حکومت کے آئین کا مطالبہ کیا۔ بھٹو صاحب نے ترپ کا پتہ پھینکتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر قومی اسمبلی مستقل آئین کی تیاری تک متفقہ طور پر اُن کے پیش کردہ عبوری آئین کی منظوری دیدے تو وہ ایک ہفتے کے اندر اندر مارشل لاء اٹھا دیں گے۔ لہذا مارشل لاء سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر ۱۷ اپریل کو قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر بھٹو کے پیش کردہ صدارتی طرز کے عبوری آئین کی منظوری دیدی۔ اس طرح پہلی دفعہ ملک سے مارشل لاء اٹھانے کی قیمت وصول کرنے کی رسم بھی بھٹو نے ڈالی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۷۲ء سے ملک سے مارشل لاء اٹھا لیا گیا اور یکم مئی سے بلوچستان اور صوبہ سرحد میں نیپ کے نامزد کردہ گورنر مقرر کر دئے گئے۔ جمہوریت کی طرف پہلے قدم کے طور پر ان دونوں صوبوں میں نیپ اور جے یو آئی کی حکومتیں بھی قائم ہو گئیں۔ لیکن ملک میں ایمرجنسی بدستور قائم رہی جسے بھٹو صاحب نے اپنے دور حکومت میں کسی نہ کسی حیلے بہانے سے قائم رکھا۔ عبوری آئین کی منظوری کے روز قومی اسمبلی نے ملک کے لئے مستقل آئین کا ڈھانچہ تیار کرنے کی غرض سے تمام سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیٹی بھی نامزد کی۔

آئین کی تیاری

بھٹو صاحب بظاہر تو ڈکٹیٹرشپ کے سخت مخالف اور جمہوریت کے علمبردار دکھائی دیتے تھے لیکن چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے انہیں لامحدود اختیارات کا ایسا چسکا پڑا کہ اب اُن کا موڈ ڈکٹیٹرشپ کو جمہوریت کا رنگ دینے کا دکھائی دیتا تھا۔ بھٹو صاحب کی ہدایات پر اُن کی کابینہ کے ممبران کیبنٹ میٹنگز کے دوران ایک خاص قسم کی سفید یونیفارم زیب تن کرنے لگے تھے۔ حکومتی میڈیا یک زبان صدارتی نظام کے گن گانے لگا لیکن حزب اختلاف کے سیاستدانوں نے اُن کی پیش نہ جانے دی۔ آخر کار ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو سخت بحث مباحثے

کے بعد پارلیمانی طرز کے آئین پر تمام سیاسی پارٹیوں کا سمجھوتہ ہوگیا۔ آئینی کمیٹی نے اُسی سال دسمبر میں آئین کا ڈھانچہ قومی اسمبلی میں پیش کردیا۔ شیخ مجیب سے نوے دن کے اندر اندر آئین کا مطالبہ کرنے والوں نے خود اُس کا صرف ڈھانچہ آٹھ ماہ کے طویل عرصے میں تیار ہونے دیا۔ اسلئے کہ اُنہیں مستقل آئین کے نفاذ میں کوئی اِتنی جلدی نہ تھی۔ چنانچہ حیلے بہانے سے آئین ساز اسمبلی کے اجلاسات کو التوا میں ڈالا جانے لگا۔ ویسے بھی مستقل آئین کے نفاذ سے قبل بھٹو اپنے منشور کے اُن تمام نکات کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے جن کیلئے اُنہیں بعد میں حزبِ اختلاف کے تعاون کا مرہونِ منت ہونا پڑتا۔ مزید برآں اپنی اکثریت کی بنا پر اب وہ آئین ساز اسمبلی سے پارلیمانی نظام کے لیبل کے ساتھ متفقہ طور پر ایسا آئین پاس کروانا چاہتے تھے جس کے تحت وہ تاحیات بلاشرکتِ غیرے پورے ملک پر حکمرانی کرسکیں۔ بالفاظِ دیگر وہ نام کے تو وزیر اعظم ہوں مگر حقیقت میں امریکہ اور فرانس کے صدور سے بھی زیادہ بااختیار۔ چار ماہ تک پارلیمنٹ، وزیر اعظم اور صدر کے اِختیارات پر بحث ہوتی رہی۔

اِس اثناء میں MLRs جاری کرکے تمام بڑی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا، اپنی پسند کی زرعی اِصلاحات نافذ کیں گئیں اور نااہلی اور کرپشن کے الزام پر ہزاروں سول ملازمین کو اُن کی ملازمتوں سے فارغ کرکے اُن کی جگہ پیپلز پارٹی کے جیالوں کو بھرتی کیا گیا۔ قومی پریس کو قابو میں رکھنے کیلئے وعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایوب خان کے زمانہ کا نیشنل پریس ٹرسٹ جسے وہ دن رات لتاڑتے تھے جوں کا توں قائم رکھا گیا۔ آزادیٔ تقریر کے حق کو سلب کرتے ہوئے دفعہ 144 کے تحت حکومت کے مخالف سیاستدانوں کے جلسوں پر پابندی لگادی گئی۔ اُن کے جلسوں کو درہم برہم کرنے اور اُنہیں ہراساں کرنے کیلئے فیڈرل سیکورٹی فورس بنائی گئی۔

"یہ ایک فسطائی تنظیم تھی جو سلطنتِ روما کے بادشاہوں کے محافظ دستوں کی اُس تنظیم سے ملتی جلتی تھی جسے زائد از ضرورت اِختیارات حاصل ہُوا کرتے تھے۔ فیڈرل سیکورٹی فورس قائم کرنے سے ذوالفقار علی بھٹو کا مقصد فوجی اعانت کے بغیر سیاسی مخالفین کو کچلنا، سول ھنگاموں کو دبانا، اور مزدوروں کے اِحتجاجات کو ختم کرنا تھا۔" (۱۳۶)

بلوچستان میں فوج کشی

صوبائی خودمختاری کے معاملے میں نیپ اور پی پی پی کے مابین سخت اِختلافات پائے

جاتے تھے جس کی بنا پر آئین سازی میں بھی تاخیر ہو رہی تھی۔ اس لئے کہ نیپ اپنی صوبائی حکومتوں کو خود مختاری کے ساتھ چلانے پر مصر تھی۔ یہ بات بھٹو صاحب کی مرکزیت پسند پالیسی کے برعکس تھی۔ چنانچہ مرکزی حکومت کی طرف سے صوبائی حکومتوں کے انتظامی معاملات میں روز افزوں مداخلت کے خلاف احتجاج کے طور پر بلوچستان کے وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل نے بلوچستان کی کلیدی اسامیوں کیلئے نامزد افسروں کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے اُن کی جگہ اپنی مرضی کے افسروں کی تقرری کردی۔ اس پر بھٹو صاحب اور نیپ میں ٹھن گئی۔ چنانچہ اُنہوں نے فروری ۱۹۷۳ء میں علیحدگی پسندانہ رُجحانات کے الزامات کے تحت سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت کو برطرف کردیا۔ مینگل صاحب کی اعانت کے الزام میں نیپ کے گورنر غوث بخش بزنجو کو بھی برطرف کردیا گیا۔ اُس کی جگہ اکبر بگتی کے تحت صوبے میں گورنر راج نافذ کردیا گیا۔

صوبہ سرحد میں مفتی محمود کی سربراہی میں نیپ اور جے یو آئی کی حکومت قائم تھی۔ حکومت کے اِس اِقدام کے خلاف اِحتجاج کے طور وہ بھی مستعفی ہوگئے۔ بھٹو نے نیپ کے نامزد کردہ گورنر سرحد سکندر خان خلیل کو بھی برطرف کردیا اور اُس کی جگہ مسلم لیگ (قیوم) سے سرحد اسمبلی کے سپیکر محمد اسلم خٹک کو گورنر سرحد مقرر کردیا۔ اِس پر بلوچستان کے عوام نے عدم تعاون کا راستہ اِختیار کرتے ہوئے حکومتی کارندوں کے خلاف مزاحمت شروع کردی۔ مری اور مینگل قبائل کے ساتھ حکومت کے نظم و ضبط قائم کرنے والے اداروں کی مسلح جنگ شروع ہوگئی۔ مخالفت برداشت کرنا بھٹو صاحب کی عادت نہ تھی۔ اُنہیں اپنے اِقتدار میں کسی اور کی مداخلت قبول نہ تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے اکبر بگتی کی سفارش پر اِن قبائل کو باغی قرار دے کر اُن پر فوج کشی کردی۔ چنانچہ اپنی صوبائی حکومتوں کی برطرفی کے خلاف نیپ اور جے یو آئی نے اِحتجاجاً قومی اسمبلی کا بائیکاٹ کردیا۔

''ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان میں فوجی کارروائی اِسلئے نہیں کی تھی کہ وہاں واقعی کوئی بغاوت اُٹھ کھڑی ہوئی تھی بلکہ وہ فوج کے ذریعہ بلوچستان کے لوگوں کو پیپلز پارٹی کے اُمیدوار منتخب نہ کرنے اور پیپلز پارٹی کی صوبائی حکومت نہ بنوانے کی سزا دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے بلاوجہ اور بلا جواز بلوچستان کی عوامی نیشنل پارٹی کی حکومت صرف اِسلئے برطرف کردی کہ وہ پی پی پی کی نہ تھی اور وہ کسی صوبے میں غیر پی پی پی حکومت کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔'' (۱۳۷)

قارئین کرام یہ وہی اکبر بگتی تھے جنہوں مشرف دور میں خود پاکستان کے خلاف علیحدگی کا علم بلند کئے رکھا۔ بیرونی امداد اور اسلحہ کی مدد سے ان کی طرف سے آئے دن ملکی ذرائع رسل ورسائل اور وسائل کو نقصان پہنچانے کی خبریں ملتی رہیں۔ آخر کار حکومت کو بگتیوں کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ نواب اکبر بگتی اور اُن کے بہت سے ساتھی فوج کے ہاتھوں مارے گئے۔ اور موجودہ دور کے مرغ بادنما قسم کے موقع پرست سیاستدانوں نے محض جنرل مشرف کی مخالفت میں ''بغض معاویہ'' والا روّیہ اختیار کرتے ہوئے۔ علیحدگی پسند اکبر بگتی کو بھی شہید جمہوریت بنا دیا ہے۔ بہرحال بلوچستان اور سرحد کی حکومتوں کی برطرفی کے خلاف ۲۳ مارچ کو نیپ اور جے یو آئی کی تحریک پر اپوزیشن کی سیاسی پارٹیوں نے لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک اِحتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ حکومت نے ایمرجنسی کے تحت دفعہ ۱۴۴ نافذ کرکے ہر قسم کے جلسے جلوسوں پر پابندی لگا رکھی تھی۔ لیکن اپوزیشن نے اِس کے باوجود جلسہ منعقد کرنے کی کوشش کی۔ فیڈرل سیکورٹی فورس نے مسلح مداخلت کرکے یہ جلسہ درہم برہم کردیا۔ اُن کی فائرنگ کے نتیجے میں بہت سارے لوگ مارے گئے۔

مطلق العنانی کا پروانہ

چار ماہ کی کھینچا تانی کے بعد آخر کار ملک میں آئین اور قانون کی حکمرانی کی خاطر تمام بڑی بڑی سیاسی جماعتوں نے بھٹو صاحب کی پی پی برانڈ کی جمہوریت کے حامل آئین کی منظوری پر انگوٹھا لگا دیا۔ جمہوریت کی بحالی کی خاطر ۱۰ اپریل کو جے یو آئی اور نیپ نے بھی اسمبلی کے بائیکاٹ کا خاتمہ کرتے ہوئے آئین کی تصدیق کردی۔ ۱۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو بھٹو نے بھی بالآخر صدر کی حیثیت سے اپنی پسند کے آئین کی توثیق کردی۔ اِس طرح وہ پاکستان کے منتخب نمائندوں سے ایسا آئین منظور کرانے میں کامیاب ہوگئے جس کے تحت سارے کے سارے اِختیارات وزارتِ عظمیٰ کے ادارے میں مرکوز کردئے گئے تھے۔ صدر پاکستان کا عہدہ نہ صرف یہ کہ کٹ پتلی بن کر رہ گیا تھا بلکہ عملی طور پر بھٹو صاحب نے اِختیارات کے ساتھ ساتھ صدر کے عہدے سے منسوب پروٹوکول کو بھی اپنی ذات میں مرکوز کرلیا تھا۔ آئین کے آرٹیکل ۹۶ کے تحت اگلے دس سال تک وزیر اعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کو عملاً ناممکن بنا دیا گیا تھا۔ بہرحال ۱۴ اگست کو بھٹو صاحب اور چوہدری فضل الٰہی ۱۹۷۳ء کے آئین

کے تحت بالترتیب وزیرِ اعظم اور صدرِ پاکستان کے عہدوں پر فائز ہوگئے۔

۱۹۷۳ء کا آئین ایک قابلِ ذکر کارنامہ تھا اور یہ ایک قومی اتفاق رائے کی علامت بھی تھی۔ تاہم اِس جمہوری آئین کے نفاذ کے چند ہی گھنٹے بعد ایمرجنسی لاء کے تحت بنیادی حقوق کالعدم پاگئے۔ سیاسی پارٹیوں کی تنظیم نو کو نظر انداز کرتے ہوئے پارٹی الیکشن کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ہر مرحلہ پر نامزدگیاں کی جانے لگیں۔ سارے کے سارے اختیارات پارٹی لیڈر کی ذات میں مرکوز ہو کر رہ گئے۔ اور اُس وقت سے آج تک سیاسی پارٹیوں میں یہی رواج چلا آرہا ہے۔ جنرل مشرف نے ناظمین کے ذریعے grass root level پر جمہوریت اور مقامی لیڈر شپ کے ارتقاء کیلئے ایک سسٹم ملک میں رائج کیا ہے لیکن مرکزیت پسند پی پی پی اور مسلم لیگ (نواز) اِسے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کے اختیار میں کی گردان کر اِسے ختم کرنے کے درپئے ہیں۔ دیکھیں اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

فوجوں کی واپسی

شملہ معاہدہ کے تحت دونوں ملکوں کی فوجیں اب بارڈر سے پیچھے ہٹ چکی تھیں۔ ہماری بریگیڈ کی ایک پلٹن بہاولنگر میں بارڈر ڈیوٹی کیلئے چھوڑ کر اپریل ۱۹۷۳ء میں احمد پور شرقیہ کے قریب سابقہ ریاست بہاولپور کی فوجی چھاؤنی ڈیرہ نواب صاحب میں آگئی۔ ہمارے ساتھ دیگر امدادی دستوں کے علاوہ ۲ ایف ایف (گائیڈز بٹالین) بھی تھی۔ اِس پلٹن کی کمان اُس وقت لیفٹیننٹ کرنل عبدالوحید کاکڑ کر رہے تھے۔ وہ بھی بعد میں کرنل آصف نواز جنجوعہ کی طرح پاکستان فوج کے چیف آف سٹاف بنے۔ ڈیرہ نواب میں مجھے بھی فیملی اکاموڈیشن مل گئی۔ چنانچہ جون ۱۹۷۳ء میں تقریباً پونے دوسال کے بعد ہم بھی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگے۔ ہمارا بڑا بیٹا عامر اب چار سال کا ہوگیا تھا۔ اُسے صادق پبلک سکول میں داخل کروادیا گیا۔ ہمیں ابھی ڈیرہ نواب صاحب میں آئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ کرنل کیانی کی بدلی ہو گئی۔ اُن کے بعد جو کمانڈنگ آفیسر آئے اُن کی وضع قطع سے لگتا تھا کہ اُن کی پروموشن کافی دیر سے ہوئی ہے۔ قد بمشکل ساڑھے پانچ فٹ، خاصی سیاہی مائل رنگت، گنگریالے بال جنہیں کنگھی وہ خال خال ہی کرتے تھے۔ دھڑ ٹانگوں کی نسبت قدرے لمبا۔ قد کے لحاظ سے پیٹ تھوڑا بڑا ہونے کی وجہ سے پتلون اکثر وبیشتر پیٹ سے نیچے ڈھلکی ہوئی۔ صرف خاکی وردی

میں ہی فوجی آفیسر ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ اپنے قد کی نسبت سے خاصی لمبی چوڑی پرانی پھٹیچر سی واکس ہال وکٹر کار چلاتے تھے۔ نہایت جذباتی اور زود رنج۔ غصے میں شخصیت اور بھی نکھر کر سامنے آجاتی تھی۔ مارون گولڈ کے سگریٹ اِس رفتار سے پیتے کہ دھواں منہ سے ہر وقت کسی مل کی چمنی کی طرح نکلتا رہتا۔ فیملی اکاموڈیشن ہونے کے باوجود بیوی بچوں کو ہمراہ نہ رکھتے تھے۔ اردلی اور میس ویٹرز کے طور پر کم عمر اور خوش شکل سپاہیوں کو پسند کرتے۔ نام کے کریم مگر کرم اُن کی ذات میں کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جونیئرز کیساتھ نہائیت سختی کا رویہ مگر سینئرز کے سامنے ضرورت سے زیادہ خوش آمدی تھے۔ اِنہی دنوں ہمارے بریگیڈ کمانڈر بھی نئے نئے بدلی ہو کر آئے تھے۔ سنا ہے کہ پنجاب کے کسی سابق گورنر کے داماد تھے۔ ہماری بریگیڈ کی کمان سنبھالنے سے قبل پاکستان ملٹری اکیڈمی کے کمانڈنٹ تھے۔ کچھ عرصہ بھٹو کے پروٹوکول آفیسر بھی رہے۔ مجھے نہایت افسوس کیساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اُن سے زیادہ کم ظرف فوجی افسر میں نے اپنی ساری فوجی زندگی میں نہیں دیکھا۔ نہائیت لالچی اور حریص تھے۔ یہاں تک کہ اپنے حصے کے میس بل کی ادائیگی بھی گوارہ نہ تھی۔ اگر کوئی میس سیکریٹری بھول کے اُن کو میس بل بھیجوا دیتا تو اُس کی شامت آجاتی۔ اُن کی بیگم کی طرف سے سپلائی پوائنٹ کے اِنچارج کو حکم تھا کہ ہفتے میں کم از کم تین دفعہ آدھا آدھا بکرا اُن کے گھر بلا ناغہ بھجوایا جائے۔ ہر ہفتے ماتحت یونٹوں کی فوجی گاڑیاں بمع پٹرول اپنے یاروں دوستوں کو ہرن کا شکار کھیلنے کیلئے پیش کرنا اُن کا مشغلہ تھا۔ سنا ہے کہ بھٹو صاحب کے پی ایم اے کے دورے کے موقع پر بعض مُنہ پھٹ کیڈٹوں کی شکایت پر اِسی قسم کی حرکتوں کی وجہ سے اپنی میعاد مکمل کرنے سے قبل ہی وہاں سے نکال دیئے گئے تھے۔

سیلاب کی تباہ کاریاں

جولائی اگست میں مون سون نے اِب کی دفعہ اِس زور سے یورش کی کہ آمدورفت کے تمام ذرائع مسدود ہو کر رہ گئے۔ خدا کا کرنا یہ ہُوا کہ اِس دفعہ ملک کے اُن خشک علاقوں میں بھی غیر متوقع طور پر زوردار بارشیں ہوئیں جہاں کبھی صدیوں سے ایک آدھ بوند بھی آسمان سے نہ گری تھی۔ بارش نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت نے اپنے مکانوں کی چھتوں پر نہ تو پرنالے لگا کر رکھے تھے اور نہ ہی بارش کے پانی کے نکاس کا کوئی بندوبست تھا۔ نتیجۃً ناگہانی

موسلا دھار بارشوں کے بوجھ تلے مکانوں کی چھتیں بیٹھ گئیں اور مکینوں کا اندوختہ بارش کے پانی کی نظر ہوگیا۔ دریاؤں میں طغیانی آ گئی۔ ستلج، راوی، چناب اور جہلم بپھر کر آپے سے باہر ہوگئے۔ لاہور ڈوبنے لگا تو بند توڑ کر شاہدرہ کے مکینوں کے ساتھ ساتھ سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور شیخوپورہ کے دیہاتیوں کا بھی بلیدان دے دیا گیا۔ دوآبے اور رچنا کے وسیع وعریض علاقے سیلاب کی نظر ہوگئے۔ بلوشہاول کا بند جب ٹوٹا تو چناب کا پانی مضافات کو روندتا ہوا جھنگ شہر میں داخل ہو کر مکانوں کی چھتوں پر سے گزر گیا۔ اس طرح جھنگ شہر کئی دنوں تک زیرِ آب ڈوبا رہا۔ وہاں کے ایک مکین کا بیان ہے کہ سیٹلائٹ ٹاؤن کے علاوہ پورے شہر میں ایک انچ بھی خشک جگہ میسر نہ تھی۔ ہیڈ تریموں پر چناب اور جہلم کا دباؤ کم کرنے کی خاطر اٹھارہ ہزاری کا بند بم سے اُڑا دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں سیلاب کے پانی نے گڑھ مہاراجہ کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے دریائے چناب کے مغربی علاقے میں تقریباً سو کلومیٹر تک کے علاقے میں تباہی مچادی۔ پہاڑوں پر لگاتار بارشوں کی وجہ سے دریاؤں میں پانی بتدریج چڑھتا گیا۔ تریموں تو بچ گیا مگر اب پنجند راوی، چناب اور جہلم سیلاب کی زد میں تھا۔

پاک فوج سیلاب زدہ علاقوں سے اپنے ہم وطنوں کو محفوظ مقامات پر پہنچانے اور حفاظتی بندوں کی دیکھ بھال میں دن رات مصروفِ عمل تھی۔ پنجند کے مشرقی کنارے کے حفاظتی بندوں کی دیکھ بھال کا کام ہماری پلٹن کے ذمہ تھا۔ محکمہ نہر کے افسران کی ہدایات کے مطابق ہمارے جوان دِن رات اِن مٹی کے تودوں کی نگرانی اور مضبوطی میں مصروف تھے۔ ماہرین کی رائے میں پانی کا دباؤ اِس قدر بڑھ چکا تھا کہ بند کسی وقت بھی دم توڑ سکتے تھے۔ اِن حالات میں بندوں پر مزید محنت کرنا بے سود تھا لیکن ہم نے سول اِنتظامیہ کے نمائندہ، ایڈیشنل کمشنر لیاقت پور کو مشورہ دیا کہ اگر ہمیں مناسب تعداد میں بوریاں مہیا کردی جائیں تو ہم مزید چار پانچ دِن تک پانی کو روکنے کی کوشش کریں گے۔ اِس عرصہ میں وہ متاثرہ علاقہ کے لوگوں کا وہاں سے انخلاٗ کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ سات دِن تک ہمارے جوان ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سیلاب سے نبرد آزما رہے۔ آخر چوہے کے ایک بل سے پانی رِسنا شروع ہوا جس پر محکمہ نہر کے ماہرین کی تمام تر تکنیکی امداد کے باوجود قابو نہ پایا جا سکا۔ ساتویں دِن زبردست بارش کے ساتھ تیز ہوا بھی چل پڑی۔ بادو باراں کے اِس طوفان نے ٹھاٹھیں مارتے پانی کے سمندر میں زبردست لہریں پیدا کر دیں۔ ہمارا کمزور بند اِن لہروں کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا سکا۔ پانی

کے ایک ہی جھٹکے سے بند کا کوئی پچاس فٹ کا ٹکڑا تنکے کی طرح بہہ گیا۔ پانی گولی کی طرح بہا اور جو کچھ سامنے آیا اُسے خس و خاشاک کی طرح بہاتا چلا گیا اور اگلے دِن خانپور کے مکانوں کی چھتوں پر سے گزر گیا۔ یہاں پر اب ہمارا کام ختم تھا۔

چنانچہ ہمیں واپسی کا حکم مل گیا۔ کرنل کریم نے پلٹن میرے حوالے کی اور خود جیپ میں بیٹھ کر واپس ڈیرہ نواب پہنچ گیا۔ ہمیں اپنا ساز و سامان اکٹھا کرنے میں کوئی ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جب ہم ترنڈہ محمد پناہ سے باہر نکلے تو سیلاب کا پانی جی ٹی روڈ پار کر چکا تھا اور ہمارے سامنے ایک ٹھاٹھیں مارتا ہُوا دریا تھا۔ سیلاب کا پانی ہر لمحہ تیزی سے چڑھ رہا تھا۔ ہمارے لئے ترنڈہ محمد پناہ میں کیمپ لگانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ہم شہر کے باہر خیمہ زن ہو گئے۔ سیلاب کی وجہ سے سارے ملک کے ٹیلیفون کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ہمارے پاس جو وائرلیس سیٹ تھے وہ بھی کم رینج والے تھے۔ اِسلئے ہماری ہر ممکن کوشش کے باوجود کسی بھی فوجی ہیڈ کوارٹر سے نہ تو ہمارا فون پر کوئی رابطہ ہو رہا تھا اور نہ ہی وائرلیس پر۔ چنانچہ ہم نے مزید کوشش اِس اُمید پر چھوڑ دی کہ ہمارے کمانڈنگ آفیسر خود ہی ہمارے ساتھ رابطہ قائم کریں گے۔

سیلاب کا پانی چونکہ شہر کی طرف بڑھ رہا تھا اِسلئے میں نے مناسب سمجھا کہ بیکار بیٹھنے کی بجائے اِسے شہر میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ شہر کی مشرقی حدود کیساتھ ساتھ شمالاً جنوباً ایک راجباہ گزرتا تھا جو نہریں بند ہونے کے نتیجے میں خشک تھا۔ اِس کی مناسب دیکھ بھال اور کمزور مقامات کی مرمت سے سیلابی پانی کو کافی حد تک روکا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے پنجند کے تجربے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے رضا کارانہ طور پر ترنڈہ محمد پناہ کی حفاظت شروع کر دی۔ ہمیں دیکھ کر مقامی لوگوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے اور وہ ہماری ہر طرح سے مدد کرنے لگے۔ اُس علاقے کے رئیس اور گدی نشین مخدوم زادہ حسن محمود صاحب کو جب اِطلاع ملی کہ پنجند پر خدمات بجا لانے والے مجاہد جی ٹی روڈ کے زیرِ آب آ جانے کی وجہ سے ترنڈہ محمد پناہ میں گھرے ہوئے ہیں تو وہ خود چل کر ہماری خیریت پوچھنے ہمارے پاس تشریف لائے۔ جب اُنہیں معلوم ہُوا کہ ہم بیکار بیٹھنے کی بجائے خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت رضا کارانہ طور پر ترنڈہ محمد پناہ کی حفاظت میں مصروف ہیں تو بے حد خوش ہوئے۔ نہایت ہی مہربان اور خوش اِخلاق اِنسان تھے۔ اپنی فراست سے ہماری ضروریات کا اندازہ لگا کر خود ہی ہمارے راشن پانی کا بندوبست کر دیا۔

اُدھر جب ہم واپس نہ پہنچے اور نہ ہی کسی بھی فوجی ہیڈ کوارٹر کا ہمارے ساتھ رابطہ قائم ہو سکا تو ہماری تلاش شروع ہوگئی۔ چوبیس گھنٹے کے بعد ایک ہیلی کاپٹر ہمارے کیمپ کے اوپر آ کر منڈلانے لگا۔ ہمیں پتہ چل گیا کہ یہ ہماری تلاش میں آیا ہے۔ ہمارے سگنل پر وہ نیچے اُتر آیا۔ پائلٹ نے آتے ہی تشویشناک لہجے میں بتایا کہ ہماری طرف سے کوئی اطلاع نہ پا کر بریگیڈ اور ڈویژنل ہیڈ کوارٹر تک کے سب لوگ پریشان ہیں۔ اُنہیں اندیشہ تھا کہ تم لوگ کہیں سیلاب کی نظر نہ ہوگئے ہوں۔ بہر حال اُس نے وہیں سے اپنے مخصوص وائرلیس سیٹ پر ڈویژنل ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ بھیج دی کہ ہم ترنڈہ محمد پناہ میں ہیں اور خیریت سے ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس راشن کی کمی تھی اِسلئے فوری طور پر دو گھنٹے بعد وہی ہیلی کاپٹر دوبارہ ہمارے لئے راشن لے کر پھر واپس آ گیا۔ اِس اثنائ میں فوج نے موٹر بوٹس کے ذریعے ڈیرہ نواب صاحب اور ترنڈہ محمد پناہ کے درمیان آمد ورفت کا سلسلہ قائم کرلیا تھا۔ کچھ دِن کے بعد فوج کی سگنل کور کے جوانوں نے فوجی ٹیلیفون سے بھی رابطہ قائم کر دیا۔ ہمارے ڈیو کمانڈر میجر جنرل محمد اقبال کو جب یہ علم ہوا کہ ہمارا کمانڈنگ آفیسر پلٹن کو پیچھے چھوڑ کر خود چھاؤنی میں واپس آ گیا تھا تو اُنہوں نے سخت ناراضگی کا اِظہار کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ فوری طور پر ترنڈہ محمد پناہ جا کر پلٹن کی کمان سنبھالیں۔ چنانچہ تین دن کے بعد کرنل کریم انجینئر کور کی ایک موٹر بوٹ میں بیٹھ کر واپس ہمارے پاس ترنڈہ محمد پناہ پہنچ گئے۔

سی او کے آنے کے بعد مجھے کسی کام سے واپس ڈیرہ نواب جانا پڑا۔ جہاں سے ہماری موٹر بوٹ نے سفر شروع کیا وہاں سے حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی تھا۔ ہمارے سامنے ایک بپھرا ہؤا دریا تھا جس کا اگلا کنارہ نادید تھا۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں یہاں پر دریا بہتا تھا جو بعد میں خشک ہوگیا۔ اب اُس دریا کے خشک پاٹ میں ہنستے بستے دیہات اور ہری بھری فصلوں کے لہلہاتے کھیت تھے۔ لاکھوں لوگ اِس مردہ دریا کے پیٹ میں خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ اِس مردہ دریا کے اچانک دوبارہ جی اُٹھنے سے اب یہ خوش و خُرم بستیاں تنکوں کی طرح بہہ گئی تھیں۔ لاکھوں اِنسان اور مویشی سیلاب کی نظر ہو گئے تھے۔ جوں جوں ہم اِس دریا کے بیچوں بیچ پہنچ رہے تھے پانی کی رفتار تیز تر ہوتی جارہی تھی اور ہماری کشتی کی رفتار کم اور چیخ و پکار بڑھ رہی تھی۔ گہری جڑوں اور مضبوط تنوں والے بلند و بالا درخت پانی کی لہروں کا مردانہ وار مقابلہ کررہے تھے لیکن اُن کی صرف چوٹیاں ہی پانی سے باہر نظر آتی تھیں جن پر انواع واقسام کے

حشرات الارض نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس مصیبت کے وقت میں ایک دوسرے کی جان کے پیاسے جانور بھی بھائیوں کی طرح باہم چپکے بیٹھے تھے۔ جونہی ہم اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے عین وسط میں پہنچے تو ہمیں بھینسوں کا ایک ریوڑ تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب پہنچنے پر صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ کئی دنوں سے پانی کی خونخوار لہروں کا مقابلہ کرتے کرتے نڈھال ہو چکی ہیں۔ نیند اور تھکاوٹ کی وجہ سے اُن کی آنکھیں سرخ اور سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی تھوتھنیاں سطحِ آب سے باہر نکالے پھنکاریں مار رہی تھیں۔ ہم چاہتے ہوئے بھی اِن بے زبانوں کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ پتہ نہیں اور کتنے انسان اور جانور اِس سیلاب میں زندگی اور موت کے درمیان لٹک رہے تھے۔ طوفان نوح کے بارے میں سن رکھا تھا اب اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ بہر حال اِس دریا کو عبور کرنے میں ہمیں کوئی آدھا گھنٹہ لگا۔

چند دِن ہم نے اِرد گرد کی سیلاب زدہ بستیوں کے مکینوں کو کشتیوں کے ذریعے ترنڈہ محمد پناہ کے کیمپوں میں پہنچایا۔ اُس کے بعد ہمیں رحیم یار خاں کی حفاظت کیلئے وہاں بھیج دیا گیا۔ دو ہفتے کے بعد جب ہم واپس آئے تو ترنڈہ محمد پناہ والا دریا ویمپائیر کی طرح لاکھوں اِنسانوں اور حیوانوں کا خون چوس کر پھر دوبارہ اپنے تابوت میں جا سویا تھا۔ جی ٹی روڈ اگرچہ میلوں میل تک سیلاب کی نظر ہو چکی تھی لیکن معمول کی ٹریفک دوبارہ پھر جاری ہوگئی تھی۔

جب ذرا ہوش آیا تو سیلاب کی تباہ کاریوں سے سارے ملک کے ذرائع آمد و رفت و مواصلات اور بجلی کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو کر کیمپوں میں پڑے تھے۔ فصلیں تباہ ہو چکی تھیں۔ خوراک اور دیگر ضرویات زندگی کی کمی کے نتیجے میں مہنگائی دِن بدن بڑھ رہی تھی۔ قومیائے جانے کے ڈر سے کارخانہ داروں نے پیداوار میں کمی کر دی تھی۔ ملکی پیداوار نہ ہونے کے برابر تھی۔ اِن حالات میں بھٹو نے اپنے مشیروں کے کہنے پر برآمدات بڑھانے کے شوق میں روپے کی قیمت میں کمی کر دی۔ خورد و نوش اور دیگر روزمرہ کی ضروریات کی اشیا ناپید ہوگئیں۔ مہنگائی آسمان سے باتیں کرنے لگی جس نے غریب تو کیا ہم جیسے سفید پوشوں کی بھی کمر توڑ کے رکھ تھی۔ آج کل پھر پاکستان میں کمر توڑ مہنگائی کے ساتھ ساتھ روپے کی قدر میں بھی کمی آرہی ہے۔ ساٹھ روپے کا ڈالر اسی (۸۰) روپے کا ہوگیا ہے۔ اللہ جانے کہیں جا کر رکے گا بھی یا نہیں؟

ہمارے سوشلسٹ برانڈ کے وزیر اعظم کے پاس مہنگائی کا صرف ایک ہی علاج تھا۔ ہر

چیز کو قومیا لیا جائے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۷۳ء میں دو درجن کے قریب ملی ملوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ علاوہ ازیں سب کی سب فلور ملیں، رائس ملیں اور کاٹن جننگ فیکٹریاں جن کی تعداد تین ہزار کے قریب تھی کو بھی قومیا لیا گیا۔ مزید براں لوہا پگھلانے والی چھوٹی فونڈریاں بھی اُن کے مالکان سے چھین کر سب کو کنگال کر دیا گیا۔ قومیاتے وقت نہایت ہی رازداری سے کام لیا گیا تا کہ کارخانہ دار کسی قسم کی ہیرا پھیری نہ کر سکیں۔ وہ مل مالکان جن بیچاروں نے اپنی مِلوں کی چاردیواریوں کے اندر ہی اپنی رہائش گاہیں بنا رکھی تھیں بے دخل کرتے وقت انہیں اپنے گھروں سے تن کے کپڑوں کے سوا کوئی چیز بھی ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دی گئی۔

پاکستان نے چونکہ ابھی تک بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا تھا اسلئے سابقہ مشرقی پاکستان کے بین الاقوامی قرضہ جات کی ادائیگی کی ذمہ داری بھی پاکستان پر تھی۔ حکومت چاہتی تھی کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے اِن اربوں روپوؤں کے بین الاقوامی قرضوں سے نجات حاصل کی جائے۔ لیکن دائیں بازو کی تمام کی تمام سیاسی پارٹیاں بنگلہ دیش کی حقیقت کو تسلیم کرنے کے سخت خلاف تھیں۔ رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے بھٹو نے میڈیا میں اس بارے میں بحث جاری کرادی۔ جماعت اسلامی نے دیگر دائیں بازو کی پارٹیوں کو ساتھ ملا کر سارے ملک میں اس کے خلاف سخت احتجاجی جلسے جلوس نکالنے شروع کر دئے۔ اور اُس کے کارندوں نے ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر کی دیواریں "نامنظور، نامنظور، بنگلہ دیش نامنظور!" کے نعروں سے سیاہ کر دیں۔

اگر غور سے سوچا جائے تو یہ حماقت کی حد تھی۔ یہ مولوی صاحبان جب مخالفت پر اُتر آتے ہیں تو نہ تو خدا کا خیال رکھتے ہیں اور نہ ہی اُس کی مخلوق کا۔ اگر دو بھائیوں میں سے ایک لڑ جھگڑ کر اپنی حق تلفی ہونے کی بنا پر دوسرے سے علیحدہ ہو جائے تو اُس کی مرضی کے خلاف دوبارہ اُسے کون دوسرے بھائی کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کیلئے مجبور کر سکتا ہے۔ ہمارے اور بنگلہ دیش کے بارے میں تو یہ مثال بھی صادق نہیں آتی تھی۔ اسلئے کہ ہماری اور بنگالیوں کی زبان مختلف، خوراک مختلف، لباس مختلف، معاشرتی طور طریقے مختلف اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دونوں ملکوں کے درمیان ہزار میل کا فاصلہ اور درمیان میں وہ دشمن ملک جس کی مدد سے اُنہوں نے ہم سے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ ہمارے تسلیم نہ کرنے سے بنگلہ دیش کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا۔ جب بلی تھیلے سے باہر آ ہی گئی تو بھٹو نے معاملہ قومی اسمبلی میں پیش کر دیا جس نے اُسے بنگلہ دیش کو مناسب وقت پر تسلیم کرنے کا اِختیار دے دیا۔

جنگی قیدیوں کی واپسی

اِنہیں دنوں شملہ معاہدہ کے تحت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان طے شدہ اصولوں کے تحت اِس بات پر اتفاق ہوگیا کہ ۱۹۵ جنگی جرائم میں ملوث افراد کے سوا باقی ماندہ جنگی قیدی رہا کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اس معاہدہ کے تحت ستمبر ۱۹۷۳ء کے آخر میں تقریباً دوسال کے بعد نوے ہزار قیدیوں میں سے پہلا دستہ پاکستان پہنچ گیا۔ ان قیدیوں کو دوبارہ فوجی یونٹوں میں منظم کرنا ایک بہت بڑا کام تھا۔ چنانچہ اوکاڑہ چھاؤنی میں اِس مقصد کیلئے ایک کیمپ قائم کیا گیا۔ اِس کیمپ کو چلانے کیلئے ہر یونٹ سے نفری لی گئی۔ چنانچہ پنجاب رجمنٹ سے تعلق رکھنے والے قیدیوں کو منظم کرنے کیلئے میری بھی وہاں پر ڈیوٹی لگا دی گئی۔ اگرتلہ سازش کیس میں ملوث قیدیوں کے ساتھ ایک سال تک ڈیوٹی کرنے کے بعد مجھے احساس تھا کہ یہ کام کتنا مشکل اور حساس تھا۔ دوسال کی قید کے دوران عزیز واقارب سے جدائی کے بعد ہر قیدی بہت بری طرح سے بکھر چکا تھا۔ اُن میں چھوٹے بڑے اور جونیئر سینئر کے احترام کی بے حد کمی آ چکی تھی۔ بہت سوں کا ذہنی توازن قائم نہ رہا تھا۔ اُن کو از سرنو فوجی ڈسپلن میں ڈھالنا ایک نئے ریکروٹ کی نسبت زیادہ مشکل کام تھا۔ ہندوستان نے اُن کی اچھی خاصی برین واشنگ کر رکھی تھی۔ وہ اب سختی برداشت کرنے کے عادی نہ رہے تھے۔ اِتنی دیر اپنے عزیز واقارب سے دور رہنے کی وجہ سے اُن کے دِلوں میں دوبارہ بچھڑ جانے کا اِحساس بڑی شدت سے موجود تھا جس کی وجہ سے وہ اب اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اُن کے ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔ اِتنا لمبا عرصہ ایک ساتھ اکٹھے کیمپوں میں رہنے سے باہم لڑائی جھگڑے کے واقعات کے ساتھ ساتھ اُن میں اکثر کے درمیان ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہوگیا جس نے بعد میں فوج میں باقاعدہ ایک علیحدہ گروپ کی شکل اِختیار کرلی۔

کیمپ میں آنے کے بعد ہر آفیسر کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ وہ سابقہ مشرقی پاکستان میں جنگ کے دوران اپنے ماتحتوں، اپنے جونیئر اور سینئر افسران اور اپنی یونٹ کی مجموعی کارکردگی کے بارے میں ایک مفصل تحریری رپورٹ پیش کرے۔ اِن تمام رپورٹوں کا بعد میں جب تجزیہ کیا گیا تو کم وبیش ہر آفیسر نشانِ حیدر کا حقدار معلوم ہوتا تھا۔ اِن رپورٹس کا تجزیہ کرنے والے حیران و پریشان تھے کہ اگر ہر آفیسر اور ہر یونٹ کی کارکردگی اِتنی اعلیٰ تھی تو پھر ہمیں شکست سے کیوں دو چار ہونا پڑا۔ یہ معمہ آج تک حل طلب ہے۔

باب ۱۴

اینٹی احمدیہ موومنٹ ۷۴ء

جس وقت ہم سابقہ جنگی قیدیوں کی بحالی میں مصروفِ عمل تھے بھٹو صاحب یکے بعد دیگرے اپنے سیاسی مخالفین سے نپٹنے کے بعد اب اُن مذہبی تنظیموں اور گروہوں سے نپٹنے کے منصوبے بنا رہے تھے جو آئندہ انتخابات میں اُن کیلئے مسائل پیدا کر سکتے تھے۔ ملک میں بے روزگاری اور کمر توڑ مہنگائی نے اُن کے روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے کا پول کھول کے رکھ دیا تھا۔ اِسلئے اب اُنہیں اِس کا متبادل اِنتخابی نعرہ چاہیئے تھا۔ اِنتخابات میں بھاری مینڈیٹ سے جیتنا اُن کیلئے سب سے اہم بات تھی جس کیلئے وہ ہر چیز قربان کر سکتے تھے۔

چنانچہ اِس دفعہ اُنہوں نے مذہب کا سہارا لینے کا منصوبہ بنایا۔ اِسلام کا علمبردار بن کر ایک تو وہ بین الاقوامی سطح پر اِسلامی دنیا کے لیڈر کی حیثیت سے تیسری دنیا کے دیگر عالمی لیڈروں پر سبقت لینا چاہتے تھے، دوسرے اندرون ملک مذہبی رُجحان رکھنے والے عوام کی ہمدردیاں جیت کر دائیں بازو کی مذہبی جماعتوں کو سیاسی طور پر بے بس کرنا چاہتے تھے۔ اِس مقصد کیلئے سب سے پہلے اُنہوں نے ساری اِسلامی دنیا کے دورے کر کے اُنہیں اُن کے تیل کی دولت کی اہمیت باور کرائی اور اُنہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اس دولت کو ایک اِسلامی بم کی شکل دے کر عالمی سیاست میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھائیں۔

اگلے مرحلے میں اُنہوں نے اِس اسلامی بم کو اپنے زیر اثر لانیکی خاطر اِسلامی دنیا کی لیڈر شپ کے حصول کی جدو جہد شروع کر دی۔ اِس سلسلے میں وہ فروری ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں اسلامی ملکوں کی کانفرنس منعقد کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستان نے اُس وقت تک

بنگلہ دیش کو تسلیم نہیں کیا تھا مگر قومی اسمبلی نے مناسب موقع پر بنگلہ دیش کو منظور کرنے کا وزیرِاعظم بھٹو کو اختیار دے رکھا تھا۔ چنانچہ موقع کی مناسبت سے اُنہوں نے مسلمان ملکوں کو خوش کرنے کیلئے کانفرنس کے انعقاد سے ایک دِن پہلے ڈرامائی طور پر بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کر کے اپنے خاص ایلچی کے ذریعے شیخ مجیب کو بھی کانفرنس میں شمولیت کا دعوت نامہ بھجوا دیا۔ اور پھر لاہور پہنچنے پر اُن کا اِستقبال کرتے وقت کھلے عام اُن کو گلے لگا کر اِسلامی ممالک کے تمام لیڈروں سے داد وصول کی۔ اِس موقع پر شاہ فیصل کو اُمتِ اسلامیہ کا خلیفہ منتخب کرنے کا بھی منصوبہ بنایا گیا جس کی بھنک جماعت اسلامی کو بھی پڑ چکی تھی۔ جماعت اسلامی کو یہ بات ہرگز منظور نہ تھی کہ بھٹو اسلامی دنیا کے لیڈر ہوں۔ لہٰذا اُنہوں نے اپنے ذرائع سے شاہ فیصل کو اِس بات پر قائل کر لیا کہ اِسلامی خلافت کے قیام کیلئے سب سے پہلے احمدیہ فرقہ کو دائرۂ اِسلام سے خارج کر کے اُس کے نظامِ خلافت کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ عدی امین نے جب شاہ فیصل کو خلیفہ منتخب کرنے کی تجویز پیش کی تو اِسی بنا پر یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں سوائے اِس احمدیہ فرقہ کے جماعت اسلامی سمیت مسلمانوں کے دیگر تمام کے تمام فرقے قائدِاعظم اور مسلم لیگ کے سخت مخالف اور کانگریس کے ساتھ تھے۔ اُن کے نزدیک پاکستان پاکی اَستان اور قائدِاعظم کافرِ اعظم تھے۔ ۱۹۵۳ء کی اینٹی احمدیہ تحریک میں اِن لوگوں کے اِنہیں مطالبات کو بعض مسلم لیگی لیڈروں کی عملی حمایت کے باوجود اگرچہ اُس وقت کی حکومت نے بعض مصلحتوں کے تحت تسلیم نہ کرتے ہوئے اِس تحریک کو سختی سے دبا دیا تھا۔ لیکن اِس کے بعد مسلم لیگ نے بھی بتدریج مولویوں کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے احمدیوں کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ یہاں تک کہ احمدیوں کیلئے مسلم لیگ کی ممبرشپ کے دروازے تک بند کر دئے گئے تھے۔ ایوب خان کے دس سالہ دورِ حکومت میں سوائے معدودے چند احمدی فوجی جرنیلوں اور سینئر سول سروس آفیسروں کے عوامی نمائندوں میں کہیں بھی کوئی احمدی دکھائی نہیں دیا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں بھٹو کی پاکستان پیپلز پارٹی کی بھی تقریباً وہی حالت تھی جو ۱۹۴۶ء میں کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ کی۔ لہٰذا احمدیوں کی تنظیم اور اتحاد سے بہرہ ور ہونے کیلئے بھٹو نے نہ صرف یہ کہ احمدیوں پر اپنی جماعت کی ممبرشپ کے دروازے وا کر دئے بلکہ اپنی پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لینے کی بھی اجازت دی جو اسمبلیوں کے ممبر بھی بنے۔

اسلئے جماعت اسلامی کی نظر میں جماعت احمدیہ کو دائرۂ اسلام سے خارج کر کے غیر مسلم اقلیت قرار دینا بھٹو کیلئے ایک کڑوی گولی نگلنے کے مترادف تھا۔ بقول سردار شوکت حیات خان اُن کی واحد وفاداری اپنی ذات سے تھی۔ اور واحد مقصد عروج کا حصول تھا۔ وہ سوائے اپنی ذات کے کسی کا وفادار نہ تھا۔ اُس نے اقتدار میں رہنے کیلئے سب سے پہلے ایوب خان سے مل کر اپنے محسن سکندر مرزا سے بے وفائی کی، پھر ایوب خان جسے وہ اپنا ڈیڈی کہتے تھے کی بے وفتی میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دئے، اُس نے فوج میں دو بڑے حمایتیوں جنرل گل حسن اور ائر مارشل رحیم جنھوں نے اُسے بامِ اقتدار تک پہنچانے میں بڑا کردار ادا کیا تھا کی چھٹی کرادی۔" افسوس کہ یہ باتیں سردار صاحب نے اُس وقت لکھیں جب بھٹو نے اُن کی بھی چھٹی کرادی تھی۔ سردار صاحب کو پتہ ہونا چاہیئے تھا کہ اُن سے قبل بھٹو پی پی کے بانی ممبران میں سے جے اے رحیم، معراج محمد خاں، ڈاکٹر مبشر حسن اور محمود علی قصوری کی بھی چھٹی کرا چکے تھے۔ روئیداد خان کے مطابق:

"وہ بڑی آسانی سے اپنے کسی دوست یا ساتھی کو دھوکہ دے دیتے اور پھر کہتے کہ وہ دوست اُنہیں دھوکہ دینے والا تھا۔ حالانکہ فریب و دغا اور غداری کی نیت اُن کی اپنی ہوتی۔...... اُن کے ذہن میں یہ وہم گھر کر گیا تھا کہ دنیا کا ہر شخص اُنہیں ایذا پہنچانے پر کمر بستہ ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے قریبی دوستوں اور رفقائے کار کو بھی شک و شبہ سے نہ بخشتے۔" (۱۳۸)

لہٰذا مسلم لیگ کی قیادت کی طرح بھٹو صاحب نے بھی ہوا کا رُخ دیکھ کر جماعت احمدیہ سے آنکھیں پھیر لیں اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہوئے اپنے ایک نشری خطاب میں بڑی ڈھٹائی سے احمدیوں کی حمایت کو درخورِ اعتنا نہ جانتے ہوئے اعلان کیا:

"گزشتہ عام انتخابات میں قادیانیوں نے پیپلز پارٹی کو ووٹ دئے تھے لیکن اُنہوں نے ہمیں خرید نہیں لیا۔ ووٹ تو ہمیں شیعوں اور دوسرے فرقوں نے بھی دئے تھے۔ لیکن ہم اُن کے محتاج نہیں۔" (۱۳۹)

اس ایک اقلیتی فرقے کو اِسلام سے خارج کر کے بھٹو صاحب کو بہت سے سیاسی فوائد نظر آتے تھے۔ مثلاً عالمی رابطۂ اسلام کمیٹی اور شاہ فیصل کی خوشنودی۔ آئندہ انتخابات میں چونکہ وہ مذہب کو اپنے اِنتخابات کی بنیاد بنانا چاہتے تھے اِسلئے وہ مولویوں سے وہ واحد ہتھیار بھی ہتھیا لینا چاہتے تھے جس کی بنیاد پر مولوی سادہ لوح عوام کے جذبات کو بھڑکا کر بعض حلقوں سے چند سیٹیں جیتنے میں کامیاب ہو جاتے اور پھر آئے دِن نفاذِ اِسلام کا نعرہ لگاتے

رہتے تھے۔ اس طرح وہ عوام کے بھاری مینڈیٹ کے زور پر آئین میں من مانی ترمیمات کر کے پاکستان پر اپنے خاندان کی دائمی حکمرانی قائم کرنے کے دیرینہ خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے۔''اقتدار میں رہنا اُن کے نزدیک سب سے اہم چیز اور رقصِ اقتدار کی لذت مے نوشی سے بھی زیادہ لذیذ تھی جس کیلئے وہ ہر چیز قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔''

آئندہ انتخابات کی حکمت عملی کے تحت انہوں نے اپنے رفقائے کار کے مشورہ سے ایک جامع منصوبہ تیار کیا۔ اِس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا طریق یہ نکالا گیا کہ ملک میں ایسے حالات پیدا کردئے جائیں جن سے مذہبی جماعتوں کو احمدیہ فرقہ کے خلاف عوام کو بھڑکا کر جلسے جلوس نکالنے کا بہانہ مل جائے۔ اور پھر حکومتی عناصر کے ایماء پر یہ مطالبہ زور پکڑ جائے کہ اِنہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اِس مقصد کیلئے پیپلز پارٹی کے ایسے سیاست دانوں کی خدمات حاصل کی گئیں جو احمدیہ فرقے کی دشمنی میں جانے پہچانے تھے۔ اِن میں سرِفہرست غلام مصطفےٰ کھر تھے جنہیں بھٹو نے اینٹی احمدیہ تحریک سے کچھ ہی عرصہ قبل پنجاب کی وزارتِ علیہ سے علیحدہ کر کے یہ عہدہ حنیف رامے کو دیدیا تھا۔ کھر کو یہ تاثر دیا گیا تھا کہ وزارت علیہ سے اُن کی علیحدگی احمدیہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے ممبران اسمبلی کی سازش سے عمل میں آئی ہے۔

اِس پر کھر صاحب نے اپنی سابقہ کابینہ کے چیدہ چیدہ ساتھیوں کے ساتھ مل کر اِس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ سب سے پہلے مسجدوں میں احمدیہ فرقہ کے خلاف شرانگیز تقاریر کا سلسلہ جاری کروایا گیا۔ جب عوام کے ذہنوں میں احمدیہ فرقہ کا مسئلہ اُبھر آیا تو طلباءٔ تنظیموں کو تعلیمی اداروں میں اِس فرقہ کے خلاف تشدد آمیز مظاہروں پر مامور کیا گیا۔ پنجاب کے گورنر صادق حسین قریشی کے آبائی شہر ملتان کے نشتر میڈیکل کالج سے اِس مہم کا آغاز کیا گیا۔ کالج انتظامیہ سے مطالبہ کیا گیا کہ قادیانی فرقہ کے طلبہ کو فی الفور کالج سے خارج کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی تعلیمی اداروں میں اِس فرقہ کے طلباءٔ کو ہراساں کرنے کیلئے مارا پیٹا جانے لگا۔ اِن شرپسند عناصر نے اب سارے ملک میں احمدیہ فرقہ کے خلاف فضا کو مکدر کرنے کیلئے ملک بھر میں دورہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

چنانچہ نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ کے ایک گروپ نے ملتان سے پشاور تک براستہ ربوہ جو کہ جماعت احمدیہ کا مرکز ہے سفر کرنے کا پروگرام بنایا تا کہ ہر سٹیشن پر نعرہ بازی کر کے عوام کو اِس فرقہ کے خلاف بھڑکایا جائے۔ ربوہ پہنچ کر بالخصوص ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن

مشتعل ہوکر مزاحمت پر اُتر آئیں۔ اس طرح اُن کے خلاف باقاعدہ مہم چلانے کا بہانہ مل جائے۔ طلبہ کے اس گروہ نے ۲۲ مئی ۱۹۷۴ء کو اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ہر سٹیشن پر یہ گروپ احمدیوں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگاتا آیا۔ ربوہ پہنچ کر اُنہوں نے ریلوے سٹیشن پر اُتر کر بے حد طوفان بدتمیزی برپا کیا۔ احمدیہ فرقہ کے خلاف نعرہ بازی کے ساتھ ساتھ بعض مستورات سے بھی چھیڑ خانی کی گئی اور جاتے وقت پھر للکار گئے کہ ہم ۲۸ مئی کو دوبارہ آئیں گے اور تمہاری حوریں اُٹھا کر لے جائیں گے۔

اس واقعہ سے سارے احمدیہ فرقہ میں عموماً اور اہلِ ربوہ میں خصوصاً بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن اُن کے خلیفہ کی دوربین نگاہ اس کے پس پردہ اُن کے مخالفین کے مذموم عزائم پر تھی۔ جس کی خبر اُنہیں قبل ازیں مل چکی تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے فرقہ کے تمام افراد اور خاص طور پر اہلِ ربوہ کو صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پُرسکون رہنے کی تلقین کی۔ اُنہوں نے احتیاط کے طور پر حفاظتی اقدامات اختیار کرنے کی بھی ہدایات دیں۔ تاہم بعض ناعاقبت اندیش نوجوان اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ اعلان کردہ پروگرام کے مطابق واپسی پر جب ان شرپسند طلباء نے دوبارہ اُودھم مچانے کی کوشش کی تو اِس دفعہ وہ بھی تیار بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے بھی آگے سے مزاحمت کی۔ تصادم سنگین صورت اِختیار کر گیا جس کے نتیجے میں نشتر میڈیکل کالج کے چند ایک طلبہ زخمی ہوگئے۔ بلی بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ بھٹو صاحب کا منصوبہ کامیاب ہوگیا۔ اِس واقعے کو اِس قدر اُچھالا گیا کہ سارے ملک میں کہرام مچ گیا۔ پریس نے احمدیہ فرقہ کے خلاف جانبداری سے کام لیتے ہوئے اِس قصے کو خوب نمک مرچ لگا کر مشتہر کیا۔ مفاد پرست مذہبی جماعتیں تو پہلے ہی موقع کی تلاش میں تھیں۔ اُنہوں نے حکومت کی سرپرستی میں احمدیہ فرقہ کے خلاف سارے ملک میں باقاعدہ تحریک شروع کرادی کہ قادیانیوں کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے۔ ہر طرف پُرتشدد مظاہرے ہونے لگے۔ احمدیہ فرقہ کے افراد کے گھروں اور دکانوں کو علی الاعلان پولیس کی موجودگی میں نظرِ آتش کیا جانے لگا۔

بعض سیاسی رہنما اِس مذہبی مسئلے کی آڑ میں اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو کھڑا کرنے کیلئے عوام کے ساتھ خود بھی میدانِ عمل میں کود پڑے۔ چنانچہ گوجرانوالہ میں احمدیوں کے خلاف مظاہروں کی رہنمائی کھر کی معزول شدہ کابینہ کے ایک سابق وزیر چوہدری اِرشاد نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اِس اکیلے بدنصیب شہر میں متعدد احمدیوں کے گھروں کو نظرِ آتش کرنے کے علاوہ

ایک درجن بے گناہ احمدیوں کو نہایت بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ ایک مظلوم خاندان کے تین مردوں، باپ، بیٹا اور داماد کو ہلاک کرنے کے بعد اُن کے مکان کو جلا کر راکھ کر دیا گیا۔ عینی شاہد کا بیان ہے کہ اس خاندان کے دو مردوں چوہدری منظور احمد اور سعید احمد خان کو بپھرا ہوا ہجوم جب بے دردی سے قتل کر رہا تھا تو چوہدری منظور احمد کے نوجوان بیٹے محمود احمد نے اپنے باپ اور بہنوئی کو بچانے کی خاطر ہوائی فائر کر کے ہجوم کو منتشر کرنے کی کوشش کی مگر خونخوار ہجوم نے اُسے نیچے گرا کر اینٹوں پتھروں اور ڈنڈوں سے اِسقدر مارا کہ اُس کی لاش کی شناخت بھی مشکل ہوگئی۔ اناللہِ وانا الیہِ راجعون

سرگودھا میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے کے جلسہ کو مخالف گروپ نے ناکام بنانے کیلئے مختار اعوان اور اِفتخار تاری کی سرکردگی میں احمدیہ فرقہ کے افراد کے گھروں کو نذر آتش کیا۔ اِس موقع پر ایک احمدی ڈاکٹر جو برسہا برس سے وہاں پر خدمت خلق کر رہا تھا اُس کے شفا خانہ کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔ ہر جگہ پولیس کی موجودگی میں اِس مظلوم فرقہ کے افراد کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ اِن کی مسجدوں کو اندیشہ نقص امن کے بہانے انتظامیہ نے سربمہر کر دیا۔ بے گناہ احمدیوں کو جھوٹے الزامات لگا کر جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ سوشل بائیکاٹ کی اپیل پر کچھ تو احمدیوں کے خلاف مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کی آئے دن کی مبالغہ آمیز بیان بازی سے متاثر ہو کر اور کچھ شرپسند عناصر کے خوف سے غیر جانبدار شرفأ نے بھی مظلوم احمدیوں کے ساتھ ہمدردی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ دکانداروں نے احمدیوں کو سودا سلف دینا بند کر دیا۔ بعض جگہوں پر تو پینے کیلئے پانی اور معصوم بچوں کیلئے دودھ کی سپلائی تک بند کر دی گئی۔ سرکاری محکموں، حتیٰ کہ فوج کے بعض طبقوں میں بھی احمدیوں کے خلاف نفرت کی فضا پیدا ہو گئی۔ چنانچہ شورش کاشمیری اپنی تحریک کی کامیابی پر بڑے فخریہ انداز سے لکھتا ہے:

”ربوہ کی ناکہ بندی ہو چکی ہے، مسلمان کسی قادیانی کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہیں کرتے اور نہ ہی اُن سے کوئی چیز لیتے ہیں۔ تحفظ ختم نبوت کی مجلس عمل نے اُن کے خلاف تحریک میں اِس قدر توانائی پیدا کر دی ہے کہ کوئی سرکاری یا غیر سرکاری شخص مرزائیت کی بلاواسطہ تو ایک طرف بالواسطہ حمایت کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔ کراچی سے پشاور تک جلسہ ہائے عام منعقد کئے جا رہے ہیں۔“ (۱۴۰)

اِس قومی المیے سے ٹھیک بائیس سال بعد قادیانیوں کے بارے میں ایک حقائق نگار اِس واقعہ کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''نشتر میڈیکل کالج کے طلبہ نے راولپنڈی جاتے ہوئے ربوہ ریلوے سٹیشن پر قادیانیوں کے خلاف نعرے لگائے جو قادیانیوں کو گراں گزرے۔ نتیجہ ۲۸ مئی کو ان طلبہ کی واپسی پر قادیانی نوجوانوں نے ٹرین میں سوار طلبہ کو زدوکوب کیا جس سے ۳۰ کے قریب طلبہ زخمی ہوگئے۔ اِس واقعہ کو مفاد پرست عنصر نے اپنے حق میں اِستعمال کیا حالانکہ مناسب طریقہ اِختیار کیا جاتا تو مسئلہ یہیں پر ختم ہو جاتا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس واقعے کے بعد ملک بھر میں اِحتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بڑھتے بڑھتے ان مظاہروں نے باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ قادیانیوں کے خلاف نفرت عروج پر پہنچ گئی۔ قادیانی افراد سے متعلق افراد کے گھروں اور دوکانوں کو آگ لگانے کے واقعات کثرت سے ہونے لگے۔ قادیانیوں کو مارنے پیٹنے کا سلسلہ بھی طول پکڑ گیا۔ حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ملک بھر میں قادیانیوں کا سوشل بائیکاٹ بھی کیا گیا۔'' (۱۴۱)

قصہ مختصر بھٹو صاحب کا چلایا ہُوا تیر ہدف پر جا کر لگا۔ اُن کا منصوبہ مرحلہ وار کامیاب ہو رہا تھا۔ اپنے عزائم کی تکمیل کی خاطر اُن کے ہاں ہر حربہ جائز تھا۔ حتیٰ کہ مخالفین کے خلاف کارروائی کا جواز پیدا کرنے کیلئے خود حکومت کی طرف سے دنگا فساد کھڑا کرانا بھی جائز تھا۔ شیخ مجیب کیساتھ اقتدار کی کشمکش کے دوران اسمبلی کا اِجلاس ملتوی کرانے کا جواز پیدا کرنے کیلئے جو حربہ استعمال کرنے کا مشورہ قبل ازیں اُنہوں نے یحییٰ خان کو دیا تھا وہی حربہ اب وہ خود اپنا رہے تھے۔ وہ مشورہ کیا تھا؟ آیئے روئیداد خان کی زبانی سنتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب 'پاکستان اِنقلاب کے دہانے پر' کے صفحہ ۶۱ پر یحییٰ خان کی طرف سے ۳ مارچ ۱۹۷۱ کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اِجلاس بلانے جانے کی تاریخ کے اعلان کے بعد بھٹو سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ قومی اسمبلی کے اِجلاس کے بلائے جانے پر سخت برہم تھے اور اُن کا مطالبہ تھا کہ اِجلاس کی تاریخ اُس وقت تک ملتوی کردی جائے جب تک اُن کے اور مجیب کے درمیان آئینی معاہدہ نہیں ہو جاتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب میں نے کہا کہ اب تو یحییٰ خان قومی اسمبلی بلانے کا اعلان کر چکے ہیں۔ اب اِس اعلان سے وہ پھر کیسے سکتے ہیں تو بھٹو نے جو جواب دیا وہ آج تک اُن کے کانوں میں گونج رہا ہے۔ بھٹو کا جواب تھا:

''اِس میں کیا مشکل ہے؟ ڈھاکہ میں بدامنی پھیلائی جاسکتی ہے، بلوے ہونگے، اشک آور گیس پھینکی جائے گی۔ گولیاں چلیں گی، دو چار لاشیں گریں گی اور بس قومی اسمبلی کے اجلاس کے اِلتوا کا جواز خود بخود پیدا ہوجائے گا۔'' وہ لکھتے ہیں کہ اُن کا جواب سن کر ''میں سکتے میں آ گیا۔ میرا ذہن ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ ذوالفقار علی بھٹو میکیاولی کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔''

چنانچہ احمدیہ فرقہ کے مسئلہ کو بھی اُنہوں نے سیاسی رنگ دے کر میکیاولی کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق حل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بدامنی پھیلائی گئی۔ بلوے کروائے گئے، گولیاں چلیں مگر احمدیوں پر، لاشیں گریں مگر احمدیوں کی، گھر جلائے گئے مگر احمدیوں کے۔ بھٹو کو احمدیوں کے خلاف کارروائی کا جواز ہاتھ آ گیا۔ احمدی اب اُن کیلئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ احمدیوں کی ضرورت اُنہیں اُس وقت تھی جب ایک طرف تو شیخ مجیب اُن کے سامنے پہاڑ بنا کھڑا تھا اور دوسری طرف مغربی پاکستان کی تمام کی تمام مذہبی جماعتوں نے اُن کے خلاف گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ اُنہیں پنجاب اور سندھ میں محض چند سیٹیں جیتنے کی توقع تھی۔ ان دونوں صوبوں میں اُن کی غیر متوقع جیت جس کے بل بوتے پر وہ متحدہ پاکستان کے حصے بخرے کر کے اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے کسی کرشمے سے کم نہ تھی۔ اور یہ کرشمہ دیگر سیاسی پارٹیوں کے مطابق اُن سے احمدیوں کی ہمدردی اور حمایت تھا جس سے بعد میں بھٹو صاحب منکر ہو گئے۔ کم ظرف انسان جب مصیبتوں میں گھرا ہوتا ہے تو تنکے کو بھی ستون سمجھ کر سہارا بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب مشکلات سے نجات پا کر صاحب اختیار ہوتا ہے تو اپنے محسنوں کے احسان کو اُن کی ضرورت گردانے لگتا ہے اور اپنی کامیابی و کامرانی کو اپنی ذاتی قابلیت اور ذہانت کا نتیجہ قرار دینے لگتا ہے۔ یہی حال کچھ بھٹو کا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی سابقہ کامیابی کو اپنی ذاتی ذہانت اور فراست کا نتیجہ سمجھنے لگے تھے اور تکبر اور نخوت کی راہ پر چل پڑے تھے۔ اُن کو وہم ہو گیا تھا کہ اُن کی پارٹی کے تمام کے تمام ممبران اسمبلی کی کامیابی اُن کے کرشماتی وجود سے وابستہ ہے۔ اُن کا واحد مقصد آئندہ انتخابات میں بھاری مینڈیٹ کے ساتھ کامیابی تھا اور اُنہیں گمان تھا کہ جس طرح وہ گزشتہ انتخابات میں روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر مزدوروں کو سرمایہ داروں، مزارعوں کو زمینداروں، کرایہ داروں کو مالکان مکان اور ہاریوں کو وڈیروں سے متنفر کر کے اُن کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، اسی طرح اس دفعہ وہ قادیانیوں کو قربانی کا بکرا بنا کر مولویوں سے بھی ختم نبوت کا جھنجھنا ہتھیانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جسے کھنکھنا کر وہ مذہبی جماعتوں کے مدرسوں کے طالبان کو بھی ورغلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اور اس طرح پاکستان کے چاروں صوبوں میں اُن کی پیپلز پارٹی کا طوطی بولنے لگے گا۔ لوہا گرم تھا مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دئے جانے کا

مطالبہ زوروں پر تھا۔ بھٹو عوامی مطالبے کے بہانے فوری طور پر احمدیوں کو غیر مسلمان اقلیت قرار دے سکتے تھے لیکن وہ بڑے کائیاں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ احمدیوں کی حمایت اُن سے چھن جائے۔ وہ ایک پتھر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ وہ اِس فیصلے کی ذمہ داری پوری قوم پر ڈال کر خود اپنے آپ کو قوم کے سامنے مجبور ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ اِس طرح قوم کے بھی ہیرو اور احمدیوں کے سامنے بھی سرخرو۔ لہٰذا ۱۳ جون کے اپنے قوم سے نشری خطاب میں اُنہوں نے اعلان کیا:

''جمہوری طریق یہی ہے کہ اِس اہم مسئلے پر عوام کے منتخب نمائندے سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ ... میں یہ فیصلہ دو منٹ میں کر سکتا ہوں۔ مگر میں دباؤ کے تحت کبھی نہیں کروں گا۔ میں قادیانیوں کے مسئلے کا جمہوری، منصفانہ اور صحیح فیصلہ کروں گا۔ اور مجھے اپنے فیصلے پر فخر ہوگا۔''

اور پھر اگلے ہی سانس میں اپنے فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ختم نبوت کا مسئلہ ہرگز متنازعہ نہیں۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے۔ اور یہ طے شدہ ہے کہ جو شخص ختم نبوت کا قائل نہیں ہے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔''

بھٹو صاحب کی تقریر کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ سیاسیات کے موضوع پر اگرچہ اُن کا وسیع مطالعہ تھا لیکن مطالعہ مذاہب میں اُن کا علم محض سطحی تھا۔ اگر مذاہب کے عروج و زوال کی تاریخ پر اُن کی نظر ہوتی تو وہ کبھی بھی یہ اعلان نہ کرتے کہ ختمِ نبوت کا مسئلہ متنازعہ نہیں ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ختمِ نبوت کا مسئلہ متنازعہ نہیں ہے تو پھر تنازع کس بات کا ہے؟ یہودی کہتے ہیں کہ ایلیا نبی آخری نبی تھے جو اُس وقت کے بادشاہ کے ظلم کی وجہ سے اپنی رتھ سمیت آسمان پر چڑھ گئے تھے۔ وہ اُن کے ظہورِ ثانی کے منتظر ہیں۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰؑ نہ صرف خدا کا بیٹا بلکہ آخری نبی تھے جو یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے آسمان پر چڑھ گئے تھے اور جاتے جاتے نظامِ شریعت معطل کر گئے تھے۔ ہندو مت کے آخری اوتار شری کرشن جی مہاراج ہیں اُن کے عقیدے کے مطابق وہ بھی آسمان پر زندہ بیٹھے ہیں۔ وہ اُن کی اور بدھ مت والے گوتم بدھ کی آمد ثانی کے منتظر ہیں۔ مسلمانوں کے مطابق اگرچہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ آخری نبی ہیں مگر حضرت عیسیٰؑ دوبارہ آسمان سے نازل ہوں گے جو نبی نہیں ہوں گے۔ فرقہ احمدیہ والے تو حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی نبوت کی خاتمیت پر اِس حد تک ایمان رکھتے ہیں کہ اُن کے مطابق اب کوئی سابقہ نبی دوبارہ اِس

جہان میں نہیں آئے گا۔ تجدیدِ دین محمدی کے واسطے حضرت امام مہدی علیہ السلام کا جوظہور ہونا تھا وہ اپنے وقت پر ہو چکا اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی ہی چودھویں صدی کے مجدد کی حیثیت سے امام مہدی اور مسیح موعود ہیں۔ اُن کے عقیدے کی وضاحت کیلئے مرزا صاحب کی کتب میں سے چند ایک اقتباسات پیش ہیں۔

☆ ''ہمارے مذہب کا خلاصہ اور لبِ لباب یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ ہمارا اعتقاد جو ہم اس دنیوی زندگی میں رکھتے ہیں جس کے ساتھ ہم بفضل توفیقِ باری تعالیٰ اِس عالم گزران سے کوچ کریں گے، یہ ہے کہ حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفےٰ ﷺ خاتم النبیین و مرسلین ہیں جن کے ہاتھ سے اکمالِ دین ہو چکا اور وہ نعمت بمرتبہ اتمام پہنچ چکی جس کے ذریعہ سے انسان راہِ راست کو اختیار کر کے خدا تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ اور ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتبِ سماوی ہے، اور ایک شعشہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام اور اوامر سے زیادہ نہیں ہوسکتا اور نہ کم ہوسکتا ہے اور اب کوئی ایسی وحی یا ایسا اِلہام منجانب اللہ نہیں ہوسکتا جو احکامِ فرقانی کی ترمیم یا تنسیخ یا کسی ایک حکم کی تبدیلی یا تغیر کرسکتا ہو۔'' (ازالہ اوہام حصہ اول ص ۱۳۷۔۳۸)

☆ ''مجھ پر اور میری جماعت پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین نہیں مانتے یہ ہم پر اِفترائے عظیم ہے۔ ہم جس قوت، یقین، معرفت اور بصیرت سے آنحضرت ﷺ کو خاتم الانبیاء یقین کرتے ہیں اُس کا لاکھواں حصہ بھی دوسرے لوگ نہیں مانتے۔ اور اُن کا ایسا ظرف بھی نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت اور راز کو جو خاتم الانبیاءؐ کی ختمِ نبوت میں ہے سمجھتے ہی نہیں۔ اُنہوں نے صرف باپ دادا سے ایک لفظ سنا ہوُا ہے مگر اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ ختم نبوت کیا ہوتا ہے، اِس پر ایمان لانے کا مفہوم کیا ہے؟'' (ملفوظات جلد اول صفحہ ۳۴۲)

اگر یہ بات ہے تو پھر اختلاف کس بات پر ہے؟ آیئے ذرا اِس پر نظر ڈالتے ہیں۔

تیرھویں صدی کے انجام اور چودھویں صدی کے آغاز تک مسلمانوں کے تمام فرقوں کا اِس بات پر اجماع تھا کہ نبی کریم ﷺ کے دین کی تجدید کیلئے ہر صدی کے سر پر اللہ تعالیٰ مجدد بھیجے گا۔ اِس سلسلے میں حدیثِ نبوی ہے:

''حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اِس اُمت کیلئے ہر صدی کے سر پر مجدد دین مبعوث فرماتا رہے گا۔'' (ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۱۲ و مشکوٰۃ ص ۱۴)

تمام علمأ اس حدیث کی صحت پر متفق ہیں اور واقعات نے بھی اِس کی تائید کردی ہے کہ تیرہ صدیوں میں سے کوئی صدی ایسی نہیں گزری جس کے سر پر مجدد نہ آئے ہوں۔ چنانچہ

مشہور کتاب حجج الکرامہ کے صفحہ ۱۳۵ تا ۱۳۹ پر گزشتہ تیرہ صدیوں کے مجددین کی فہرست ملاحظہ کی جا سکتی ہے جس کے آخر میں لکھا ہے کہ چودھویں صدی شروع ہونے میں دس سال باقی ہیں۔ اگر اس میں مہدی و عیسیٰؑ کا ظہور ہو جائے تو وہی چودھویں صدی کے مجدد ہونگے۔ لہٰذا تمام فرقوں کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد ثانی سے خاتمیت نبوت پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ احادیث میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مہدی اور مسیح موعودؑ ایک ہی شخص کے دو نام ہونگے اور وہ نبی ہوگا۔

۱۔ لا مهدی الا عیسی۔ نہیں مہدی مگر عیسیٰ (ابنِ ماجہ ص ۳۰۲)

۲۔ یوشک من عاش منکم ان یلقی عیسیٰ ابن مریم اماماً مهدیاً حکماً عدلاً یکسر الصلیب و یقتل الخنزیر۔ یعنی قریب ہے کہ جو تم سے زندہ ہو وہ عیسیٰ بن مریم کو امام مہدی اور حکم و عدل پائے۔ پس وہ صلیب کو توڑے گا اور خنزیر کو قتل کریگا۔

(مسند احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۴۱۱)

۳۔ شیعہ مسلک کی کتاب غایۃ المقصود کے ص ۲۱ پر درج ہے: ''میبذی در شرح دیوان آوردہ کہ روحِ عیسیٰ در مہدیؑ بروز کند و نزولِ عیسیٰ عبارت ازیں بروز است۔'' یعنی علامہ میبذی اپنے دیوان کی شرح میں فرماتے ہیں کہ عیسیٰ کی روح مہدیؑ میں بروز کرے گی اور نزول عیسیٰ سے مراد بھی ظہورِ مہدیؑ ہے۔''

خلاصہ کلام یہ کہ مہدیؑ خدا کے نبی ہوں گے اور مثیلِ مسیح موسوی ہوں گے۔ جس طرح حضرت عیسیٰؑ نے حضرت موسیٰ سے چودہ سو سال بعد ظہور پذیر ہو کر موسوی شریعت کی تجدید کا کام کیا تھا اِسی طرح حضرت مہدی علیہ السلام کا کام مسیح محمدی کی حیثیت سے اصلاح امتِ محمدیہ اور کسر صلیب یعنی عیسائیت کا زور دلائل سے توڑ کر از سر نو اِسلام کو سر بلند کرنا تھا۔ اِسلام کی سر بلندی کیلئے اللہ تعالیٰ کو دو ہزار سال تک عیسیٰؑ کو آسمان پر بٹھائے رکھنے کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ نبی کریم ﷺ کے فرمان کی رو سے بنی اسرائیل کے ایک نبی کی حیثیت سے اُن کا تو اپنا مرتبہ اسلام کے علمائے کرام کے برابر تھا اور وہ خود اتنے بے بس تھے کہ صرف دو ڈھائی سال کی تبلیغ کے بعد اُن کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اور بیچارے یہودیوں سے جان بچانے کیلئے چھپتے پھرنے لگے۔ آخِر جب پکڑے گئے اور صلیب پر لٹکا دئے گئے تو بے ساختہ ''ایلی ایلی لما شبقتنی'' یعنی اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے، پکار اُٹھے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اُن کی پکار سنی اور انہیں صلیب سے بچا لیا۔ اِس کے بعد وہ وہاں سے

غائب ہوگئے۔ وہ کہاں گئے؟ چودھویں صدی کے آغاز تک حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تین مختلف عقائد تھے:

یہودیوں کا عقیدہ: نعوذ باللہ وہ جھوٹا نبی تھا۔ اسلئے صلیب پر لعنتی موت مارا گیا جسے اُس کے پیروکاروں نے غائب کر کے جھوٹ موٹ مشہور کر دیا ہے کہ وہ آسمان پر چڑھ گیا ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ: وہ خدا کا بیٹا تھا اور ہر قسم کے گناہ سے پاک تھا۔ اُس نے بیگناہ صلیب پر جان دے کر تمام بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کیا۔ مرنے کے تین دن بعد دوبارہ جی اُٹھا اور آسمان پر چڑھ کر اپنے باپ کے دائیں طرف تخت پر جا بیٹھا۔

اوّلین مسلمانوں کا عقیدہ: نبی کریمﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ تک حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر اُٹھائے کا عقیدہ نہ تھا۔ بلکہ اُن کا عقیدہ یہی تھا کہ وہ بھی دیگر نبیوں کی طرح وفات پا چکے ہیں۔ چنانچہ نبیؐ پاکﷺ کے وصال پر جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو حضورؐ کی وفات کا یقین نہ آرہا تھا تو اُس وقت حضرت ابو بکرؓ نے قرآن شریف کی آیت کریمہ "و ما محمد الّا رسول قد خلت من قبلہِ الرسل افإن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم ۃ" (آل عمران ع ۱۵) پڑھ کر فرمایا کہ وہ ایک رسول اور انسان تھے۔ اسلئے وہ وفات پا گئے ہیں۔ کیا اُن سے پہلے نبیوں نے وفات نہیں پائی؟ اِنسان ہونے کے ناطے اگر وہ وفات پا جائیں یا پہلے نبیوں کی طرح قتل کر دئے جائیں تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ یعنی مرتد ہو جاؤ گے!!

حضرت ابو بکرؓ کا اِستدلال سن کر تمام صحابہ کرامؓ خاموش ہو گئے۔ اُن میں سے کسی نے بھی حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر زندہ ہونے کی دلیل پیش نہ کی۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت تک اسلام میں حضرت عیسیٰؑ کے آسمان پر اُٹھائے جانے کا عقیدہ راسخ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وہ اُنہیں بھی عام اِنسانوں کی طرح فوت شدہ مانتے تھے۔

اسلامی فتوحات کے بعد مسلمانوں کا عقیدہ: جب اسلامی فتوحات کے نتیجے میں دیگر مذاہب کے لوگ جوق در جوق اِسلام میں داخل ہوئے تو وہ سابقہ عقائد بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ اور قرآن شریف کی بعض آیات کو عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق توڑ مروڑ کر بعد کے علماً نے حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھائے بغیر ہی آسمان پر پہنچا دیا اور جواز یہ پیش کیا کہ اُن کی بجائے اُن کی شبیہ کا کوئی اور آدمی صلیب پر چڑھا دیا گیا تھا۔ چنانچہ عیسائیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی آہستہ آہستہ یہ عقیدہ جڑ پکڑتا گیا کہ اُمتِ محمدیہ کی ہدایت کیلئے حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اُتریں گے۔

احمدیہ فرقہ کا عقیدہ: فرقہ احمدیہ والے اُمتِ محمدیہ میں اِنقطاعِ نبوت کے خیال کو درست نہ قرار دیتے ہوئے قرآن کریم سے استدلال لیتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کی وفات پر یہودیوں نے بھی یہ مشہور کر

دیا تھا کہ اب آئندہ کوئی رسول نہ آئے گا۔ (سورۃ مومن آیت ۳۵ و سورۃ جن آیت ۸) لیکن اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے لاتعداد رسول مبعوث فرمائے۔ اسی طرح اجرائے نبوت کے سلسلے میں بھی وہ قرآن پاک ہی سے اس کے حق میں دلائل پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے اہم دلیل درج ذیل آیت ہے ''ومن یطع اللہ والرسول فاولائک مع الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین والشہداء والصّٰلحین، و حسن اُولائک رفیقاۃ'' (النسا آیت ۷۰)

یعنی جو اللہ اور اس رسولؐ کی اطاعت کریگا وہ اُن لوگوں میں سے ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ یعنی نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین میں سے۔ اور یہ سب بہت ہی اچھے ساتھی ہیں۔

اُن کا استدلال ہے کہ اِس آیتِ کریمہ میں صاف صاف خوشخبری دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچے دل سے پیروی کر کے انسان بتدریج نبوت تک کا درجہ پا سکتا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر خدائے قادرِ مطلق کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ ایک سابقہ نبی کو دو ہزار سال تک صرف اِسلئے آسمان پر بٹھائے رکھے کہ یہ بزرگوار اِس جہان میں دوبارہ آ کر اُس وقت کے جدید ترین مذہبِ اسلام کی تجدید محض خنزیروں کو مار کر اور صلیبوں کو توڑ کر کریں؟ اُن کا سوال ہے کہ اگر کوئی سابقہ نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے چودہ سو سال بعد آ کر بھی آخرِی نبی نہیں ٹھہرتا تو پھر آخرِی نبی کے معنی کیا ہیں؟ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کی زندگی میں ایک بچہ پیدا ہو اور دس سال کی زندگی پا کر اُس بوڑھے کی زندگی میں ہی فوت ہو جائے مگر وہ بوڑھا مزید دس سال تک زندہ رہے۔ اب خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ آخرِی وہ بوڑھا ہوگا یا اُس سے دس سال قبل مرنے والا بچہ۔ چنانچہ ہمارے خاتم الانبیاء کے چودہ سو سال بعد حضرت عیسیٰؑ اگر دوبارہ اِس دنیا میں وارد ہو کر وفات پاتے ہیں تو آخرِی نبی تو حضرت عیسیٰؑ ہی ہونگے۔ پس شانِ خاتم النبیین اِسی میں ہے کہ اِس کے معنی آخرِی نبی کے بجائے آخرِی صاحبِ شریعت نبی کے ہوں، جس کی مہر کے بغیر آئندہ کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔

بہر حال یہ ایک لمبی اختلافی بحث ہے جس میں یہاں اُلجھنا مناسب نہیں۔ قصہ مختصر مرزا غلام احمد قادیانی نے عین مقررہ وقت پر یعنی چودھویں صدی کے آغاز پر اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں خبر دی ہے کہ وہی اِس صدی کے مجدد اور امام مہدی ہیں۔ اُنہوں نے مزید اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں یہ بھی خبر دی ہے کہ مسیح ابن مریم فوت ہو کر یوز آصف کے نام سے محلہ خانیار سری نگر کشمیر ہندوستان میں دفن ہو کر آرام فرما رہے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں مصنف کو

بھی اُن کے مزار کی زیارت کا موقع ملا۔

مرزا صاحب کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں مہدی اور مثیل عیسٰی بنا کر اسلام کی اصلاح کیلئے بھیجا ہے۔ ثبوت کے طور پر اُنہوں نے متعدد قرآنی آیات اور احادیث کو پیش کیا۔ ظہورِ مہدی کے وقت کے نشانات کے طور پر اُنہوں نے نبیٔ اکرم ﷺ کی پیشگوئیوں کے مطابق عین مقررہ تاریخوں پر رمضان میں چاند اور سورج گرہن، عالمِ اسلام کا دورِ انحطاط، عیسائیوں کے دنیا پر غلبے، دجال کی نئی نئی ایجادات اور نت نئے علوم و معارف کی دریافت کو پیش کیا۔ اُنہوں نے اعلان کیا کہ نبی کریم ﷺ دنیا کے تمام مذاہب کے لئے پیغامبر بن کر آئے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اُن کے غلام کی حیثیت سے اس آخری زمانہ میں تمام مذاہب کیلئے مسیح موعود ہو کر آئے ہیں۔ وہ یہودیوں کیلئے ایلیا، عیسائیوں کیلئے مسیح ابنِ مریم، مسلمانوں کیلئے امام مہدی اور ہندوؤں کیلئے کرشن اور بدھوں کیلئے گوتم ثانی ہیں۔ ہندوستان چونکہ اِن تمام مذاہب کا گڑھ ہے اس لئے مسیح موعود کے ظہور کیلئے سب سے موزوں علاقہ بھی یہی تھا۔

اُن کے اِس اعلان پر ساری دنیا میں عموماً مگر ہندوستان میں خصوصاً اُن کی مخالفت میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ کیا ہندو، کیا عیسائی، کیا بدھ اور کیا مسلمان سب اُن کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ لیکن وہ اِن سب دنیاوی طاقتوں کی مخالفتوں سے بے نیاز اپنے مشن کی تکمیل میں کوشاں رہے۔ مخالفت کے باوجود اُن کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُن کی وفات کے وقت اُن کے پیروکاروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اُن کے بعد اُن کے مشن کو اُن کے خلفاء نے جاری رکھا۔

قصہ کوتاہ بھٹو قائدِ اعظم کے پاکستان کا تیاپانچا کرنے کے بعد اپنے اِقتدار کو مستحکم کرنے کی خاطر اب ایک ایک کر کے اُن کے رفقاء کو اپنے اقتدار کی بھینٹ چڑھانے لگے۔ قائدِ اعظم کے فرمودات کے ساتھ ساتھ اب قائدِ عوام نے فرمایا کے تحت اُن کے ارشادات بھی سینما گھروں اور ٹیلیویژن پر دکھائے جانے لگے۔ جس مذہبی مسئلہ میں کبھی احراری تحریک اور کبھی تحریک تحفظِ ختمِ نبوت کے نام پر پچھلے نوے سال سے مخالف مذہبی جماعتوں کے پُرتشدد احتجاجات اور سیاسی دباؤ کے باوجود کسی بھی سیاسی لیڈر نے اپنے آپ کو الجھانے سے اجتناب کیا بھٹو نے اپنی سیاسی بصیرت کے زعم میں اپنے آپ کو اِس مسئلے میں اِس حد تک ملوث کر لیا کہ آخر کار یہی مسئلہ اُن کے گلے کا پھندا بن گیا۔

دو ہفتے کے اندر اندر مسلمان جنونی شدت پسندوں کے ہاتھوں احمدیوں کی سات مساجد نذرِ آتش ہوئیں۔ ۵۰۰ کے قریب دکانوں اور گھروں کو لوٹا گیا جبکہ دو ہزار افراد اِن فسادات میں بے گھر ہوئے۔ حکومتی ترجمان نے ۲۲ جون ۱۹۷۴ء کو سرکاری طور پر اعلان کیا کہ فسادات میں ۴۲ افراد ہلاک ہوئے جن میں ۲۷ احمدی تھے۔ یہ سب سرکاری اعداد و شمار تھے۔ حالانکہ احمدیوں کا نقصان اِس سے کہیں زیادہ ہوا تھا۔ (۱۴۲)

بہر حال ۳۰ جون ۱۹۷۴ء کو حکومت کے ایما پر حزبِ مخالف نے قومی اسمبلی میں یہ قرار داد پیش کی کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔ اِس قرار داد پر غور کرنے کیلئے پوری قومی اسمبلی کو ایک خصوصی کمیٹی میں بدل دیا گیا۔ کوئی دو ماہ تک اِس خصوصی کمیٹی کے اِجلاس ہوتے رہے جس میں احمدیہ فرقہ نے اپنا موقف ایک محضر نامہ کی شکل میں پیش کیا۔ کئی روز تک اُن کے خلیفہ مرزا ناصر احمدؒ مرحوم بھی کمیٹی کے ممبران کے سوالات کے جوابات دینے کیلئے پیش ہوتے رہے۔ یہ سب تو ایک رسمی کارروائی تھی۔ فیصلہ تو بھٹو صاحب قبل ازیں متعدد بار سنا چکے تھے۔

وائے افسوس بھٹو صاحب نے محض اپنی کرسی کی مضبوطی کی خاطر پاکستان مخالف ملانوں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے قائدِ اعظم کے وضع کردہ قیامِ پاکستان کے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کے ایک بے ضرر اور امن پسند فرقے کو اپنی طاقت کے گھمنڈ پر دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی ٹھان لی۔ اُن کی اینٹی احمدیہ حکمتِ عملی سے سارے ملک میں احمدیوں کے بارے میں عوام کے رویے میں زبردست تبدیلی آ گئی۔ وہ لوگ جو قبل ازیں مذہب کے بارے میں غیر قدامت پسند اور آزاد خیال تھے۔ اُنہوں نے بھی اب احمدیوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ حکومتی اداروں اور افواجِ پاکستان میں احمدیوں کے بارے میں شکوک و شبہات نے گھر کرنا شروع کر دیا۔ فوج کا پڑھا لکھا طبقہ اگرچہ کافی حد تک مذہب کے معاملہ میں محتاط اور آزاد خیال تھا لیکن جہاں ذاتی مفاد کا معاملہ ہوتا وہاں اُن کی آزاد خیالی بھی دم توڑ جاتی۔ مذہبی جماعتوں کی طرف سے ''مرزائیوں کو کلیدی اسامیوں سے ہٹاؤ!'' کا مطالبہ وہ ہر روز اخباروں میں پڑھتے تھے۔ کس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ جس کلیدی اسامی پر کوئی احمدی متعین ہو اُس پر وہ نہ ہو؟ چنانچہ حکومتی پالیسی میں بتدریج تبدیلی آنے لگی۔ احمدی آفیسروں کو آہستہ آہستہ کلیدی اسامیوں سے علیحدہ کیا جانے لگے۔

چنانچہ کرنل کریم نے بھی اسلام کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر پہلے تو مجھے

سیکنڈان کمان کی اسامی سے ہٹا کر میری جگہ ایک جونیئر میجر کو لگا دیا۔ اور پھر جنگی قیدیوں کے کیمپ اوکاڑہ میں مغز ماری کیلئے عارضی ڈیوٹی پر بھیج دیا۔ مزید برآں میری سالانہ رپورٹ میں بعض ایسے ریمارکس دئے جو قابل اعتراض ہونے کے علاوہ غلط بھی تھے۔ میں نے جب اس کے خلاف اِحتجاج کیا تو اُس میں بیان کردہ حقائق سے کرنل کریم کے علاوہ ہمارے برگیڈ کمانڈر پر بھی زد پڑتی تھی۔ چنانچہ برگیڈ کمانڈر کی ایما پر چند جونیئر آفیسروں کو اُکسا کر میرے خلاف ایک جھوٹا کیس بنا گیا۔ الزام یہ تھا کہ میں نے اُن جونیئر آفیسرز کے سامنے کرنل کریم کو بُرا بھلا کہا۔ اِس کیس کی کورٹ آف انکوائری کیلئے لیفٹیننٹ کرنل عبدالوحید کاکڑ کو نامزد کیا گیا۔ کرنل کاکڑ بعد میں پاکستان فوج کے چیف آف سٹاف بنے۔ کئی دِن تک مجھے ہراساں کیا جاتا رہا۔ لیکن کیس کی کوئی بنیاد تھی نہیں اس لئے اسے بلا وجہ لٹکایا جارہا تھا۔ آخر ایک دِن کرنل وحید کاکڑ نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ کیوں معمولی سی بات کی خاطر اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رکھا ہے۔ اگر تم اپنی درخواست واپس لے لو تو میں یہ انکوائری ختم کرادوں گا۔ چنانچہ اس طرح بلیک میل کر کے مجھے اپنی جائز درخواست واپس لینے پر مجبور کیا گیا۔

۱۱۳ اے کے رجمنٹ

بہرحال اِس کے کچھ عرصہ بعد میری بدلی ۱۱۳ اے کے رجمنٹ میں ہوگئی۔ یہ پلٹن اُس وقت بھمبر آزاد کشمیر میں تھی۔ جب میں پلٹن میں پہنچا تو اُس وقت میجر محمد اختر بٹ پلٹن کا قائم مقام کمانڈنگ آفیسر تھا۔ بنیادی طور پر کشمیری مگر سیالکوٹ میں آباد۔ یہاں پہنچ کر مجھے اِحساس ہُوا کہ نہ صرف مذہبی بلکہ فوج میں علاقائی عصبیت بھی جڑ پکڑ چکی ہے۔ آزاد کشمیر رجمنٹ میں آفیسروں کے دو گروہ بنے ہوئے تھے۔ ایک گروہ کشمیری آفیسروں کا اور دوسرا پاک فوج کے آفیسروں کا۔ کچھ ہی عرصہ بعد مجھے احساس ہوگیا کہ اے کے رجمنٹ کے آفیسر اور جوان پاک فوج کے آفیسروں کے خلاف اچھا خاصا تعصب رکھتے ہیں۔ پہلے تو چند دِن اِحتیاط برتی گئی لیکن بعد میں میجر اختر نے پاکستان فوج کے آفیسروں کے بارے میں کھلے عام تنقید شروع کر دی اور آہستہ آہستہ مجھے بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ میرا حال تو اب ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' کے مصداق تھا۔ مزید برآں جب اُسے پتہ چلا کہ میں احمدی ہوں تو صورت ''ایک کریلہ دوسرے نیم چڑھا'' کی سی ہوگئی۔

پاکستان میں اب ہم مسلمان نہ تھے!!

مجھے پلٹن میں آئے دو ڈھائی ماہ ہی گزرے تھے کہ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء بروز ہفتہ بھٹو نے قومی اسمبلی کے ذریعے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوادیا۔ اگلے دِن کے سارے اخبارات نے اس فیصلے کی موٹی موٹی خبروں کی سیاہی سے اپنے چہرے سیاہ کرر کھے تھے۔ قادیانیوں کے خلاف مسلمانوں کے تمام باقی ماندہ فرقوں کے اِتحاد کو سراہا جا رہا تھا۔ سارے ملک میں خوشی کے جشن منائے جا رہے تھے۔ بھٹو صاحب کو اِسلام کا ہیرِو قرار دیا جا رہا تھا۔ کانگریس نواز مُلّاں اور لادین قوتیں قائد اعظم کے پاکستان کو چیر پھاڑ کر اُس کے لاشے کو خونخوار وحشیوں کی طرح بھنبھوڑ رہی تھیں۔ احمدیوں کو اِس فیصلے سے بے حد مایوسی ہوئی تھی۔ اسلئے کہ اُنہوں نے اسلام کے واسطے سے قیامِ پاکستان کی بھرپور حمایت کی تھی۔ لیکن وہ اپنے امام کے حکم کے تحت نہایت ہی صبر و تحمل کے ساتھ سب کچھ خاموشی سے برداشت کر رہے تھے۔ ہم فوجی بھی اِس فیصلے سے دل برداشتہ تھے۔ بعض نے تو جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی نوکریوں سے استعفے بھی دے دیئے۔ جنرل ٹکا خان کی مذہبی رواداری فوج میں جانی پہچانی تھی۔ اُن کی طرف سے تمام فارمیشن کمانڈروں کو ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ اپنے زیرِ کمان احمدیوں کو یقین دہانی کرائیں کہ یہ محض ایک سیاسی فیصلہ ہے۔ اِس سے احمدیوں کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

رات دیر گئے ریڈیو پر یہ دل شکن خبر سن کر ہم پریشانی اور اُداسی کے عالم میں سونے کی بیکار کوشش کر رہے تھے کہ دس بجے کے قریب ایجوٹینٹ کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ برگیڈ کمانڈر کی خواہش ہے کہ میں اگلے دِن اتوار کی صبح آٹھ بجے ناشتہ اُن کے ساتھ کروں۔ میں وقت مقررہ پر برگیڈ میس میں پہنچ گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد برگیڈ کمانڈر برگیڈیئر لقمان محمود بھی آگئے۔ وہ میرے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ کوئی پانچ منٹ تک ہم دونوں خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ میں افسردگی سے سر جھکائے بیٹھا تھا اور وہ بھی بت بنے بیٹھے تھے۔ آخرِ اُنہوں نے سکوت توڑتے ہوئے مجھے تسلی دینے کے انداز میں کہنا شروع کیا کہ یہ محض ایک سیاسی فیصلہ ہے اِس سے احمدیوں کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرا دل تو پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ اُن کے ہمدردانہ اندازِ گفتگو سے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جب میری ہچکیاں کچھ کم ہوئیں تو قدرے توقف کے بعد اُنہوں نے مجھے

حوصلہ دیتے ہوئے تاکیداً کہا کہ میں ۴ اے کے بریگیڈ کے سارے احمدیوں کو اُن کا یہ پیغام پہنچا دوں کہ اگر احمدیت کی بنا پر اُن سے کوئی زیادتی کرے تو بلا جھجک اُس کی شکایت براہ راست اُن تک پہنچائی جائے۔ لیکن بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ یہ محض ایک طفل تسلی تھی۔ احمدیوں کے استحصال کا آغاز ہر سطح پر شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان فوج کا قابل ترین آفیسر ہونے کے باوجود وہ خود اِسی شک کی بنا پر جرنیل کے رینک پر ترقی نہ پا سکے۔

اِس واقعہ کے چند دن بعد میجر اختر بٹ کی بھی ترقی ہو گئی۔ لیفٹیننٹ کرنل اختر بٹ کا قد تقریباً 5 فٹ 6 اِنچ مگر قد کے لحاظ سے پیٹ خاصا نمایاں تھا۔ اِس وجہ سے وہ فٹ بال کی طرح گول مٹول سے لگتے تھے۔ بھلا ہو جنرل ٹکا خان کا جس نے فوجی افسروں کو وردی میں قمیض کے علاوہ بشرٹ پہننے کی بھی اجازت دیدی جس سے کرنل اختر جیسے بہت سے فٹ بالوں کے پیٹ چھپ گئے۔ لیکن ہمارے بٹ صاحب کا تو بشرٹ بھی ضرورت سے زیادہ صحتمند ہونے کی وجہ سے آگے سے سلامی فنگ کی پوزیشن میں ہوتا۔ اِس کے باوجود تھا وہ بہت چست و چالاک۔ ساری پلٹن میں لڑکتا پھرتا۔ جو بات اُس کے دِل میں ہوتی پٹاخ سے مُنہ پر کہہ دیتا۔ جلد طیش میں آ جانے کا عادی اور مُنہ کا بے حد کڑوا تھا۔ گالی گلوچ اُس کیلئے کوئی خاص بدزبانی نہ تھی۔ چھوٹی موٹی گالی تو وہ عام مجلس میں بھی نکال دیتا تھا۔ اُس کے متعلق ایک واقف کار نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ کئی ہفتوں کے بعد رات گئے دیر سے جب سیالکوٹ اپنے گھر پہنچا تو بیوی کے سوا سب بچے سوئے پڑے تھے۔ بٹ صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سارے گھر میں اُودھم مچا دیا اور سب بچوں کو بستروں سے اُٹھا اُٹھا کر کھڑا کر کے کہنے لگا: ''اوئے فلانیو ڈھینکیو رات دے پہلے پہر ہی ...... ل تاں کر کے سوں گئے او! چلو مُنہ دھو کے اِمتحان دی تیاری کرو!'' لوگوں کا تأثر تھا کہ وہ دل کا صاف تھا لیکن مجھے اِس سے اِختلاف ہے۔ صاف گوئی اُس کی ذات کا اچھا پہلو تھا مگر غیر کشمیریوں اور احمدیوں کے خلاف تعصب بہت برا۔ احمدی ہونے کے ناطے اِس پلٹن میں بھی مجھ سے جونیئر میجر کو سیکنڈ اِن کمان لگایا گیا۔

اِس کے چند دن بعد پلٹن کی بارڈر ڈیوٹی کی باری آ گئی۔ اور ہم باغسر اور سماھنی کے پہاڑی علاقے میں چلے گئے۔ باغسر کا قلعہ ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے جو باغسر وادی کو بنڈالہ کی خوبصورت وادی سے جدا کرتی ہے۔ اِس قلعے سے دونوں وادیوں کا خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے۔ اِس کے علاوہ پورے علاقے میں ہر قسم کی نقل و حرکت پر بھی نگاہ رکھی جا سکتی

پلٹن کا ہیڈکوارٹر نیچے باغسر وادی میں تھا۔ تین کمپنیاں آگے بنڈالہ اور سماہنی میں اور ایک کمپنی باغسر کے قلعے میں دفاعی پوزیشن میں تھی۔ ہمارے اور بٹالین ہیڈکوارٹر کے درمیان کوئی تین میل کا فاصلہ تھا اور واحد پیدل راستہ درمیان والی پہاڑی کے اوپر سے ہوکر گزرتا تھا۔ کرنل بٹ متعصب ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کا sadist بھی تھا۔ آفیسرز کو بلا وجہ بے آرام اور پریشان رکھ کر لطف اندوز ہوتا۔ اِس کیلئے اُس نے یہ طریقہ اِختیار کیا کہ عین آرام کے وقفے کے وقت اُس کے ایجوٹینٹ کا ٹیلیفون آجاتا کہ سی او صاحب نے ایک گھنٹے کے اندر اندر سب آفیسروں کی ایک ایمرجنسی میٹنگ بلائی ہے۔ سب آفیسر فوری طور پر بٹالین ہیڈکوارٹر پہنچیں۔ ہم بھاگم بھاگ پہاڑوں کو پھلانگتے جب بٹالین ہیڈکوارٹر پہنچتے تو پتہ چلتا کہ بٹ صاحب کسی ضروری کام سے ساتھ والی پلٹن میں گئے ہیں۔ وہ چونکہ دیر سے آئیں گے اِسلئے آج میٹنگ نہیں ہوگی۔ آئندہ میٹنگ کے وقت کی اِطلاع بعد میں فون پر کردی جائے گی۔ سب آفیسر دل ہی دل میں کُڑھتے پھر پہاڑوں پر لڑکتے ٹھوکریں کھاتے اپنی اپنی کمپنی میں پہنچتے اور اگلے دِن کی میٹنگ کا اِنتظار کرنے لگتے اور اگر ایک آدھ دفعہ بٹ صاحب میٹنگ میں مل ہی جاتے تو جو ہدایات وہ ہمیں دیتے وہ اُن کا ایجوٹنٹ ٹیلیفون پر بھی آسانی سے بتا سکتا تھا۔

کرنل بٹ درمیانے درجے کی ذہانت کا مالک تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل تو وہ مرکھپ کر بن گیا۔ اب اُس نے ابھی سے جرنیل بننے کی تیاری بھی شروع کردی۔ اِس کیلئے اُس نے بالخصوص اپنی شخصیت کے ظاہری پہلو کا انتخاب کیا۔ اُس کا سب سے بڑا مسئلہ اُس کا پیٹ تھا جسے چھوٹا کرنے کیلئے خوراک کم کرنا ضروری تھا لیکن خوش خوراکی اور بسیارخوری اُن کی کمزوری تھی۔ چنانچہ اُس نے خوراک مناسب حد تک کم کرنے کی بجائے حد سے زیادہ ورزش شروع کردی۔ بندہ خبطی تھا۔ ہر وقت وردی یا پی ٹی کٹ میں ملبوس اِردگرد کے پہاڑوں کی چوٹیاں سرکرنے لگا۔ اِسی تگ و دو میں بے چارے کو ٹھنڈ لگ گئی۔ نزلہ زکام اور تیز بخار۔ میں نے مزاج پرسی کیلئے فون کیا تو کہنے لگا کہ وحید یار ذرا سا بخار ہے اسپرو کی گولی کھا کر تھوڑا آرام کر رہا ہوں۔ صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں نے سوچا چلو کرنل صاحب کی تیمارداری کر آتے ہیں۔ پہاڑوں پر سے مرتا کھپتا جب بٹالین ہیڈکوارٹر پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ تو پی ٹی ڈریس میں کہیں باہر نکل گئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چہرہ لال سرخ، پسینے سے سارا جسم شرابور بٹ صاحب دوڑے آرہے ہیں۔ آتے ہی میس میں آرام کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ جب

ذرا ہوش آیا تو بولا: ''سناؤ وحید کیویں آئے او؟''

میں نے کہا: ''سر آپ بیمار تھے۔ میں نے سوچا آپ کا حال احوال پوچھ آؤں۔''

اونہیں یار بماری ٹھماری تے کوئی ایڈی نہیں سی۔ ایہہ بخار (بہن کی گالی نکال کر) جان نئیں چھڈدا سی۔ میں تے لیٹ لیٹ کے تنگ پے گیاساں۔ سوچیا ایہنوں نٹھاؤ! تھوڑا پسینہ شسینہ آیا تے ہن میں ٹھیک آں۔'' وہ پیٹ کو سہلاتے ہوئے بولا۔

بہر حال یہ اُس کا طریقہ تھا بخار کو بھگانے کا۔ ڈاکٹر تو کہتے ہیں ایسی حالت میں انسان کو مکمل آرام کرنا چاہیئے مگر وہ تو بٹ صاحب تھے اُسے کون سمجھاتا۔ اُس کی اِن حرکتوں سے اُسے کچھ عرصہ کے بعد دِل کا ایسا دورہ پڑا کہ اگلے رینک کیلئے مستقل طور پر ان فٹ ہو گیا۔ جیسا کرنا ویسا بھرنا۔ خدا کے اِنصاف کی لاٹھی بے آواز اور اُس کی ضرب بہت کاری ہوتی ہے۔

ملٹری کالج آف انجینئرنگ

صوبہ سرحد میں نوشہرہ سے دریائے کابل کو عبور کر کے جب ہم مردان کی طرف روانہ ہوتے ہیں تو کوئی پانچ چھ میل کے فاصلے پر رسالپور کا چھوٹا سا قصبہ واقع ہے۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے غالباً انگریزوں نے پشاور کے راستے افغانستان کی سرحد تک کے راستے کو مشرقی سرحدی علاقے کے پٹھانوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کیلئے دریائے کابل کے مشرقی کنارے پر اپنے فوجی رسالے کیلئے چھاؤنی تعمیر کر رکھی تھی۔ رسالپور میں ملٹری کالج آف انجنیئر نگ کے علاوہ پاکستان فوج کی انجنیئر کور کا رجمینٹل سینٹر اور پاکستان ائرفورس کی اکیڈمی بھی واقع ہے۔ چھوٹا سا قصبہ جہاں کی رونق زیادہ تر فوجیوں کی ہی مرہون منت ہے۔ بازار بھی چھوٹا سا جہاں پر پوری ضروریاتِ زندگی کی اشیاء بھی میسر نہ تھیں۔ اور جو ملتی تھیں وہ بھی اچھے خاصے مہنگے داموں پر۔ لوگ ہفتہ بھر کا راشن نوشہرہ یا مردان سے خرید کر لاتے۔ حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے پنجابیوں کے خلاف اچھا خاصا تعصب پایا جاتا تھا یہاں تک کہ معمولی دکاندار بھی بعض دفعہ اپنے اندرونی بغض سے بے قابو ہو کر پنجابی گاہکوں سے بدتمیزی پر اُتر آتا۔ اُن کے خیال میں ایوب خان کو اِقتدار سے علیحدہ کرنے والے پنجابی تھے اور اُن کے خلاف مظاہروں کا آغاز چینی کے نرخ میں محض چند آنے فی کلو کا اضافہ تھا۔ اب جبکہ بھٹو صاحب کی سوشلٹ برانڈ جمہوریت کے دور میں مہنگائی نے عوام کی کمر توڑ کے رکھ دی تو اچانک پھر سے اُنہیں

ب خان کی یاد آنے لگی تھی۔ ایوب خان خود تو ۱۹۷۴ء میں وفات پا گئے لیکن اپنا فیلڈ مارشل ی وردی والا نقش ہر ٹرک کی پشت پر چھوڑ گئے جس کے نیچے یہ فقرہ ہر آنے جانے والے کا نہ آج بھی چڑا رہا ہے: "**تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد**"

رسالپور کا ماحول پہلے دِن سے ہی مجھے کچھ اچھا نہ لگا۔ سنسان سنسان سی جگہ۔ اجنبی ئے۔ نہ کوئی رونق نہ آنے جانے کی جگہ۔ انجینئر کور کے لوگ بھی خشک، تنگ دل اور کم بمز۔ ایک سال کے قریب اِن لوگوں میں گزارنے کے بعد احساس ہوا کہ فوج کا یہ طبقہ اپنے لم کے گھمنڈ میں دیگر فوجیوں کو جاہل خیال کرتا ہے۔ ہم میں سے چونکہ کوئی بھی اِس کور سے نہ تھا اسلئے ہمارے ساتھ ایک قسم کا اِمتیازی سلوک روا رکھا جاتا۔ یہاں تک کہ جی ایچ کیو کی طرف سے ہمارے لئے مختص کردہ فیملی اکاموڈیشن بھی اُنہوں نے اپنے سٹوڈنٹ آفیسروں کو دے رکھی تھی۔ ہماری طرف سے جب اِس کا مطالبہ کیا گیا تو ہمیں یہ کہہ کر چپ کرادیا گیا کہ ہماری اکاموڈیشن کالج کے پول پر ہے۔ جب کوئی گھر خالی ہوگا باری آنے پر مل جائے گا۔

ہماری کلاس میں چھ آفیسر تھے۔ میجر رشید سگنلز، میجر وقار اور میجر حامد آرٹلری، میجر سجاد آرمڈ کور اور مجھ سمیت میجر ظفر پنجاب رجمنٹ۔ سینیارٹی میں رشید کے بعد میرا نمبر تھا۔ میرے ئے سارے کے سارے اجنبی تھے۔ کورس خاصا مشکل تھا۔ گیارہ سال کے بعد پھر سے فزکس اور میتھ پڑھنا پڑ رہا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ ہمیں بنا کیا رہے ہیں۔ اگر سچ پوچھیں تو میں نے یہ کورس محض اِسلئے چنا تھا کہ پہاڑوں میں دھکے کھا کھا کر میں تنگ آ گیا تھا۔ نہ بچوں کا سکول، نہ فیملی لائف۔ دو ڈھائی سال آرام سے گزار کر اگلے تین چار سال کسی کام کے سٹیشن پر سٹاف جاب کریں گے۔ اِس سے زیادہ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اِنہیں دنوں پہلا اندوہناک واقعہ یہ پیش آیا کہ شاہ فیصل ابن عبدالعزیز کو اُن کے اپنے ہی بھتیجے نے اُن کے محل میں داخل ہو کر گولی کا نشانہ بنا دیا جس کے نتیجے میں وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ خاندانی تنازع ہونے کی وجہ سے شاہی خاندان نے اِس واقعہ کی زیادہ تشہیر نہ ہونے دی۔ شاہ فیصل ابن عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی شہزادہ خالد بن عبدالعزیز نے عنانِ حکومت سنبھال کر کچھ عرصے بعد سعودی قانون کے تحت قاتل شہزادے کا سر قلم کروا دیا اور یوں بات آئی گئی ہو گئی۔ اِس طرح احمدیہ جماعت کو دائرہ اسلام سے خارج کروانے والوں میں سے اولین فرد اپنے فطری انجام کو پہنچا۔

باب ۱۵

افواجِ پاکستان اور مذہبی انتہا پسندی

بھٹو صاحب احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے کر اِسلام کے ٹھیکیدار بن بیٹھے۔ اپنے زعم میں اُنہوں نے دینِ اِسلام کی بہت بڑی خدمت کی تھی۔ اِس کے عوض میں اب وہ پاکستانی عوام پر بلاشرکتِ غیرے حکمرانی کا اپنا حق جتانے لگے۔ لیکن ملّاؤں کے ہاتھ بھی بہت لمبے ہوتے ہیں۔ وہ اتنی آسانی سے اپنے اُن داتاؤں کو اُن کی جھولی میں ڈالنے کیلئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اِعلان کیا کہ محض آئین میں ترمیم کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ قادیانیوں کو مجبور کرے کہ وہ اپنے آپ کو غیر مسلم اقلیت تسلیم کر کے تمام شعارِ اِسلام کو ترک کرے۔ مزید برآں اب اُنہوں نے یہ مطالبہ بھی داغ دیا کہ قادیانیوں کو فوری طور پر تمام کلیدی اسامیوں سے الگ کیا جائے۔ سرکاری ملازمتوں میں اُنہیں غیر مسلموں کے کوٹہ میں سے آبادی کے تناسب سے حصہ دے کر زائد کو فوری طور پر اُن کی ملازمتوں سے برطرف کیا جائے۔ چنانچہ حکومت نے دباؤ میں آکر قادیانیوں کی مردم شماری کرنے کیلئے تمام سرکاری ملازمین کو اپنے مذہب کے بارے میں حلف نامے داخل کرنے کی ہدایت کی۔ حلف نامے کی عبارت ایسی رکھی گئی جس پر دستخط کر کے کوئی احمدی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کو تیار نہ تھا۔ حکومت کے روز افزوں اینٹی احمدیہ پروپیگنڈے سے اب پڑھے لکھے طبقے کے لوگوں کے دلوں میں بھی احمدیوں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ بعض اعلیٰ رینک کے احمدی آفیسروں نے اپنے آپ کو لبرل ظاہر کرنے کے چکر میں نہ صرف یہ کہ اپنے ساتھی احمدی افسروں سے ملنے جلنے سے اِجتناب برتنا شروع کر دیا بلکہ اُن کی حق تلفی بھی

کی۔ خاص کر ائرفورس کے کچھ احمدی آفیسروں کو اُس وقت کے احمدی ائر چیف کے خلاف شکایات تھیں۔ لیکن جب اِنتخابات کا وقت نزدیک آیا تو بھٹو نے اُنہیں بھی مکھن کے بال کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا۔

ملٹری کالج آف انجینئرنگ میں بھی کچھ اسی قسم کی فضا تھی۔ اپنے اساتذہ اور ساتھی افسروں کے سلوک سے میں اچھا خاصا پریشان تھا اسلئے کہ اِس چھوٹے سے شہر میں اِن کے علاوہ اور کسی سے واسطہ ہی نہ تھا۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے میرا ایک طرح سے بائیکاٹ کردیا۔ ایک دِن اُن میں سے ایک کے ساتھ کسی بات پر گرما گرمی ہوگئی۔ بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ انتظامیہ والے تو جیسے پہلے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔ مجھے کورس سے الگ کرکے یکطرفہ طور پر میرے خلاف کورٹ آف انکوائری شروع کروادی گئی۔ انکوائری کی رپورٹ پر مجھے سزا کیلئے لاگ ایریا کمانڈر کے سامنے پیش کیا گیا۔ میں چونکہ اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا تھا اِسلئے میں نے اُن کی طرف سے سزا کو قبول نہ کرتے ہوئے اپنی صفائی کیلئے کورٹ مارشل کے سامنے پیش ہونے کو ترجیح دیا۔

انہیں دنوں جب میں مذہبی تعصب کا شکار تھا ۱۶ اگست کی اخباروں میں یہ اندوہناک خبر چھپی کہ فوج نے اپنے بنگلہ بندو شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اُسے اور اُس کے تمام اہل خانہ کو نہایت ہی بے دردی سے تہہ تیغ کردیا ہے۔ مقتولین میں اُن کے تینوں بیٹے شیخ کمال، شیخ جمال، شیخ رسل، کمال اور جمال کی بیگمات، شیخ مجیب کے بھائی اور اُن کی اہلیہ شامل تھے۔ اُن کی دونوں بیٹیاں ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے بچ گئیں تھیں۔ اُن کا ایسا اِنجام کیوں ہؤا مختلف لوگوں کی مختلف آراء ہیں۔ ہوسکتا ہے بنگلہ دیش کی تخلیق کے سلسلے میں جن بے قصور لوگوں کی جانیں ضائع ہوئی تھیں اُن کا خون شیخ صاحب کی گردن پر بھی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہرحال خبر سن کر میری کئی دن تک طبیعت خراب رہی۔ شیخ صاحب کا مسکراتا چہرہ جب بھی آنکھوں کے سامنے آتا بے اختیار دل بھر آتا۔ بہرحال اقتدار کی رسہ کشی میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ کچھ دن بعد ہم پھر اپنے گھن چکروں میں پھنس کر یہ قصہ بھول گئے۔

کورٹ مارشل کی کارروائی کوئی دو ماہ تک ہوتی رہی۔ اِس دوران کورس کے رول پر نہ ہونے کی وجہ سے میرا میجر کا عارضی رینک بھی جاتا رہا لیکن اپنی عزت کی بحالی کیلئے مجھے یہ بھی منظور تھا۔ میں نے اپنے دفاع کیلئے فوجی قانون کے ماہر ایک تجربہ کار سویلین وکیل کی

خدمات حاصل کیں۔ کورٹ مارشل نے مجھے باعزت طور پر بری کرتے ہوئے منظوری کیلئے لاگ ایریا کمانڈر کو بھیج دیا۔ کالج کی انتظامیہ کو جب اس بات کی بھنک پڑی تو انہیں پالا پڑ گیا کہ ایک تو انہیں مجھے دوبارہ کورس میں لینا پڑے گا دوسرے جی ایچ کیو کی طرف سے اُن سے باز پُرس ہوگی کہ معمولی سی بات پر اتنا بڑا ہنگامہ کیوں کھڑا کیا۔ چنانچہ کمانڈنٹ ملٹری کالج آف انجینیر نگ بریگیڈیئر داؤد نے اپنے ہم رینک لاگ ایریا کمانڈر سے ساز باز کر کے کورٹ مارشل کے پریذیڈنٹ کو کیس کی کارروائی اس ہدایت کے ساتھ واپس کروا دی کہ مجھے کچھ نہ کچھ سزا ضرور دی جائے چاہے تنبیہ (Ripremad) ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ تمام فوجی قوانین کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دو ہفتوں کے بعد کورٹ مارشل کے پریذیڈنٹ نے مجھے دوبارہ کورٹ میں پیش ہونے کیلئے بلا بھیجا۔ قانون کی اِس خلاف ورزی پر میرے سخت احتجاج کے باوجود اس دفعہ وہ طریق اِختیار کیا گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرے لئے سزا کی سفارش کی گئی ہے۔

کالج والوں کی پوری کوشش تھی کہ مجھے جلد از جلد واپس یونٹ میں بھیج دیا جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے میری رہنمائی فرمائی۔ قبل اِس کے کہ یہ لوگ مجھے رسوا کر کے دوبارہ یونٹ میں واپس بھیجتے میں نے ایک آخری کوشش کے طور پر آرمی چیف کے نام ایک عرضداشت بھجوا دی۔ جِس میں میں نے سارے واقعات تفصیل کیساتھ لکھ دیئے۔ میں نے جو بات خاص طور پر زور دے کر لکھی وہ یہ تھی کہ:

''مجھے افسوس ہے کہ اشتعال میں آ کر میں نے اپنے ایک ساتھی آفیسر کو تھپڑ دے مارا۔ لیکن میں نے کوئی اتنا بڑا اخلاقی جرم نہیں کیا جس کی مجھے دو سزائیں دی جا رہی ہیں۔ ایک دفعہ بری کرنے کے بعد لاگ ایریا کمانڈر کے حکم پر مجھے سزا دلوانے کیلئے کورٹ مارشل کی کارروائی دوبارہ کروائی گئی۔ دوسرے مجھے کورس مکمل کئے بغیر ہی واپس میری پلٹن میں بھیجا جا رہا ہے۔ یہ سراسر نااِنصافی ہے۔ ایک معمولی سے قصور کے بدلے میں میرا سارا کیریئر تباہ کیا جا رہا ہے۔''

میرا ایک مہربان میجر محمد اسلم چیمہ اُن دنوں جی ایچ کیو میں چیف آف آرمی سٹاف کے سی جی ایس میجر جنرل محمد اقبال خان کا سٹاف آفیسر تھا۔ اُس کی مدد سے میری درخواست چیف تک پہنچ گئی۔ اگرچہ میں نے اپنی درخواست میں کہیں بھی ذکر نہیں کیا تھا کہ مجھے مذہبی تعصب کا نشانہ بنایا جا رہا تھا لیکن چیف کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے جنرل اقبال کو میری درخواست مندرجہ ذیل ریمارکس کے ساتھ فوری کارروائی کیلئے بھجوا دی:

1. Why withdraw from course?

2. Why spoil the career of the officer?

CGS to speak.

اللہ جانتا ہے جنرل اقبال نے چیف کو کیا رپورٹ دی مگر ایک ہفتے کے اندر اندر سارے کالج میں ہل چل مچ گئی۔ یہ کہ جنرل ٹکا خان نے بریگیڈئر داؤد کو فون پر جھاڑ ڈالتے ہوئے جواب طلبی کی کہ معمولی سی بات پر اُس نے ایک اچھے بھلے آفیسر کے کیریئر کو برباد کرنے کی کوشش کیوں کی۔ چیف کے فون کے بعد بریگیڈیئر داؤد نے مجھے بلا کر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ کچھ دن بعد جی ایچ کیو سے میری درخواست کا جواب آ گیا۔ جنرل ٹکا خان نے ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر میری درخواست پر ہمدردانہ غور کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا:

''میجر عبدالوحید ظفر ۱۹۷۶ء کے سٹاف کورس میں شامل ہوگا۔ اگر کسی وجہ سے وہ اِس کورس میں شامل نہ ہو سکے تو وہ ۱۹۷۷ء کے سٹاف کورس میں شامل ہوگا۔''

چند دِن کے بعد کورٹ مارشل کا فیصلہ بھی آ گیا۔ مجھے Repriand یعنی تنبیہ کی گئی تھی۔ یہ ملٹری کالج آف انجینئرنگ کی ساری انتظامیہ اور خاص طور پر ہمارے کورس انچارج کرنل یاسین اور کمانڈنٹ بریگیڈئر داؤد کے مُنہ پر جی ایچ کیو کی طرف سے ایک طمانچہ تھا۔ جنرل اقبال نے بعد میں جائنٹ چیفس آف سٹاف کے عہدے تک ترقی پائی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور بروقت کورس پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ چونکہ وقت کم تھا اور سٹاف کالج کوئٹہ کی طرف سے مجھے فیملی اکاموڈیشن کی یقین دہانی بھی نہیں کرائی گئی تھی اِسلئے میں نے اپنے بیوی بچوں کو رِسالپور میں ہی چھوڑا اور خود کوئٹہ پہنچ گیا۔

کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ

سٹاف کالج میں میں آخری وقت پر پہنچا تھا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہُوا کہ میں ڈیڑھ سو کے قریب آفیسروں میں واحد کپتان تھا۔ میرے کورس والے اور مجھ سے جونیئر سب میجر تھے۔ وہ سب مجھے کپتان کی وردی میں دیکھ کر حیران ہوتے۔ پہلے ایک دو ہفتے تو ہر ایک کو ساری کتھا سنانی پڑی پھر کہیں جا کر سکون نصیب ہوُا۔ میرا خیال تھا کہ کورس میں شامل ہونے کے بعد میرا میجر کا رینک مجھے دوبارہ مل جائے گا۔ چنانچہ میں نے کالج اِنتظامیہ سے اِس سلسلے میں جب رابطہ کیا تو اُنہوں نے ملٹری سیکریٹری برانچ سے دریافت کر کے بتایا کہ کورس کے دوران مجھے

میرے میجر کا رینک دوبارہ نہیں مل سکتا۔ قسمت کا لکھا جان کر میں خاموش ہو گیا لیکن تھوڑا ہی وقت ہوا جب اُس ملٹری سیکرٹری نے ہمارے کورس میں شامل میجر احسان کو میجر کے رینک سے لیفٹیننٹ کرنل کے رینک پر ترقی دے دی۔ بہرحال ہر چیز کے تاریک پہلوؤں کے ساتھ ساتھ روشن پہلو بھی ہوتے ہیں۔ مجھے یہ اِمتیاز حاصل ہے کہ میں پاک فوج میں واحد شخص ہوں جسے سٹاف کورس سے خارج کر کے دوبارہ شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ سوا سو کے قریب آفیسروں میں واحد کپتان تھا۔ یہ کورس اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک فوجی آفیسر کے کیریئر کیلئے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ فوجی علم جو اُس نے سیکھنا ہے وہ اپنی جگہ۔ اس کورس کے بعد انسان کی ذہنی نشوونما اس قدر ہو جاتی ہے کہ وہ ہر چیز کو ایک وسیع انداز میں دیکھنے اور پرکھنے لگتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف غیر ممالک کے جو افسران اس کورس میں شامل ہوتے ہیں اُن سے میل ملاپ سے اُن کے اندازِ فکر اور سوچ کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اِتفاق سے ہمیں جو بنگلہ الاٹ ہوا اُس کی اور کرنل نقشبندی کے بنگلے کی دیوار مشترک تھی۔ کرنل نقشبندی کا تعلق عراق سے تھا۔ ہمسائیگی کی وجہ سے ہمارے تعلقات دوستی میں بدل گئے۔ میں اُن کی متانت، فہم اور قابلیت سے بہت متاثر تھا۔ دیگر عرب ممالک کے افسران کے برخلاف وہ کاہل اور آرام طلب نہ تھے جو کورس کو محض ایک سال کی فراغت تصور کرتے تھے۔ عرب ممالک کے افسران میں سے سب سے کاہل اور کورس میں عدم دلچسپی رکھنے والے ابوظہبی کے کرنل حماد تھے۔ سارے کورس کے دوران جب بھی اُس سے کوئی سوال کیا گیا اُس کا صرف ایک ہی جواب ہوتا: "Language broblem"

کرنل نقشبندی یہاں آنے سے پہلے روس کے سٹاف کالج سے بھی گریجوایشن کر چکے تھے۔ اُنہوں نے ہمارے کورس کو رشین ماس اٹیک (Russian Mass attack) کی تھیوری پر بڑا دلچسپ اور بصیرت افروز لیکچر دیا۔ ۱۹۹۰ء میں جب امریکہ نے عراق پر حملہ کیا اُس وقت اُنہیں ٹیلیویژن پر صدام حسین کے ساتھ جنرل کی وردی میں دیکھا گیا۔ غیر ملکی افسران میں سے سب سے زیادہ تعداد ایرانی افسروں کی تھی۔ سب کے سب بے حد خوش خلق اور ملنسار تھے۔ اُن میں سے ایک میجر مجیدی ہمارے سنڈیکیٹ میں تھے۔ جب کبھی اُن کے گھر میں سنڈیکیٹ کے افسران کی مل کر کام کرنے کی باری آتی تو ایرانی روایات کے مطابق بہت خدمت کرتے۔ بخاری گرم رہتی اور گرم گرم ایرانی قہوہ وقفہ وقفہ کے بعد سب کے سامنے

ضر۔ اتنے ڈھیر سارے افسروں کی دیکھ بھال کیلئے ایران نے مستقل طور پر اپنا ایک رابطہ افسر سٹاف کالج میں مقرر کر رکھا تھا۔

نیا چیف

مارچ ۱۹۷۶ء میں جنرل ضیاً الحق نے جنرل ٹکا خان کی جگہ نئے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ سنبھالا۔ ہمارے لئے یہ کوئی اہم بات نہ تھی۔ یہ معمول کی ایک بات تھی۔ لیکن چند ماہ بعد جب نئے چیف صاحب نے سٹاف کالج کوئٹہ کو خطاب کیا تو ہم سب اُسے دیکھ کر بہت مایوس ہوئے۔ ہمیں بھٹو کے انتخاب پر تعجب کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا۔ اچھے بھلے قابل اور پُر وقار جرنیلوں کو نظر انداز کر کے کِس بھونڈے سے مسخرے کو ہم پر مسلط کر دیا تھا۔ بالآخر میرے ساتھ والے افسر سے نہ رہا گیا۔ اُس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہہ ہی دیا: ''وحید ہمارا نیا چیف تو حوالدار میجر لگتا ہے۔'' آج تیس سال بعد جب مجھے ضیاً الحق کے سیکریٹری داخلہ روئیداد خان کی کتاب ''پاکستان اِنقلاب کے دہانے پر'' کے مطالعے کا موقع ملا تو ضیاء کی شخصیت کے بارے میں اُن کا تبصرہ پڑھ کر میرے کانوں میں اُس افسر کے الفاظ پھر سے گونجنے لگے۔ وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۰ پر لکھتے ہیں:

''۱۹۷۶ میں اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے لیفٹیننٹ جنرل محمد ضیاء الحق کو اُن سے کئی اعلیٰ افسروں کو نظر انداز کر کے، اُنہیں پاکستان کی بری فوج کا سربراہ مقرر کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا۔ میں نے جنرل ضیاء الحق کی پہلی جھلک ۱۹۷۶ء میں اسلام آباد کلب میں دیکھی۔ ... وہ مجھ کو کم از کم جسمانی ڈول میں نہایت معمولی شخصیت کے آدمی لگے...''

کورس کی مصروفیت اور گہما گہمی میں وقت کچھ اِس تیزی سے گزرا کہ آدھا کورس گویا پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ سٹاف کالج کے کورس کے دوران ہر آفیسر اِس قدر گریڈنگ کانشس ہوتا ہے کہ محض بہتر نتیجے کی خاطر بعض دفعہ اپنی صحت کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ مڈٹرم کی چھٹیوں سے چند دن پہلے فزیکل فٹنس کا ششماہی ٹیسٹ ہوا جس میں بندوق اور روزمرہ کی ضرورت کے سازوسامان کے ساتھ چھ میل کی دوڑ بھی شامل تھی۔ پچھلے ڈیڑھ سال سے کوئی جسمانی کام نہ کرنے کی وجہ سے جسم اگرچہ آرام طلب ہو چکا تھا مگر مقررہ وقت میں دوڑ مکمل کرنا بھی ضروری تھا ورنہ سبکی ہوتی۔ دوڑ میں تو پاس ہو گیا مگر اگلے دِن گھٹنوں کے جوڑ اِس قدر جام ہو گئے کہ

میرے لئے اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا۔ کچھ دن گرم پانی کی ٹکوریں کرتا رہا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ مجبوراً سی ایم ایچ کوئٹہ میں ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ سرجن کرنل ڈاکٹر محمد ریاض نے ایکسرے وغیرہ دیکھنے کے بعد بتایا کہ میرے دونوں گھٹنے آسٹیو آرتھرائیٹس (Osteo Arthritis) کی زد میں ہیں۔ چھ میل کی دوڑ کے بعد مسلسل رگڑ کھا کر میرے دونوں گھٹنے بری طرح سے متأثر ہو چکے تھے۔ اُس زمانے کی ریسرچ کے مطابق اس کا علاج آرام اور سخت جسمانی کام سے اجتناب کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کیلئے میری میڈیکل کیٹگری ڈاؤن کرنی پڑتی اور میری آئندہ ترقی رُک جاتی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کے بعد ہمیں مڈٹرم کی چھٹیاں ہو گئیں اور مجھے آرام کیلئے اچھا خاصا وقت مل گیا۔ اب میں چلنے پھرنے کے قابل تو تھا لیکن تیز چلنا اور دوڑنا میرے لئے مشکل تھا۔ جب کبھی شام کو کھیلیں ہوتیں میں صرف ہلکی پھلکی ورزش کرتا اور جوں توں کر کے وقت گزار کر آجاتا۔

جیسا کہ اِس سے پہلے ذکر کیا جاچکا ہے بھٹو صاحب کے اقتدار کا ڈنکا پورے پاکستان میں بڑے زور شور سے بج رہا تھا۔ ایک ایک کر کے اُنہوں نے تمام مخالف طاقتوں کو زیر کر لیا تھا۔ فوج میں نچلے درجے کے افسروں کی بغاوت رونما ہونے سے پہلے ہی کچلی جاچکی تھی۔ آئین میں مارشل لأ لگانے والے کیلئے موت کی سزا مقرر کر کے ملکی معاملات میں فوج کی مداخلت کا راستہ بند کیا جاچکا تھا۔ مزید براں فوج کو اُس کے جوتوں میں رکھنے کیلئے فیڈرل سیکورٹی فورس کو جدید ترین اسلحہ اور ٹرانسپورٹ سے لیس کیا جاچکا تھا۔ پولیس پر بھٹو سیکورٹی فورس سے لاٹھی چارج کروا کر اُن کے ہاتھ میں اپنی حفاظت کا ڈنڈا تھمایا جاچکا تھا۔ چاروں صوبوں میں بھٹو کے مقرر کردہ گورنر اور اُن کے اِشاروں پر ناچنے والے وزرائے اعلیٰ حکومت کر رہے تھے۔ بلوچ سرداروں کو نتھ ڈالنے کیلئے فوج پہاڑوں میں اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔ سرداری سسٹم ختم کیا جاچکا تھا۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے سرپنچوں کو پابندِ سلاسل کر کے حیدر آباد جیل میں ڈالا جا چکا تھا۔ اُن پر اب بھٹو کی منشأ کے مطابق ملک کے خلاف غداری کا مقدمہ چل رہا تھا۔ نام نہاد شیر پنجاب مصطفےٰ کھر کو بکری کی کھال پہنائی جا چکی تھی۔ جماعت اِسلامی کے امیر میاں طفیل محمد کو قومِ لوط کے حوالے کر کے اُن کی طہارت اور پاکیزگی کو تار تار کیا جاچکا تھا۔ اِفتخار تاری، چوہدری اِرشاد اور اِس قماش کے دیگر غنڈوں کو دلائی کیمپ کی یاترا کروا کر داداگیری میں نام پیدا کیا جاچکا تھا۔ پیر پگاڑا کے حروں کو پولیس مقابلہ میں مروا کر

پیر صاحب کو ستاروں کا علم سیکھنے پر لگا دیا گیا تھا۔ سرمایہ داروں کی ملوں، بینکوں، بیمہ کمپنیوں، جننگ فیکٹریوں، گھی ملوں حتیٰ کہ آٹا پیسنے کی چکیوں اور پرائمری سکولوں تک کو قومیا کر اُنہیں پیپلز پارٹی کے جیالوں کے حوالے کیا جا چکا تھا۔ قادیانیوں اور احمدیوں کو دائرۂ اِسلام سے خارج کر کے اپنے خیال میں اُن کے اثر و رسوخ کو محدود کیا جا چکا تھا۔ ختم نبوت کا نوے سالہ پرانا مسئلہ حل کر کے وہ سمجھتے تھے کہ مولویوں کے غبارے سے ہوا نکالی جا چکی ہے۔

صوبائی کوٹے کے نام پہ میڈیکل کالجوں میں تھرڈ ڈویژن ایف اے پاس سندھیوں کو داخل کر کے ڈاکٹری کے معزز پیشہ کو کشتہ ماروں میں بدل دیا گیا تھا۔ ہوسٹلوں میں اسلحہ کی ذخیرہ اندوزی اور تخریب کاری کے جرم میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباً کی تنظیموں پر پابندی لگائی جا چکی تھی۔ سی ایس ایس اور پی سی ایس ٹائپ کے بیوروکریٹس کی گزیٹڈ افسری ختم کرنے کیلئے "وایا بٹھنڈہ" جعلی ڈگریاں حاصل کرنے والے کلرکوں، سٹینو ٹائپسٹوں اور سکول ماسٹروں کو اُن کے سروں پر مسلط کیا جا چکا تھا۔ ملک کی اعلیٰ ترین عدالتوں کے ججوں کو لالچ اور دھمکی کے ذریعے زیر کیا جا چکا تھا۔ سربراہِ مملکت کو صدارتی محل میں محصور کیا جا چکا تھا۔ قومی ٹیلیویژن پر بابائے قوم قائدِ اعظم کے شانہ بشانہ قائدِ عوام کے ارشادات بھی نشر ہونے لگے تھے۔ غرضیکہ ملک کا ہر ادارہ بھٹو کے اِشاروں پر ناچ رہا تھا۔ عوامی سوشلزم کی جگہ بھٹوازم اپنے عروج پر تھی۔ حامد یوسف نے اُس دور کا کچھ یوں نقشہ کھینچا ہے:

''بظاہر حکومت کی اتھارٹی ناقابلِ تسخیر حد تک مضبوط ہو چکی تھی۔ ریاستی اداروں کو بلا شرکتِ غیرے حکمرانی کی ضروریات کے مطیع کیا جا چکا تھا۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ہر قسم کی مخالفت کو دبانے اور قومی ذرائع کو عوام کی بلا چوں چراں اطاعت کے حصول کیلئے استعمال کیا جا رہا تھا'' (۱۴۳)

چنانچہ بھٹو کی تیار کردہ ماڈل الیکشن پلان ۱۹۷۶ء کے تحت جونہی پیپلز پارٹی کی ممبر سازی کی مہم کا آغاز ہوا احزابِ مخالف کے بڑے بڑے ستونوں نے اپنے "لوٹا پن" کا مظاہرہ کرتے ہوئے جوق در جوق حکومتی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ شاہی پارٹی میں شمولیت کر کے لیلیٰ اِقتدار کے وصل کی خاطر دولتانہ اور سردار شوکت حیات خان جیسے ''پکے ڈٹے مسلم لیگیوں'' کو بھی پیپلز پارٹی کی ''چراغ روشنائی'' سے اپنے چہروں کو کالا کرنا پڑا۔

بھٹو نے انتخابات کا اعلان کئے بغیر حکومتی ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے یکطرفہ طور پر ملک کے طوفانی دورے کرنے شروع کر دئے۔ اِن دوروں کا مقصد عوام کی بھلائی نہیں بلکہ

ملک اور قوم کیلئے اپنی خدمات کا اِحسان جتانا تھا۔ تمام ذرائع ابلاغ ملک کے کونے کونے میں بھٹو کا یہ راگ الاپنے لگے:

''میں نے نوے ہزار قیدیوں کو آزاد کرایا۔ میں نے قادیانیوں کا نوے سالہ مسئلہ حل کیا۔ میں نے اِسلامی ممالک میں پاکستان کا وقار بڑھایا۔ وغیرہ وغیرہ''

سینما گھروں میں اور ٹیلیویژن پر بھٹو کی مصروفیات کے ٹریلر چلنے لگے۔ ایوب خان نے تو دس سال تک ملک میں زرعی اور صنعتی انقلاب برپا کر کے دس سالہ جشن منایا تھا جس پر سب سے زیادہ تنقید خود بھٹو نے کی تھی۔ اور جب اپنی باری آئی تو پانچ سال کے اندر اندر ہی ملک کو مہنگائی کے گڑھے میں دھکیل کر نوے ہزار قیدیوں کی رہائی اور قادیانیوں کے نوے سالہ مسئلہ کو بزعم خود حل کرنے کے بدلے میں لوگوں کی گردنوں کو اپنے اِحسانوں کے جوئے میں جکڑنا شروع کر دیا۔ یہ ہے میکیاولی کی سیاست۔

انہی طوفانی دوروں کے سلسلے میں اُنہوں نے کوئٹہ کا بھی دورہ کیا۔ کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کی جدید عمارت میں درس و تدریس کا کام تو شروع ہو چکا تھا لیکن اُس کا ابھی تک روایتی طور پر افتتاح نہیں ہؤا تھا۔ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کمانڈنٹ سٹاف کالج میجر جنرل وجاہت حسین نے بھٹو سے درخواست کی کہ وہ یہ کارِ خیر بھی اپنے دستِ مبارک سے سرانجام دے دیں۔ اِفتتاحی تختی کی نقاب کشائی کے بعد اُنہوں نے کالج کے جدید آڈیٹوریم میں جملہ افسران سے خطاب کیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انہوں نے کہا تھا کہ سیاستدان بھی انتخابات سے اُتنے ہی خوفزدہ ہوتے ہیں جتنے ''جرنیل جنگ سے''۔ لیکن سیاسی جنگیں چار و ناچار لڑنی ہی پڑتی ہیں۔ اور ہمارے جرنیل بھٹو کی طنز کو سمجھنے کے باوجود قہقہے لگانے لگے تھے۔

خدا خدا کر کے کورس اختتام کو پہنچا۔ اس سال سے کورس کے اِختتام پر کامیاب افسران کو باقاعدہ (PSC) کی ڈگری دی گئی۔ کورس کے اِختتام پر جی ایچ کیو سے ملٹری سیکریٹری بذاتِ خود سٹاف کالج میں آ کر پہلے تو کورس کو خطاب کرتا ہے اور پھر کالج کی رپورٹ اور سفارش کی روشنی میں ہر افسر کا نام لیکر اُس کی نئی اسامی اور پوسٹنگ کی جگہ کا اعلان کرتا ہے۔ یہ دِن ہر آفیسر کے کیریئر میں ایک بہت اہم موڑ ہوتا ہے۔ اسلئے ہر کوئی بڑی بیتابی سے اپنے نام کے ساتھ کسی اچھی سے اسامی کے اعلان کا منتظر ہوتا ہے۔ ان دنوں میجر جنرل کے ایم عارف ملٹری سیکریٹری تھے۔ اسلئے اس دفعہ اُنہوں نے یہ کارِ خیر سرانجام دیا۔ میں نے بہت سے

افسردہ چہروں کو کھلتے دیکھا اور بہت سے بڑی بڑی اُمیدیں لگانے والوں کو مایوس پایا۔ مجھے چونکہ پتہ تھا کہ میرے لئے میجر کے رینک پر ترقی کیلئے واپس اپنی یونٹ میں جانا ضروری تھا اسلئے میں کسی معجزے کی اُمید میں نہ تھا۔ بہر کیف تعجب مجھے اُس وقت ہوا جب میری سابقہ یونٹ ۱۱۳ اے کے میں میجر کی اسامی خالی ہونے کے باوجود مجھے ایک دوسری یونٹ ۱۹ اے کے میں پوسٹ کردیا گیا۔ میں نے واپس اپنی یونٹ میں پوسٹنگ کیلئے ایم ایس سے انٹرویو لیا تو اُنہوں نے یہ کہہ کر میری تسلی کرادی کہ: ''آپ نے تو صرف اپنے بارے میں سوچنا ہے مگر ہم نے ساری فوج کے بارے میں سوچنا ہے۔ یہ درست ہے کہ ۱۱۳ اے کے میں میجر کی اسامی خالی ہے مگر ۱۹ اے کے میں سرے سے کوئی میجر ہے ہی نہیں۔''

۹ آزاد کشمیر رجمنٹ

دو ہفتے کی چھٹی گزار کر ۶ جنوری ۱۹۷۷ء کو میں اپنی پلٹن میں پہنچ گیا۔ ۱۹ اے کے اُس وقت آزاد کشمیر کے علاقہ باغ میں مقیم تھی۔ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ظفر اللہ سے انٹرویو ہوُا۔ اُن کا سابقہ فرنٹیئر فورس رجمنٹ سے تعلق تھا۔ آرمی ایوی ایشن کور میں بطور پائلٹ نوکری کی۔ کوئی سال بھر سے ۱۹ اے کے کی کمان سنبھالی تھی۔ قد چھ فٹ کے قریب۔ بھرا بھرا جسم۔ لمبی لمبی مونچھیں اور موٹی موٹی آنکھیں۔ بھاری بھرکم آواز۔ میانوالی کا رہنے والا۔ اُس کے مطابق اُس کی بیگم جنرل یحییٰ خان کے بھائی آغا محمد علی کی بیٹی تھی۔ دیکھنے کو تو بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میرے میجر سے کپتان بننے کی خبر اُسے پہلے سے ہی پہنچ چکی تھی۔ وجہ نہ اُس نے پوچھی اور نہ ہی میں نے بتائی۔ البتہ میں نے اپنے گھٹنوں کی تکلیف کا اُس سے ذکر اِس لئے کردیا تاکہ میری ڈیوٹی لگاتے وقت وہ اِس کا کچھ خیال رکھے۔

۱۹ اے کے آزاد کشمیر رجمنٹ کی بہترین پلٹنوں میں سے ایک تھی۔ ۱۹۷۱ء کی ہندو پاک جنگ میں لیپا وادی میں دشمن کے خلاف اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر اُسے لیپا ہیرو کا خطاب دیا گیا تھا۔ اِس وقت یہ بارڈر سے پیچھے ہٹ کر بریگیڈ کی ریزرو بٹالین کے رول میں باغ سے کوئی دس کلومیٹر اِدھر ہاڑی گیل کی تنگ سی وادی میں پکی بارکوں پر مشتمل کیمپ میں مقیم تھی۔ ہمارے کیمپ کے سامنے مری سے باغ کو جانے والی سڑک کے اُس پار ایک پہاڑی نالہ بہتا تھا۔ یہاں سے پوری وادی ایک حسین وجمیل نظارہ پیش کرتی تھی۔ مجھے یہ جگہ پسند آئی۔ اگلے

دن جب سورج نکلا تو اردگرد ہر طرف برف کی سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ سورج کی کرنیں اس سے منعکس ہو کر آنکھوں کو چندھیا رہی تھیں۔ سخت سردی میں چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ملیشیا کی شلواروں قمیصوں میں ملبوس، کندھوں پر بستے لٹکائے، سردی کی وجہ سے بغلوں میں ہاتھ دبائے قریب کے پرائمری سکول کی طرف جا رہے تھے۔ اکثر نے ہوائی چپلیں پہنی ہوئی تھیں۔ چند ایک کو میں نے ننگے پاؤں بھی دیکھا۔ کون جانتا تھا کہ اِن میں سے کل کوئی غلام عباس یا سردار ابراہیم یا جنرل حیات محمد صدر آزاد کشمیر ہو۔ اِنہیں دیکھ کر مجھے اپنی سر سے لیکر پاؤں تک آرام دہ گرم وردی میں شرم محسوس ہونے لگی۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا اور میں اپنی فوجی ذمہ داریوں میں مگن ہو گیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد دیر تک میس میں بیٹھنا کرنل ظفر کی عادت تھی۔ موضوعِ گفتگو گھوم پھیر کر اُس کے آرمی ایوی ایشن کور کی سروس کے دوران کے کارنامے ہوتا۔ بعض دفعہ تو اُس کی کہانیاں بے حد اُکتا دینے والی ہوتیں لیکن آدابِ مجلس کا خیال رکھتے ہوئے ہم بیٹھے سنتے رہتے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ایک انفنٹری بٹالین میں لیفٹیننٹ کرنل کے علاوہ عام طور پر ۱۴ آفیسر ہوتے ہیں۔ اِن میں کم از کم ۶ میجر اور باقی کیپٹن یا لیفٹیننٹ ہوتے ہیں لیکن اِس پلٹن میں تو کل سات افسر تھے۔ کرنل ظفر کے سوا باقی سب کے سب کیپٹن یا لیفٹیننٹ تھے۔ میری پروموشن کے کاغذات اگرچہ برگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بھیجے جا چکے تھے لیکن ابھی تک منظوری نہیں آئی تھی۔ اِن لیفٹینوں میں ایک ایسا شیر بھی تھا جو محکمانہ امتحانات پاس نہ کرنے سکنے کی وجہ سے میجر سے ڈیموٹ ہو کر سیدھا لیفٹین بنا بیٹھا تھا۔ غضب خدا کا میرے علاوہ اِس پلٹن میں کپتان بھی کوئی نہ تھا۔ چنانچہ سینئر آفیسرز کی کمی کی وجہ سے نوجوان آفیسروں کی مناسب طور پر تربیت نہیں ہو رہی تھی۔ بعض دفعہ وہ بے تکلفی میں آدابِ مجلس کو بھی ملحوظِ خاطر نہ رکھتے۔ سیکنڈ اِن کمان کی حیثیت سے میں جب اُنہیں سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ کرنل ظفر کے پاس جا کر میری شکایتیں کرنے لگے۔ وہ چونکہ کان کا کچا تھا اِسلئے اُنہیں سمجھانے کی بجائے اُن کی شکایتوں پر کان دھرنے لگا اور آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہوتا گیا۔ چنانچہ اُس کی اِس سستی شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی پالیسی نے جونیئر آفیسروں کے ڈسپلن کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا۔ پنجابی کی ایک مثال ہے اگے نالوں پچھّا بھلا۔

باب ۱۶

بھٹو کا زوال

پانچ سال کی حکومت کے بعد بھٹو بھی اپنے پیشروؤں کی طرح انجام کار اِس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ پاکستان جیسے ملک میں جس کی عوام غیر متحد اور نظم وضبط سے بے بہرہ ہو، جمہوریت کا اطلاق صرف اُن اداروں تک ہونا چاہیئے جو برسر اقتدار لوگوں کے کام میں رکاوٹ نہ بنیں۔ لیکن اسی بنا پر سابقہ حکومتوں کی غیر مقبولیت اور فوجی مداخلت سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ اس قسم کے حالات سے نپٹنے کیلئے اُنہوں نے سارے اِختیارات اپنی ذات میں مرکوز کر کے تمام کلیدی فیصلے خود کرنے شروع کر دیئے۔ ملک کے سرمایہ دار، بیوروکریٹس، اور حزب مخالف کے سیاستدان تو پہلے ہی بھٹو کی پالیسیوں سے نالاں تھے۔ اُن کے اِس نوع کے طرزِ حکومت سے ملک کا درمیانے درجے کا پڑھا لکھا طبقہ بھی اُن سے بدظن ہوگیا۔ مگر نچلے درجے کی ہنگامہ خیز عوامی اکثریت کی حمایت کے نشے میں اُنہوں نے اِس کی پرواہ نہ کی۔

ماڈل الیکشن ۱۹۷۷ء

آئین کے تحت قومی اسمبلی کی مدت ۱۴ اگست ۱۹۷۸ء کو ختم ہونی تھی۔ لیکن سرمایہ داروں کے عدم تعاون، قومیائے ہوئے صنعتی ادراوں کی ناقص کارکردگی، اقتصادیات کی ناقص منصوبہ بندی اور عالمی منڈی میں تیل کی قیمتوں میں آئے دِن کے اضافے سے ملک میں روز بروز مہنگائی بڑھ رہی تھی جو اگلے اِنتخابات کے موقع پر بھٹو صاحب کی پارٹی کیلئے مسئلہ بن سکتی تھی۔ چنانچہ اُن کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ چونکہ اِس وقت عوام میں اُن کی مقبولیت عروج پر ہے

اسلئے اُنہیں وقت سے پہلے الیکشن کروا کر عوام کا مینڈیٹ حاصل کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ ماڈل الیکشن پلان کے تحت اُنہوں نے ۷ جنوری ۱۹۷۷ء کو اچانک قومی اور صوبائی اسمبلیوں کو توڑ کر دو ماہ بعد ۷ مارچ کو قومی اسمبلی اور ۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلیوں کے چناؤ کا اعلان کروا دیا۔

اِنتخابات کے اعلان کے بعد جونہی سیاسی سرگرمیاں شروع ہوئیں حزبِ مخالف کی نو بڑی سیاسی پارٹیاں سرمایہ داروں کی سرپرستی میں متحدہ قومی محاذ کے نام سے پیپلز پارٹی کے خلاف متحد ہو گئیں۔ ان پارٹیوں کے اِنتخابی پروگراموں میں اگرچہ زمین و آسمان کا فرق تھا لیکن بھٹو مخالفت میں وہ سب متحد ہو گئیں اور عوام کو متحرک کرنے کیلئے اُنہوں نے اعلان کیا کہ وہ پیپلز پارٹی کی دھونس، دھاندلی اور ڈنڈے کی حکومت کی جگہ نظامِ مصطفٰے کے تحت عادلانہ نظامِ حکومت کا نفاذ کریں گی۔ مذہب کے نام پر عوام جب سڑکوں پر اُمڈ آئے تو بھٹو اور اُن کے مشیر بوکھلا گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ ختمِ نبوت کا مسئلہ یکطرفہ طور پر حل کر کے اُنہوں نے مذہبی طبقے کو بھی اپنی مُٹھی میں کر لیا ہے لیکن یہ اُن کی بھول تھی۔ مُلاں لوگ اِتنی آسانی سے اُن کی جان چھوڑنے والے نہیں تھے۔ حزبِ اِختلاف کے جلسے جلوسوں سے مرعوب ہو کر بعض وزراء نے اپنے اِنتخاب کو یقینی بنانے کیلئے اپنے اِختیارات کا ناجائز اِستعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو بلا مقابلہ منتخب کروانا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۲۳ جنوری تک حکومتی پارٹی کے صوبائی اسمبلیوں کے ۶۹ اور قومی اسمبلی کے ۲۵ اُمیدوار اپنے آپ کو بلا مقابلہ منتخب کروا چکے تھے۔ اِن میں چاروں صوبوں کے چیف منسٹر اور خود بھٹو بھی شامل تھے۔ بلا مقابلہ منتخب ہونے کے شوق میں اُنہوں نے اپنے حلقہ این اے ۱۶۳ لاڑکانہ سے امیر جماعت اسلامی سندھ جان محمد عباسی کو کاغذاتِ نامزدگی داخل کروانے سے پہلے ہی اغوا کروا دیا اور اُنہیں اُس وقت تک آزاد نہ کیا جب تک کہ الیکشن کمیشن نے اُن کے بلا مقابلہ اِنتخاب کا اعلان نہ کر دیا۔

جنرل اختر عبدالرحمٰن

کرنل ظفر جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی کا معتقد تھا۔ اِس نسبت سے میرے عقیدے کی وجہ سے وہ مجھ پر اعتماد نہیں کرتا تھا۔ پہلی دو پلٹنوں کے کمانڈنگ آفیسروں کے برعکس اگرچہ اِس نے مجھے سیکنڈ اِن کمان لگا رکھا تھا مگر پلٹن کے بارے میں اگر کوئی مشورہ کرنا ہوتا تو وہ میری بجائے لیفٹیننٹ حکمداد کو ترجیح دیتا اور حیلے بہانے سے مجھے پلٹن کے اہم امور

سے لاتعلق رکھتا۔ اِنہی دِنوں کرنل ظفر کو سرکاری ڈیوٹی کے سلسلے میں ہفتہ بھر کیلئے مظفر آباد جانا پڑا۔ اُس کے جانے کے دو دِن بعد صبح ۸ بجے کے قریب برگیڈ میجر نے فون پر بتایا کہ گیارہ بجے ڈیو کمانڈر جنرل اختر عبدالرحمن ہماری پلٹن کو ویزٹ کرنے آ رہے ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ آپ کو پتہ ہے کہ ہمارا سی او پلٹن سے باہر ہے۔ اِس لئے آپ جنرل صاحب کا ویزٹ ملتوی کرادیں۔ سی او کو جب مظفر آباد میں خبر ہوئی تو اُس نے بھی برگیڈ کمانڈر سے درخواست کی کہ اگر ایک دِن کیلئے ویزٹ ملتوی ہو جائے تو وہ واپس آ جائے گا۔ جب جنرل صاحب کو سارا معاملہ بتایا گیا تو اُنہوں نے یہ کہہ کر اُن کا مشورہ رد کردیا کہ ظفر کو آنے کی ضرورت نہیں۔ اِس چھوٹے سے ویزٹ کیلئے اُس کا ٹو آئی سی ہی کافی ہے۔ اگرچہ وقت کم تھا لیکن پھر بھی ہم سب نے مل جُل کر بجلی کی سی تیزی سے سب تیاریاں مکمل کر لیں۔ کچھ ہی دیر بعد ہمارے برگیڈ کمانڈر برگیڈیئر نصیر احمد بھی پہنچ گئے۔ جنرل صاحب کا ہیلی کاپٹر ٹھیک وقت پر پلٹن کے پریڈ گراؤنڈ میں میں آ کر لینڈ کرگیا۔ برگیڈ کمانڈر صاحب نے جنرل صاحب کا استقبال کیا۔ اِس کے بعد جنرل صاحب نے پلٹن کے سب آفیسروں اور جونیئر کمیشنڈ آفیسروں سے باری باری مصافحہ کیا۔ اور پھر تمام آفیسروں پر ایک حیرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے برگیڈ کمانڈر صاحب سے پوچھا:

Naseer! is their no major in this unit?

برگیڈ کمانڈر نے میری طرف اِشارہ کر کے کہا:

Sir captain Waheed was already a major but he lost his rank on some technical grounds. He has recently come from staff college. His papers are lying with me in Brigade HQ, which will be sent to you for approval in a day or so.

اِس کے بعد جنرل صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ وہ کونسی ٹیکنیکل وجہ تھی جس سے میرا رینک جاتا رہا۔ میں نے اُنہیں مختصراً بتایا تو اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

You may put on the rank. I will sign the papers.

اِس کے بعد جنرل صاحب نے ہماری پلٹن کے کوارٹر گارڈ اور جوانوں کی رہائش کا معائنہ کیا۔ وہ ہماری گارڈ کی ٹرن آؤٹ اور لائینوں کی صفائی سے بہت متأثر ہوئے۔ جنرل صاحب ہماری پلٹن کے دورے سے خوش وخرم واپس لوٹے اور جاتے جاتے مجھے شاباش کے ساتھ ساتھ میجر بھی بنا گئے۔

بھٹو صاحب کی اسلامی دھندلی

فروری کے آخر میں مجھے منگلا چھاؤنی میں فیملی اکاموڈیشن الاٹ ہوگئی۔ میں چھٹی لے کر گاؤں سے اپنے بچوں کو لینے چلا گیا۔ الیکشن مہم زوروں پر تھی۔ امیدواروں کا گاؤں میں تانتا بندھا رہتا۔ ۱۹۷۰ء کے اِنتخابات کا سا سماں تھا۔ وہی جلسے جلوس، وہی اشتہار بازی اور وہی جھنڈے اور وہی بینر۔ اس دفعہ پی پی پی کی تلوار کے مقابلے میں قومی اِتحاد کا اِنتخابی نشان ہل خاصا نمایاں تھا لیکن ۷ مارچ کو ووٹنگ کے بعد جب رات کو انتخابات کے نتائج کا اعلان ہونا شروع ہؤا تو سب لوگ سکتے میں آ گئے۔ ہر طرف پی پی پی کے نمائندے بھاری اکثریت سے کامیاب ہو رہے تھے۔ پی این اے کو قومی اسمبلی میں پی پی پی کی ۱۵۵ کے مقابلے میں صرف ۳۶ سیٹیں ملیں۔ حزبِ مخالف نے دھاندلی کا الزام لگاتے ہوئے ۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلیوں کے اِنتخابات کا بائیکاٹ کر دیا اور مطالبہ کیا کہ وزیرِاعظم مستعفی ہو جائیں اور فوج اور عدلیہ کی نگرانی میں نئے الیکشن کمیشن کے ذریعے از سرِنو انتخابات کرائے جائیں۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر ۱۴ مارچ تک اُن کے مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو وہ حکومت کے خلاف ملک گیر تحریک شروع کر دیں گے۔ بھٹو صاحب نے پی این اے کے بائیکاٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے پروگرام کے مطابق ۱۰ مارچ کو صوبائی اسمبلیوں کے اِنتخابات کروا کر نئے سرے سے مرکزی اور صوبائی حکومتیں قائم کروا دیں۔ پی این اے نے اپنے سابقہ اعلان کے مطابق حکومت کے خلاف ملک گیر تحریک شروع کر دی۔ حکومت نے پی این اے کے سرکردہ رہنماؤں کو زیرِ حراست لے لیا جس نے جلتی پر آگ کا کام کیا۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ ملک میں ہر طرف انتشار اور بدنظمی پھیل گئی۔ جذبات میں آ کر لوگ تشدد پر اُتر آئے۔ نت ہڑتالیں، نت جلوس۔ ہر طرف آتشزنی، لوٹ مار اور دنگا فساد کی وارداتیں ہونے لگیں۔ ملکی صنعت ٹھپ اور قومی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ امن وامان نافذ کرنے والے اداروں کے عملے کے افراد مظاہرین کے خلاف جب کوئی کارروائی کرتے تو لوگ اُن کو بُرا بھلا کہتے اور سڑکوں پر کھڑے ہو کر اذانیں دینے لگتے۔ ملک کے طول وعرض میں ایک قسم کا علمِ بغاوت بلند ہو چکا تھا۔ جس وقت حکومت اور پی این اے کے مابین اِس قسم کی آنکھ مچولی ہو رہی تھی ہم اپنا بوریا بستر منگلا چھاؤنی میں منتقل کرنے میں مصروف تھے۔ منگلا میں ایک دِن اِتفاقاً میری ملاقات

میجر ارشد سے ہوگئی۔ وہ وہاں کور ہیڈ کوارٹر میں ڈی کیو لگا ہؤا تھا۔ دونوں کو مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ ہم دونوں کی بیگمات کے بھی آپس میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ انہیں بھی اچھا ساتھ مل گیا۔ میں نے بچوں کو سکول میں داخل کروایا اور خود پھر پلٹن میں جا پہنچا۔

بھٹو صاحب کو یہ تو تسلیم تھا کہ اِنتخابات کے دوران بعض حلقوں میں قوانین کی خلاف ورزیاں اُن کے علم میں لائی گئی ہیں۔ اُن حلقوں میں دوبارہ اِنتخابات عمل میں لائے جاسکتے ہیں۔ لیکن پی این اے کی طرف سے لگائے گئے حکومتی سطح پر دھاندلی کے الزامات کو وہ کسی صورت بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ نہ تو وہ مستعفی ہونے کیلئے تیار تھے اور نہ ہی پی این اے کی شرائط پر دوبارہ اِنتخابات کرانے کیلئے۔ پچھلے دنوں اُن کے وزیر قانون، اُن کے یارِ غار اور ۱۹۷۳ء کے آئین کے موجد عبدالحفیظ پیرزادہ کا تیس سال بعد جنگ لندن کے سنڈے ایڈیشن میں ایک انٹرویو چھپا ہے۔ اُنہوں نے اِس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اِنتخابات میں دھاندلیاں کی گئیں تھیں اِسلیئے اُن کی حکومت کا کوئی اخلاقی جواز باقی نہ رہا تھا۔

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!!

بھٹو مخالف تحریک اُن چھوٹی چھوٹی تشدد پسند مذہبی جماعتوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی جنہیں عوام نے ہر الیکشن میں بری طرح سے رد کیا تھا۔ چنانچہ اِن ملّاؤں کے نظام مصطفیٰؐ کے نعروں اور بے وقتی اذانوں سے مرعوب ہو کر بھٹو نے سمجھا کہ شاید لوگ اُن کی سیکولر سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے پی این اے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ چنانچہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق ۱۷ اپریل کو اُنہوں نے ایک پریس کانفرنس منعقد کر کے فوری طور پر ایک اسلامی پیکیج کا اعلان کیا جس کی رو سے اِسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو، اتوار کی بجائے جمعہ کے روز ہفتہ وار تعطیل کے علاوہ شراب نوشی، گھڑ دوڑ سمیت ہر قسم کی قمار بازی، نائٹ کلبوں اور شراب خانوں پر پابندی لگادی گئی۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ پریس کانفرنس میں موجود جب ایک منچلے صحافی نے یہ سوال کیا کہ جناب اِسلامی نظام میں تو مغربی جمہوریت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا تو اِس پر بھٹو نے بلا توقف جواب دیتے ہوئے کہا: ''تو پھر مجھے امیر بنادو اور پارلیمانی نظام ختم کردو!'' یہ تھا بھٹو کا سیاسی فلسفہ! یعنی اقتدار صرف اور صرف انہی کے پاس رہنا چاہیئے۔ البتہ حصولِ اِقتدار کے طریقوں سے ان کو کوئی غرض نہ تھی۔ اُن کا یہ جواب یحییٰ خاں کے اِس مؤقف کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ جب فیلڈ مارشل ایوب خان نے اقتدار

اُس کے حوالے کیا تو بھٹو نے یحییٰ خان کو اُن کا سیاسی بازو بن کر ملک پر ڈکٹیٹر شپ کے ذریعے ربع صدی تک حکومت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ بہر حال (بھٹو کا)

''لوگوں کے مذہبی اِحساسات سے فائدہ حاصل کرنے کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔ پی پی پی کے لیڈروں کے شب و روز، اُن کا لائف سٹائل، دنیوی آن بان اور عیش و عشرت کا چسکا لوگوں کو خوب معلوم تھا۔ مذہب کے نام پر یہ اقدامات درحقیقت ایک سیاسی حربہ تھا جو ایک ڈانواں ڈول حکومت ازسرِ نو اپنا توازن قائم کرنے کیلئے اِستعمال کر رہی تھی۔ تین روز بعد مسٹر بھٹو نے جنرل محمد شریف کو بتایا کہ باوجود اِس کے کہ انہوں نے جنرل ضیاؑ کے مشورے پر اِسلامی حدود قوانین کا نفاذ کر دیا ہے پھر بھی پی این اے کی تحریک ویسے ہی جاری ہے۔ اُن کو یہ خبر نہ تھی کہ پی این اے کی تحریک کا سبب مذہب نہ تھا، سیاست تھی۔ لوگ ایک غیر جانبدارانہ انتظامیہ کی نگرانی میں نئے اور منصفانہ اِنتخاب چاہتے تھے۔''(۱۴۴)

مسٹر بھٹو کا اِسلامی کارڈ ناکام ہو چکا تھا۔ پی این اے نے ۲۱ اپریل کو ملک بھر میں پہیہ جام ہڑتال کی دھمکی دے رکھی تھی۔ قبل اِس کے کہ پی این اے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتا اُنہوں نے فوری طور پر آئین میں ترمیم کر کے کراچی، حیدر آباد اور لاہور میں منی مارشل لأ نافذ کر دیا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ ۱۹۷۳ء کے آئین کی منظوری کے وقت اُنہوں نے قومی اسمبلی میں تقریر کرتے وقت بڑے فخر سے یہ بات کہی تھی کہ ''آج ہمیشہ ہمیش کیلئے مارشل لأ ملک سے رُخصت کر دیا گیا ہے۔'' لیکن پانچ سال کے قلیل عرصہ کے اندر اندر ہی آج وہ خود ہی اپنے ہاتھوں پیدا کردہ بحران سے نکلنے کیلئے مارشل لأ کیلئے راستہ صاف کر رہے تھے۔

اُدھر پاکستان میں سیاسی تاریخ دہرائی جا رہی تھی۔ ادھر ہم پہاڑوں میں دھکے کھا رہے تھے۔ اپنی پلٹن میں میں اکلوتا میجر تھا اور ساری برگیڈ میں برگیڈ میجر کے علاوہ سٹاف کالج کوالیفائیڈ آفیسر بھی یہ ناچیز تھا۔ برگیڈ میں جہاں کہیں بھی میجر کے رینک کے آفیسر کی ضرورت پڑتی کرنل ظفر مجھے نامزد کروا دیتا۔ کبھی ایک پہاڑ پر اور کبھی دوسرے پر۔ کچھ دیر تو میں برداشت کرتا رہا لیکن جب پہاڑ چڑھ چڑھ کر میرے گھٹنے درد کرنے لگے اور میری بس ہوگئی تو مجبوراً مجھے باغ کے فیلڈ ہسپتال میں ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ میری حالت دیکھ کر اُس نے اُسی دِن (۱۱ مئی کو) مجھے مظفر آبادی سی ایم ایچ میں بھجوا دیا۔ وہاں پر میری ملاقات اپنے ایک پرانے واقف کار کرنل ریاض سے ہوگئی۔ وہ بھی میرا ہم مسلک تھا۔ اُسے جب میں نے اپنی بپتا سنائی تو اُس نے مجھے بتایا کہ ۱۹۷۴ء کے فیصلے کے بعد تو اچھی بھلی رپورٹیں رکھنے والے

احمدی افسروں کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی نہیں دی جا رہی۔ یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم اُس شخص کے زیرِ کمان لینڈ کر گئے ہو جو کٹڑ جماعتیہ ہے اور احمدیوں کے خلاف سخت تعصب رکھتا ہے۔ وہ کب یہ سفارش کرنے لگا کہ تمہیں کرنیل بنا دیا جائے۔ اسلئے اپنی زندگی خراب مت کرو۔ جب تمہیں جائز طور پر تکلیف ہے تو چپ کر کے اپنی میڈیکل کیٹگری ڈاؤن کراؤ اور باقی کی نوکری آرام سے کسی اچھے سے اِسٹیشن پر اپنے بال بچوں کے ساتھ کرو۔ مجھے اُس کا مشورہ پسند آیا۔ چنانچہ تین ہفتے کی طبی تفتیش کے بعد ۳۱ مئی ۱۹۷۷ء کو ایک میڈیکل بورڈ نے مجھے مستقل طور پر میڈیکل کیٹگری سی قرار دے دیا۔

اگرچہ میری ترقی کا راستہ مستقل طور پر بند ہو چکا تھا لیکن اب میں سکھ میں تھا۔ ویسے تو میڈیکل کیٹگری ڈاؤن ہونے کے بعد بھی کافی عرصہ تک اِس پہاڑی علاقے سے میری جان نہ چھوٹی لیکن اب مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا اسلئے کہ اب مجھے ایسی ڈیوٹی نہیں سونپی جا سکتی تھی جس کے سرانجام دینے کیلئے مجھے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنا پڑتا۔ اب میں سویلین ملازمین کی طرح صبح آرام سے تیار ہوتا۔ بڑے بڑے ایف ٹی بوٹس کی بجائے ہلکے پھلکے چمکدار آکسفورڈ شوز کیساتھ صاف ستھری کلف لگی کڑ کڑ کرتی وردی زیب تن کرتا۔ مزے سے میس میں ناشتہ کر کے اپنے دفتر میں جا بیٹھتا۔ باقی آفیسر حسبِ سابق دوپہر تک پریڈ گراؤنڈ یا ٹریننگ ایریا میں ہوتے۔ دفتر جا کر میں پہلے اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں دیکھتا اور پھر چھوٹی موٹی ڈاک نپٹا کر پھر اخبار یا کوئی کتاب پڑھنے لگ جاتا۔ اب میرے پاس وقت گزارنے کیلئے کام نہیں تھا۔

ایکشن ری پلے

ملک بدستور ہنگاموں کی زد میں تھا۔ لوگ مارشل لأ کی بھی خلاف ورزیاں کرنے پر اُتر آئے تھے۔ وہ فوجیوں کی گولیوں سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ فوجی جوان بھی اپنے بھائی بندوں پر گولی چلانے سے ہچکچانے لگے۔ ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر بعض اعلیٰ فوجی آفیسر مارشل لأ ڈیوٹی دینے کی بجائے اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے۔ بھٹو اب سٹپٹا گئے تھے۔ اِقتدار سے ہر حالت میں چمٹے رہنے کی کوشش میں وہ اُلٹے سیدھے اقدامات کرنے پر اُتر آئے۔ اُنہوں نے آئین میں مزید ایک ترمیم کر کے اِس امر کی گنجائش پیدا کر لی کہ وزیرِ اعظم اگر چاہے تو

اسمبلی کے ممبران سے اعتماد کا ووٹ لینے کی بجائے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے ریفرنڈم کے ذریعے براہ راست عوام کا مینڈیٹ حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اُن کا یہ منصوبہ بھی سرے نہ چڑھ سکا۔ پی این اے کے ساتھ ساتھ اب عوام بھی دلی طور پر چاہتے تھے کہ الیکشن دوبارہ کروا کر ملک کو روز روز کی چخ چخ سے نکالا جائے۔

تاریخ اپنے آپ کو پھر ایک دفعہ دہرا رہی تھی۔ آج سے آٹھ سال قبل ۱۹۶۹ء میں سیاسی پارٹیاں جمہوریت کی بحالی کیلئے ایوب خان کے خلاف برسر پیکار تھیں۔ ایوب خان اپنی ڈانواں ڈول حکومت کو قائم رکھنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ ہر حربہ ناکام ہو رہا تھا۔ مسٹر بھٹو کے مظاہروں سے ملکی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ اُن کا ایک ہی مطالبہ تھا۔ ''ایوب خان Step down! (اقتدار چھوڑ دو)''۔ ایوب خان نے ملک سے ایمرجنسی اُٹھانے کا اعلان کیا۔ بھٹو نے کہا: ''ایوب خان Step down! (اقتدار چھوڑ دو)''۔ ایوب خان نے اپوزیشن کے مطالبے کو منظور کرتے ہوئے اگرتلہ سازش کیس واپس لینے کا اعلان کیا۔ بھٹو نے کہا: ''ایوب خاں Step down! (اقتدار چھوڑ دو)'' ایوب خان نے اعلان کیا کہ وہ آئندہ انتخابات میں صدارتی اُمیدوار نہیں ہونگے۔ بھٹو نے کہا: ''ایوب خاں Step down! (اقتدار چھوڑ دو)'' ایوب خاں نے تمام اپوزیشن لیڈروں کو گول میز کانفرنس میں شمولیت کی دعوت دی۔ ڈی اے سی نے شمولیت کی حامی بھر لی مگر بھٹو نے بائیکاٹ کرتے ہوئے کہا: ''ایوب خاں Step down! (اقتدار چھوڑ دو)'' گول میز کانفرنس میں ایوب خاں نے سیاسی جماعتوں کے دو اہم مطالبات منظور کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ملک میں پارلیمانی جمہوری نظام کے قیام کیلئے آنے والے اِنتخابات براہِ راست ہوں گے۔ بھٹو نے کہا: ''نامنظور ایوب خاں Step down! (اقتدار چھوڑ دو)''۔

عجیب اِتفاق کی بات ہے کہ آج آٹھ سال بعد پھر وہی فلم چل پڑی۔ جو ایوب خان سے اقتدار چھوڑنے کا مطالبہ کر رہے تھے آج انتخابات میں دھاندلی کے الزام میں خود اُن سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اقتدار چھوڑ دیں اور عدلیہ فوج کی نگرانی میں دوبارہ الیکشن کرائے۔ بھٹو نے اعلان کیا کہ جن انتخابی حلقوں میں دھاندلی ثابت ہو وہاں پر دوبارہ انتخابات کرائے جائیں گے۔ پی این اے نے کہا: ''بھٹو Step down! (اقتدار چھوڑ دو)'' مسٹر بھٹو نے مذہبی اِصلاحات کا اعلان کیا۔ پی این اے نے کہا: ''بھٹو Step down! (اقتدار چھوڑ دو)''

بھٹو صاحب نے جزوی طور پر مارشل لأ نافذ کیا۔ پی این اے نے کہا: ''بھٹو Step down! (اقتدار چھوڑ دو)'' بھٹو نے ریفرنڈم کرانے کی پیشکش کی۔ پی این اے نے کہا: ''نامنظور! بھٹو Step down! (اقتدار چھوڑ دو)''

''حزبِ مخالف کی روز روز کی تنقید سے تنگ آ کر ایوب خان کہتے تھے کہ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اپنے زیر کمان تمام تر وسائل کو بروئے کار لا کر میں اپنے سسٹم کا دفاع نہیں کروں گا وہ بہت بڑی بھول میں ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اُن کے سسٹم میں خامیاں ہوسکتی ہیں جنھیں دور کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن حزبِ مخالف کے اعتراضات آئین کے اندر رہ کر حل ہونے چاہئیں۔'' (۱۴۵)

بھٹو کے بھی حزبِ مخالف کے لیڈروں کے بارے میں کچھ اِسی قسم کے خیالات تھے۔ جس آئین کی وہ آئے دِن دھجیاں بکھیرتے رہتے تھے اُس کی حفاظت کے بارے میں اُنھوں نے جنرل ضیاء سے کہا:

''وہ پی این اے کے ساتھ ہر موضوع پر بات چیت کرنے کو تیار ہیں لیکن وہ اِنہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے کہ وہ آئین کو مسخ کرنے کی کوشش کریں۔ نہ تو وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہونگے اور نہ ہی قومی اسمبلی کے انتخابات دوبارہ کروائیں گے۔ اگر بدترین صورتِ حال پیدا ہو جائے تو وہ ملک کی دفاعی افواج سے کہیں گے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کریں لیکن وہ پی این اے کے کسی بھی لیڈر کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔'' (۱۴۶)

اکتوبر ۱۹۵۸ء کو سکندر مرزا نے اپنے اِقتدار کو دوام بخشنے کیلئے جنرل محمد ایوب خان کو ملک میں مارشل لأ لگانے کیلئے کہا۔ ۱۹۶۹ء میں ایوب خان نے بھی یحییٰ خاں سے اِسی قسم کا معاملہ کرنے کی کوشش کی اور اب دو دہائیوں کے بعد بھٹو بھی وہی نسخہ آزمانے کے چکر میں تھے۔ لیکن جنرل ضیأ الحق تو اپنے سابقہ مرشدوں سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ وہ اُن کا بھی اُستاد نکلا۔

اِس فلم کا ڈراپ سین دلچسپ بھی تھا اور سنسنی خیز بھی۔ اِسلئے کہ اِس کے اہم کردار کم وبیش وہی پرانے جانے پہچانے چہرے تھے۔ ایوب خان کی نیم جمہوری حکومت کو برطرف کروا کر مارشل لأ کی راہ ہموار کرانے والے گھاگ سیاست دانوں میں سے آنجہانی نوابزادہ نصر اللہ خاں، ائر مارشل اصغر خان، ولی خان اور ذوالفقار علی بھٹو محض پانچ سالہ عوامی جمہوری حکومت سے بیزار ہو کر اب پھر فوجی انقلاب کی راہ ہموار کر رہے تھے۔

۳ جون سے اگرچہ پی این اے کے ممبران حکومت کے ساتھ مذاکرات پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن اُن کے مطالبات روز بروز عوامی لیگ کے نکات کی طرح دِن بدِن بڑھتے جا رہے

تھے۔ حکومت کو پس قدم ہوتے دیکھ کر اب وہ اُس سے زیادہ سے زیادہ مراعات بٹورنے کے چکر میں تھے۔ اسی کشمکش کی وجہ سے بعض دفعہ مذاکرات تعطل کا شکار ہو جاتے لیکن اگلے ہی دن پھر خبر چھپتی کہ اس سلسلے میں مزید پیش قدمی ہوئی ہے۔ اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے عوام تک لمحہ لمحہ کی خبریں پہنچتی رہتیں تھیں۔ پیپلز پارٹی کی انتخابات میں دھاندلی کی وجہ سے ملک ایک دفعہ پھر شدید ترین ہنگاموں کی زد میں تھا۔ وہی ملاں جو آج سے تین سال قبل احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے پر بھٹو کی بلائیں لے رہے تھے آج اُس کے خون کے پیاسے تھے۔ اُن سب کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا۔ ''بھٹو اقتدار چھوڑ دو!!''

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو میں منگلا چھاؤنی میں تھا۔ گرمی اپنے زوروں پر تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم بچوں کو لے کر کمرے میں بند تھے۔ پانچ بجے شام کے قریب جب گرمی کا زور ذرا کم ہوا تو نہا دھو کر ٹیلی ویژن آن کیا اور شام کی چائے کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں چھ بجے کی خبریں شروع ہو گئیں۔ معمول کی خبروں کے بعد اچانک نیوز کاسٹر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''آج صبح مسلح افواج نے ملک کا نظم و ضبط سنبھال لیا ہے۔ فوجی ترجمان کے مطابق پی پی پی کے چند لیڈروں بشمول وزیر اعظم اور پی این اے کے رہنماؤں کو حفاظتی حراست میں لے لیا گیا ہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاءالحق اس بارے میں آج شام سات بجے قوم سے خطاب کریں گے۔''

باب ۱۷

اور فوج پھر آ گئی

یہ خبر سن کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی۔ حکومت اور پی این اے کے ترجمانوں مولانا کوثر نیازی اور پروفیسر غفور احمد نے مشترکہ پریس کانفرنس میں اعلان کیا تھا کہ تمام متنازعہ امور پر اتفاقِ رائے ہو گیا ہے اور پی این اے کی طرف سے پیش کئے گئے ترمیم شدہ ڈرافٹ کی بنیاد پر ایک معاہدہ بھی تیار کیا جا چکا ہے جس پر ایک دو دِن میں پی این اے کی سنٹرل کمیٹی سے منظوری ملنے پر دستخط ہو جائیں گے۔ بہر حال ہم لوگ بڑی بیتابی سے جنرل ضیاءؔ کے خطاب کا اِنتظار کرنے لگے۔ ٹھیک سات بجے جنرل محمد ضیاء الحق اپنے مخصوص بھڑکیلے فوجی لباس میں ٹیلیویژن کی سکرین پر نمودار ہوئے۔ سابقہ حکومتوں کی روایات کے برعکس قومی ترانے کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کی گئی۔ اِس کے بعد انہوں نے نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم بسم اللہ الرحمن الرحیم سے اپنے خطاب کا آغاز کیا۔ اُن کی تقریر کا لبِ لباب یہ تھا کہ سیاستدانوں کی آپس کی معرکہ آرائی نے ملک میں خانہ جنگی کے سے حالات پیدا کر دئے ہیں۔ ملک کی سلامتی کو خطرہ ہے۔ چنانچہ جو خلاء سیاسی لیڈروں نے پیدا کیا ہے اُس کو پُر کرنے کیلئے اُنہیں مجبوراً اِقتدار اپنے ہاتھوں میں لینا پڑا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اُن کے کوئی سیاسی عزائم نہیں۔ وہ اِسلام کے سپاہی ہیں۔ اُن کا واحد مقصد ملک میں آزادانہ اور منصفانہ اِنتخابات کرا کر تین ماہ کے اندر اندر اقتدار ملک کے منتخب نمائندوں کے حوالے کرنا ہے۔ اُنہوں نے قوم کو یقین دلایا کہ وہ اِس پروگرام سے انحراف نہیں کریں گے۔ چاہ کن را چاہ در پیش۔ جیسا کرنا ویسا بھرنا۔ مارچ ۱۹۶۹ء میں جس طرح ڈی اے سی

کے ممبران نوابزادہ نصراللہ خان، اصغر خان، مفتی محمود اور ولی خان وغیرہ اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے مابین گول میز کانفرنس کی کامیابی کو بھٹو نے سبوتاژ کرا کر ملک میں مارشل لاء لگوا دیا تھا آج آٹھ سال بعد بعینہٖ اصغر خان اور بیگم نسیم ولی خان نے پی این اے کے ممبران نوابزادہ نصراللہ خان، مفتی محمود اور پروفیسر غفور احمد اور بھٹو کے مابین سہالہ مذاکرات کی کامیابی کو سبوتاژ کرا کر ضیاءالحق کو مارشل لاء لگانے کا جواز فراہم کر دیا تھا۔ خدا کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اگلے دن جب میں پلٹن پہنچا تو ہمارا کیمپ سنسان پڑا تھا۔ صرف چند ایک لوگ حفاظتی ڈیوٹی کیلئے موجود تھے۔ میرے آنے کی اطلاع پا کر صوبیدار میجر بھی آ گئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ پلٹن تو مری میں مارشل لاء ڈیوٹی پر ہے۔ میں نے کہا کہ اگر مجھے منگلا فون کر دیا ہوتا تو میں ہاڑی گیل آنے کی بجائے مری میں پلٹن کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ اِس پر اُنہوں نے مجھے بتایا کہ کرنل صاحب حکم دے گئے تھے کہ آپ جب واپس آئیں تو یہیں کیمپ میں ریئر پارٹی میں ٹھہریں۔

چند دِن بعد مجھے بھی مری جانا پڑا۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ مارشل لاء کے تحت گرفتار کردہ حکومت اور پی این اے کے رہنما جنہیں جنرل ضیاءؔ کے بقول حفاظت میں لیا گیا تھا، ہماری پلٹن کی تحویل میں تھے۔ حکومتی پارٹی کے سرکردہ لیڈروں میں سے شیخ رشید، مولانا کوثر نیازی اور ٹکا خاں پنجاب ہاؤس مری میں تھے اور پی این اے کے نو میں سے چھ ستاروں یعنی مفتی محمود، پروفیسر غفور احمد، مولانا شاہ احمد نورانی، ائر مارشل اصغر خان، شیر باز مزاری اور نوابزادہ نصراللہ خان کو سندھ ہاؤس میں رکھا گیا تھا۔ مسٹر بھٹو اور اُن کے ملٹری سیکرٹری کو پورے اعزاز کے ساتھ گورنمنٹ ہاؤس میں نظر بند کیا گیا تھا۔ پنجاب ہاؤس ایک چھوٹی سی ٹیکری پر واقع ہے۔ وہاں سے مری کی وادی کا وہ حصہ جہاں پر نشیب میں سندھ ہاؤس واقع ہے صاف دکھائی دیتا ہے۔ اِس طرح ہماری پلٹن اِن تین جگہوں پر حفاظتی ڈیوٹی پر بٹی ہوئی تھی۔ پہلے چند دِنوں تک کِسی ملاقاتی کو زیرِ حراست لیڈروں سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ بتدریج پابندیاں نرم ہوتی گئیں اور ملاقاتیوں کو مقررہ اوقات میں نظر بندوں سے ملنے کی اجازت مل گئی۔

چند دِن بعد حفیظ پیرزادہ، ممتاز بھٹو اور غلام مصطفیٰ کھر کو بھی ایبٹ آباد سے پنجاب ہاؤس مری میں منتقل کر دیا گیا۔ پیرزادہ صاحب جب ایبٹ آباد سے آئے تو بڑے غصے میں

دکھائی دیتے تھے۔ اُن کی آنکھ پر ابھی تک نیل پڑا ہوُا تھا۔ آتے ہی چیخ کر بولے: ''کہاں ہیں وہ گیدڑ؟'' اور پھر غصے میں اُس کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے جہاں سے پنجاب ہاؤس دکھائی دیتا تھا اور بلند آواز سے اپنے آپ سے کہنے لگے: ''لاؤ میری بندوق! میں اِن سب کو شوٹ کرتا ہوں۔'' اور پھر دائیں ہاتھ کو پستول بنا کر مُنہ سے ٹھشوں ٹھشوں کی آوازیں نکال کر بظاہر پی این اے والوں کو نشانہ بنانے لگے۔ مجھے اُن کی یہ حرکت بڑی بچگانہ سی لگی۔ ویسے بھی میں نے اُنہیں بد اخلاق اور متکبر پایا۔ مجھے فرداً فرداً کم وبیش ہر لیڈر سے بات کرنے کا اتفاق ہوُا۔ باقی سب ہی بھلے انسان تھے۔ درازی عمر کی وجہ سے آجکل تو بھلے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ جنرل ٹکا خاں (مرحوم) اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت کرے! سادہ منش، سیدھے سادھے، ہشاش بشاش قسم کے اِنسان معلوم ہوتے تھے۔ وہ علی الصبح باقی سب سے پہلے نہا دھو کر فوجی طریقہ سے سول ڈریس میں ملبوس، سیاہ چشمہ لگائے ڈائنگ روم میں آ کر ناشتہ کرنے کیلئے کھانے کی میز بیٹھ جاتے اور ناشتہ کے بعد اُس وقت تک بیٹھے رہتے جبتک دوسرے ساتھی بھی آ کر ناشتہ نہ کر لیتے۔ میں نے جب اُنہیں اپنا تعارف کرایا تو اُنہیں یاد آ گیا کہ میں ہی وہ آفیسر ہوں جسے اُنہوں نے دو سال قبل دوبارہ سٹاف کالج کیلئے نامزد کیا تھا۔ اُنہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں نے سٹاف کورس مکمل کر لیا تھا۔

مولانا کوثر نیازی خاموش طبع لیکن خوش خلق اِنسان تھے۔ صبح سویرے لیموں کا قہوہ پینے کے عادی تھے۔ اِتفاق سے جس وقت میں اُن سے مِلا تو وہ قہوہ نوش فرما رہے تھے۔ سلام دُعا کے بعد اخلاقاً مجھ سے بھی پوچھا کہ آیا میں بھی قہوہ پینا پسند کروں گا؟ میں نے شکریہ کے ساتھ معذرت چاہی۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں سیالکوٹ کے حلقہ پسرور سے احمدیوں کی حمایت سے کامیاب ہوئے۔ بلند پائے کے خطیب تھے۔ اُن دنوں احمدیوں کے حق میں خطبے دیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اُن کا ایک خطبہ سننے کا موقع ملا۔ الیکشن کے دنوں میں بھی جیل میں تھے۔

شیخ رشید صاحب عمر رسیدہ اور جسمانی لحاظ سے سب سے نحیف و لاغر نظر آتے تھے۔ عموماً خاموش اور چپ چاپ رہتے۔ فلاسفروں کی طرح بکھرے بکھرے بال اور دن رات ایک ہی شلوار قمیص میں ملبوس رہتے۔ قمیص کے بٹن گرمی کی وجہ سے کھلے رکھتے۔ ممتاز بھٹو کو میں سنجیدہ مگر خندہ پیشانی سے پیش آنے والا انسان پایا۔ اُنہوں نے اپنا ڈیک اپنے بستر کے ساتھ میز پر سیٹ کروا رکھا تھا۔ میوزک کے شوقین لگتے تھے۔ اُن کے ڈیک کا دھیما دھیما

میوزک اُن کو لوری دے کر سلاتا اور اُسی کی دھن میں وہ صبح کو آنکھ کھولتے۔ مصطفیٰ کھر پر اُن دنوں یوگا کا بھوت سوار تھا۔ وہ صبح سویرے اپنی ٹانگیں باری باری اپنی گردن پر چڑھا کر اُن کے جوڑ رواں کرتے رہتے۔ اور ہم سے جب کوئی بھی اُن سے ملنے جاتا تو اُن کا سب سے پہلا سوال یہ ہوتا: "آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" کھر صاحب نے اتنی ساری شادیاں رچائیں مگر اِن دنوں اُن سے ملاقات کیلئے کوئی نہ آیا۔

حفیظ پیرزادہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ہم فوجیوں کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گرفتاری کے وقت کسی منچلے فوجی نے اُن کی ٹھکائی کی تھی۔ اُن کی بیگم سعدیہ پیرزادہ کا پاؤں اُن دِنوں بھاری تھا۔ وہ بے چاری اِسی حالت میں تقریباً ہر روز اِسلام آباد سے اُن کی ملاقات کیلئے آتیں۔ اُن کے ساتھ ایک بید کی بڑی سی ٹوکری ہوتی جِس میں وہ اپنے میاں کیلئے گھر سے کھانا تیار کر کے لاتیں۔ گیٹ پر موجود ڈیوٹی آفیسر کو ہدایت تھی کہ ہر ملاقاتی کی تلاشی لے کر اندر جانے دیا جائے۔ پہلے دِن جب اُن کی تلاشی لی گئی تو بیگم صاحبہ کو کچھ ناگوار سا گزرا۔ بعد میں وہ خود ہی خاموشی سے ٹوکری لا کر ڈیوٹی آفیسر کے سامنے رکھ دیتیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ پیرزادہ صاحب مرغن کھانوں کے شوقین تھے۔ بعد میں پیرزادہ کو چھوڑ کر کھر صاحب سے شادی رچالی۔ جنرل کے ایم عارف پیرزادہ کی گرفتاری کا منظر بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب ضیاؑ کے ہمراہ میں لکھتے ہیں:

"اس طرح بغیر گولی چلائے آپریشن کی تکمیل ہوگئی۔ صرف مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ کے ملازم کو ایک تھپڑ مارنا پڑا، وہ بھی یہ معلوم کرنے کیلئے کہ آیا صاحب گھر میں موجود ہیں کہ نہیں۔ پہلے اُن کے دروازے پر زور زور سے دستک دی گئی۔ اور جب کِسی نے دروازہ نہ کھولا تو اُسے توڑ دیا گیا۔ مسٹر پیرزادہ اپنے مطالعہ کے کمرے میں پائے گئے۔ خوف کے مارے اُن کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کچھ لمحہ بعد جب اُن کے اوسان بحال ہوئے تو اُنہوں نے مسٹر بھٹو کی سلامتی کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی دریافت کیا کہ آیا فوج میں کِسی قسم کی پھوٹ تو نہیں پڑی۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ اپنے سلیپر اور سگریٹ کی ڈبیہ اوپر کی منزل سے لانا چاہتے ہیں۔ گرفتار کرنے والے آفیسر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اِسلئے اس نے پیرزادہ کو اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ پیش کی اور اُنہیں نکال کر باہر لے آیا۔"

اِس کے برخلاف فوج میں جو عام افواہ گرم تھی اُس کے مطابق گرفتار کرنے والے آفیسر نے جب اُنہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو اُنہوں نے غصے میں ٹیلیفون کرنے کی کوشش کرتے

ےَ اُسے دھمکی دی کہ وہ اُس کی وردی اُتروا دیں گے۔ اِس پر اُس آفیسر نے اُن کے مُنہ ایک ایسا مکا رسید کیا جس کا نشان مصنف نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بہرحال مشرف ر میں اُن کی فوج سے گاڑھی چھنتی رہی۔ وہ جنرل مشرف کے قانونی مشیر بھی رہے۔

حکومتی پارٹی کیلئے اِقتدار سے علیحدگی پر غم و غصے کا مظاہرہ کرنا ایک فطری عمل تھا۔ وسری طرف معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اِس کے کچھ دِن بعد مجھے سندھ ہاؤس جانے کا تفاق ہوا۔ کوئی گیارہ بجے دِن کا وقت تھا۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر سب لوگ گول کمرے یں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ مفتی محمود کے صاحبزادے فضل الرحمٰن اُن کو ملنے آئے ہوئے تھے۔ ماحول خاصا غیر رسمی تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی اپنے مخصوص لباس میں ایک صوفے پر آلتی پالتی مارے خوب چہچہا رہے تھے۔ پان سے اُن کے ہونٹ سرخ ہو رہے تھے۔ مونچھیں چٹ اور لمبی لمبی گدری ڈاڑھی۔ اُن کے ساتھ والے صوفے پر پروفیسر غفور احمد چپ چاپ بظاہر نورانی صاحب کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اصغر خان صاحب کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔ میں نے حاضر ہو کر سب کو سلام کیا۔ لمحہ بھر کیلئے خاموشی طاری ہوگئی۔ میں نے اُن کی گفتگو میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اِسلئے خاموشی سے ایک طرف ہو کر چل دیا۔ نورانی صاحب پھر چہچہانے لگے۔ مارشل لاء کے نفاذ سے وہ بہت خوش نظر آتے تھے۔ وہ سندھ ہاؤس کی طرف اِشارہ کر کے بڑے فخر سے کہہ رہے تھے: ''ہونہہ! آئے تھے گھر سے حکومت کرنے۔ لگوا دیا نا مارشل لاء۔''

مجھے مری میں آئے چار پانچ دِن ہو گئے تھے مگر کرنل ظفر مجھے کوئی ذمہ داری نہ دے رہے تھے۔ باوجودیکہ پلٹن میں میرے سوا اور کوئی میجر نہ تھا لیکن مجھے اُنہوں نے بالکل نظر انداز کر رکھا تھا جو میرے لئے بڑی کوفت کا باعث تھا۔ ایک دِن جب میں نے اِس بارے میں اُن سے بات کی تو اُنہوں نے مجھے کھل کر بتا دیا کہ اوپر سے حکم ہے کہ مجھے اِس آپریشن سے علیحدہ رکھا جائے۔ بلی بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ مجھے اور کیا چاہیئے تھا میں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ۱۲ ڈویژن کی آفیسر میس میں دو کمرے بُک کرائے اور منگلا سے بچوں کو گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کیلئے یہاں بلا لیا۔ خوب رونق ہوگئی۔ جِس وقت باقی پلٹن سیکورٹی ڈیوٹی میں مصروف تھی ہم مری کے صحت افزا مقام پر چھٹیاں منا رہے تھے۔ ہم اپنی جگہ خوش کرنل ظفر اپنی جگہ خوش۔ ہم نے مری کی خوب سیر کی۔ بچوں کو تمام قابلِ دید مقام دکھائے۔

ایک روز ہم مال روڈ کی سیر کر رہے تھے۔ بعد دوپہر کوئی ڈھائی تین بجے کا وقت تھا۔ آسمان پر سفید بادلوں کی ٹکڑیاں روئی کے گالوں کی طرح تیر رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے موسم میں گرمی کے باوجود جونہی بادل کا کوئی ٹکڑا سورج کو اپنی آغوش میں لیتا یکا یک موسم میں خنکی آجاتی۔ سیاحوں اور چھٹیاں گزارنے والوں کا تانتا بندھا ہُوا تھا۔ ہر دکان پر سوونیئر خریدنے والوں کا جمگھٹا لگا دکھائی دیتا۔ کھوے سے کھوہ چھل رہا تھا۔ ہماری بڑی بیٹی فرح اُسوقت کوئی ساڑھے چار سال کی تھی۔ سرخ وسفید چین کی گڑیا جیسی۔ اُس نے سفید پتلون اور گلابی رنگ کی خانے دار بشرٹ پہن رکھی تھی۔ گرمی کی وجہ سے سر پر کھجور کے پتوں کا خوبصورت فیلٹ ہیٹ اور پتلوں کے پائنچے نیچے سے پنڈلیوں تک فولڈ کئے ہوئے تھے۔ میں نے ہما کو اُٹھایا ہُوا تھا اور فرح نے اپنی امی کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ اختر حسب عادت کبھی ایک دکان میں گھس جاتی اور کبھی دوسری میں۔ مجھے چونکہ خرید وفروخت سے کوئی دلچسپی نہ تھی اِس لئے میں دکان کے باہر کھڑا ہو جاتا۔ اچانک جب وہ ہینڈی کرافٹ کی دکان سے باہر نکلیں تو میں نے دیکھا کہ فرح اُن کے ساتھ نہ تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ نہ ملی۔ افراتفری میں ہم سب اُسے ادھر اُدھر دکانوں میں ڈھونڈنے لگے لیکن وہ ہمیں کہیں نظر نہ آئی۔ ہم سب کے حواس باختہ ہوگئے۔ آپا قیوم کی تو جان ہی نکل گئی۔ آخر میں نے سب کو اکٹھا کر کے ایک جگہ بٹھایا اور خود اُسے مال روڈ پر تلاش کرنے کیلئے چل پڑا۔ تلاش کرتے کرتے میں اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔ جب ذرا رش کم ہُوا تو مجھے اپنے آگے سو گز کے فاصلے پر فرح نظر آئی۔ وہ سر جھکائے سڑک کے ساتھ ساتھ ۱۲ ڈویژن کی میس کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے بھاگ کر اُسے اُٹھا کر اپنے سینے سے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دنیا و مافیہا سے بے نیاز میں اُسے پاگلوں کی طرح پیار کر رہا تھا۔ لوگ مجھے حیرت سے دیکھتے اور مسکرا کر گزر جاتے۔ اُنہیں کیا پتہ تھا کہ اِن چند لمحوں میں ہم پر کیا قیامت گزر گئی تھی۔ جب ذرا اُس کی سسکیاں رکیں تو اُس نے مُنہ بسورتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا: ''میں گھچے چے جارئی چھی۔'' یعنی میں غصے میں جا رہی تھی۔ میں اُسے لیکر واپس آیا تو سب کی جان میں جان آئی۔

اپنے ساتھی افسروں سے مجھے بھٹو اور اُن کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں خبریں ملتی رہتیں۔ بعض دفعہ تو اُن کے خلاف ایسی ایسی غلط قسم کی خبریں ہوتیں جو بالکل بیہودہ اور ناقابلِ یقین تھیں۔ مثال کے طور پر ایک دِن مجھے پلٹن کے ایجوٹنٹ کیپٹن وجیہ الدین نے بتایا کہ بھٹو

کے ایک ملاقاتی کی جب تلاشی لی گئی تو اُس کے سامان میں سے ننگی عورتوں کی تصویریں اور بلو فلمیں برآمد ہوئیں۔ اور یہ کہ مسٹر بھٹو اپنے وزیروں کے ساتھ میٹنگ کے بہانے مل کر بلو فلمیں دیکھتے ہیں۔ پلٹن کے جونیئر آفیسر بعد میں میس میں بیٹھ کر کرنل ظفر کی موجودگی میں بھٹو اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں عجیب عجیب چٹ پٹی باتیں بیان کر کے چسکے لیتے۔ اللہ جانتا ہے کہ سچ تھا یا کسی خاص منصوبے کے تحت اُن کے فوج میں کسی ممکنہ اثر و نفوذ کو کم کرنے کی ایک کوشش تھی۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ برخلاف اس کے حزبِ اختلاف کے رہنماؤں کے ساتھ نہایت ہی عزت و احترام کا سلوک روا رکھا جاتا اور نہ ہی اُن کے خلاف کسی قسم کا منفی پروپیگنڈہ کیا جاتا۔ چنانچہ جنرل کے ایم عارف نے بھی اِسی پراپیگنڈے کو بنیاد بنا کر اپنی کتاب ضیاؑ کے ہمراہ میں اِس کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پی پی پی اور پی این اے کے رہنماؤں کی اس سہ ہفتہ گرفتاری نے فوجی حکام کو اُن لوگوں کے روزمرہ کے معمولات کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم ہوا۔ کہنے کو تو قیدی تھے لیکن اُن کو بڑی تکریم کے ساتھ سرکاری مہمانوں کی طرح رکھا گیا۔ بطور گروپ پی این اے کے لیڈروں کا طرزِ بود و ماند بہت سادہ تھا۔ سیاسی مباحث کے ساتھ ساتھ ان صاحبان کا زیادہ وقت طعام کے معیار و مقدار سے متعلق نکتہ آفرینیوں میں گزرتا تھا۔ اِس کے برعکس پی پی پی کے اکابرین بھی سیاسیات پر تو خاصی گرما گرم بحث کرتے۔ لیکن چسکہ کے طور پر ان میں سے اکثر سابق صاحبانِ بست و کشاد کھانے سے قبل مے و مینا کی چسکی کے عادی تھے اور بعض اہلِ دِل تو طعام شب کے بعد فحش اور برہنہ فلمیں دیکھے بغیر شب بسری نہ کر سکتے۔ ان بالانشینوں کو یہ من پسند مواد پنجاب ہاؤس کا نچلا سٹاف مہیا کرتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔"

اگر ساری تحریر کا بغور تجزیہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنرل عارف نے بھی جانبداری سے کام لیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بھٹو کے علاوہ اُن کی پارٹی کے باقی لیڈروں کو پنجاب ہاؤس میں رکھا گیا تھا۔ جنرل عارف کے مطابق پی این اے والے تو با جماعت نمازیں پڑھتے تھے لیکن پی پی پی والے شراب کباب اور فحش فلموں سے دل بہلاتے تھے۔ اور یہ سب سامان اُنہیں پنجاب ہاؤس کا نچلا سٹاف مہیا کرتا تھا۔ افسوس ہے جرنیل عارف کی منطق پر۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے ہماری پلٹن کا اِن تینوں ریسٹ ہاؤسز کے گرد اتنا سخت پہرہ تھا کہ سویلین سٹاف تو کیا وہاں پر تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اِس بات کا تو میں خود شاہد ہوں کہ سعدیہ پیرزادہ کی کھانے والی ٹوکری تک کی تلاشی لی گئی۔ اگر بغیر تلاشی

کے گھر سے لایا ہوُا کھانا اندر نہیں جا سکتا تھا تو فحش فلمیں کیسے اندر چلی گئیں۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے پنجاب ہاؤس میں پیر زادہ مصطفےٰ کھر اور ممتاز بھٹو کے علاوہ ٹکا خان، شیخ رشید اور مولانا کوثر نیازی بھی تھے۔ کیا اِن تینوں بزرگوں کی موجودگی میں فحش فلمیں دیکھی جاتی سکتی تھیں۔ یہ الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ اسلئے کہ پنجاب ہاؤس میں سوائے ملاقاتیوں کے متعلقہ فوجیوں کے علاوہ سب کا داخلہ ممنوع تھا۔

گورنمنٹ ہاؤس جہاں بھٹو صاحب نظر بند تھے اُس پر تو اِتنا سخت پہرہ تھا کہ جتنے دِن بھٹو وہاں پر نظر بند رہے اُتنے دِن مجھے بھی گیٹ سے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ کرنل ظفر خود وہاں پر موجود رہتا اور بھٹو کی ہر ضرورت کا خیال اُن کے ملٹری سیکریٹری جنرل امتیاز رکھتے۔ ہو سکتا ہے بھٹو کی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے فوج والے اُنہیں شراب بھی مہیا کرتے ہوں۔ مگر یہ کہنا کہ یہ چیزیں نچلے سٹاف کے ذریعے سمگل ہو کر اُن تک پہنچتی تھیں غلط اور بے بنیاد ہے۔ ہمارے اپنے آفیسرز کا کہنا ہے کہ بھٹو کے کسی ملاقاتی سے بلیو فلمیں نہیں بلکہ برہنہ عورتوں کی تصویر برآمد ہوئیں۔ دونوں بیانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یہ سب کچھ بھٹو اور اُن کے وزرأ کو بدنام کرنے کیلئے کیا جا رہا تھا۔ جنرل عارف نے تو کِسی ممکنہ ردِعمل کے اندیشے سے بھٹو یا اُن کے رفقأ میں سے کِسی کا براہِ راست نام لینے کی بھی جرأت نہیں کی۔ "سابق صاحبانِ بست و کشاد" میں تو جنرل ٹکا خان، مولانا کوثر نیازی اور شیخ رشید بھی شامل تھے۔

۲۸ جولائی کو سیاسی قیدی رہا ہو گئے اور پلٹن واپس کیمپ میں پہنچ گئی۔ کچھ دنوں بعد رمضان شروع ہو گیا۔ میں نے چونکہ رمضان میں عید سے پہلے چھٹی کاٹ لی تھی اِسلئے عید الفطر کے موقع پر پلٹن میں ٹھہرنے کا حکم ہوُا۔ کمانڈنگ آفیسر سمیت باقی سب کے سب آفیسر عید پر چھٹی پر چلے گئے تھے۔ پلٹن کی پچاس فیصد سے زیادہ نفری کو اِس موقع پر چھٹی پر بھیجا جا چکا تھا۔ عید سے ایک دِن قبل پلٹن میں ٹامے ٹامے لوگ نظر آتے تھے۔ لیکن عید والے دِن بعد دوپہر تو یوں لگتا تھا جیسے کیمپ میں کوئی جِن پھر گیا ہو۔ ساری پلٹن غائب!! صرف کوارٹر گارڈ اور بیرکوں میں ایک ایک سنتری کے سوا باقی کوئی آدم زاد نظر نہیں آتا تھا۔ عام طور پر پلٹنوں میں ایسے موقعوں پر جشن منائے جاتے ہیں۔ عید کی شام ساری پلٹن مِل کر بڑا کھانا کھاتی ہے جِس میں سی او سمیت پلٹن کے تمام آفیسر بھی شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اِس پلٹن کا تو باوا آدم ہی

نرالا تھا۔ کرنل ظفر کی صرف ایک سال کی کمان نے ''لیپا ہیروز'' کو ''ہاڑی گیل کے گیدڑ'' بنا دیا تھا۔ اُس رات مجھے ٹھیک سے نیند بھی نہ آئی۔ اِسلئے کہ پلٹن میں سب سے سینئر میں تھا۔ اور اگر کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو ساری ذمہ داری مجھ پر ہوتی۔ ملک میں نظم و ضبط کی اگر حالیہ صورتِ حال ہوتی تو صرف چند ایک شرپسند اِن گنتی کے سنتریوں کو زیر کر کے پلٹن کا سارا اسلحہ لوٹ کر لے جاتے۔ خدا خدا کر کے دِن چڑھا۔ آہستہ آہستہ پہاڑی لوگ واپس آنے شروع ہو گئے۔ اور شام کو پلٹن میں پھر سے رونق نظر آنے لگی۔ تب کہیں جا کر میری جان میں جان آئی۔

باب ۱۸

آغازِ مکافات

مارشل لا حکومت کی طرف سے انتخابات کا اعلان ہو چکا تھا۔ انتخابی سرگرمیاں پھر سے شروع ہو گئی تھیں۔ پیپلز پارٹی کی جیت یقینی تھی۔ بھٹو نے ترنگ میں آ کر نعرہ مار دیا کہ دوبارہ اقتدار میں آ کر وہ آئین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیں گے۔ اُن کی منتقم مزاج خصلت سے سب لوگ بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ ایک طرف حزبِ اختلاف کے سیاست دانوں نے ضیاءالحق کو مشورہ دیا کہ اُس وقت تک انتخابات نہ کرائے جائیں جب تک بھٹو اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف احتساب کا عمل مکمل نہ ہو جائے دوسری طرف فوجی حکومت نے اپنے دفاع کیلئے اُنہیں اپنے راستے سے ہٹانے کیلئے اُن کے خلاف مقدمات بنانے کیلئے مواد اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۰ اور ۱۱ نومبر ۱۹۷۴ء کی رات کو احمد رضا قصوری کی گاڑی پر نامعلوم اشخاص نے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں اُن کے والد نواب محمد احمد خاں مارے گئے۔ احمد رضا قصوری نے رپورٹ درج کراتے وقت اُس وقت کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو اس قتل کے بڑے ملزم کے طور پر نامزد کیا۔ بھٹو کا اقتدار اُس وقت پورے عروج پر تھا اسلئے اُنہوں نے اس مقدمے کو بغیر کسی کارروائی کے داخل دفتر کروا دیا۔ جنرل ضیا نے اس مقدمے کی تفتیش از سرِنو شروع کرا دی۔ تفتیش کے دوران اِس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ فائرنگ ایف ایس ایف کے عملے نے اپنے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود کے حکم پر کی تھی۔ مسعود محمود نے وعدہ معاف گواہ کے طور پر اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے بیان کیا کہ

اُس نے بھٹو کے کہنے پر احمد رضا کو ٹھکانے لگانے کیلئے یہ حکم دیا تھا اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اُس کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔

چنانچہ ۳ ستمبر کو بھٹو کو نواب محمد احمد خاں کے قتل کی سازش کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۳ ستمبر کو لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس صمدانی نے استغاثہ کی شہادتوں میں تضادات کی بنا پر اُنہیں ضمانت پر رہا کر دیا لیکن چار دن بعد ۱۷ ستمبر کو اُنہیں مارشل لاء کے حکم کے تحت دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ کی سماعت کیلئے پانچ ججوں پر مشتمل لاہور ہائی کورٹ کا فل بنچ قائم کیا گیا جس کے صدر مسٹر جسٹس مولوی مشتاق احمد تھے۔ بھٹو نے بنچ کے صدر پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے الزام لگایا کہ وہ اُن سے ذاتی عناد رکھتے ہیں۔ اول اسلئے کہ اُنہوں نے اپنی حکومت کے دور میں اُنہیں سینئر ہونے کے باوجود لاہور ہائی کورٹ کا چیف جسٹس نہیں بنایا تھا۔ دوسرے یہ کہ جب ضیاءُ الحق نے اکتوبر میں ہونے والے اِنتخابات کے سلسلے میں مولوی مشتاق کو الیکشن کمشنر نامزد کیا تھا تو اُنہوں نے اُنہیں تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ لیکن اُن کا واویلا کسی نے نہ سنا، اِسلئے کہ مکافاتِ عمل کی چکی کا پہیہ اب حرکت میں آ چکا تھا جس کی رفتار روز بروز تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ چنانچہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اُن کے خلاف فردِ جرم عائد کر دی گئی۔ بھٹو کو اب شاید یہ یاد نہ رہا تھا کہ اپنے مخالفین کے خلاف اپنی مرضی کا فیصلہ کروانے کیلئے وہ خود تو پوری قومی اسمبلی کو بلیک میل کرنے سے بھی نہیں ٹلتے تھے۔ اب اگر اُن کے مقدمے کا فیصلہ کرنے کیلئے ضیاءُ الحق نے مولوی مشتاق کو لگا دیا تھا تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اُن کے ساتھ اور بھی تو چار جج تھے۔ عجیب اِتفاق ہے جتنا اِنسان کسی چیز سے خوفزدہ ہوتا ہے اُتنا ہی اُس کا اُس چیز سے واسطہ پڑتا ہے۔ بھٹو صاحب مولویوں سے اِس قدر خائف تھے کہ صرف اُن کا ڈنگ نکالنے کیلئے اُنہوں نے ایک بے ضرر مسلمان فرقے کو دائرۂ اِسلام سے خارج کروا دیا تھا۔ قدرتِ خدا کی اِس واقع کے محض تین سال بعد اللہ تعالیٰ نے اِنہی مولویوں کو پھر اُن کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اب کے اُن کا واسطہ ایک ایسے مولوی سے پڑا تھا جس کو اُن کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے کا اِختیار بھی دیا گیا تھا۔ موسیٰ ڈرے موت سے موت آ گے کھڑی!!

بہر حال ہمارے دِن بھی گزر رہے تھے۔ جس کیریئر کی خاطر آج سے پندرہ سال پہلے میں نے برطانیہ کا ورک پرمٹ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا وہ اب ختم تھا۔ ہم پر کسی قسم کا اعتماد نہیں کیا جا رہا تھا اور ضیاءُ الحق کے اِقتدار میں آنے کے بعد تو اِس رویے میں اور بھی شدت

آ گئی تھی۔ جماعت اسلامی کے نظریات کی ترویج کیلئے مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کا سیٹ ہر یونٹ میں رکھوا دیا گیا تھا۔ اس طرح اس جماعت کا اثر و رسوخ دن بدن فوج میں بڑھتا جا رہا تھا۔ سیاسی قیدیوں کی حفاظتی ڈیوٹی کے تین ہفتے کے دوران مجھے عملی طور پر ڈیوٹی سے علیحدہ رکھ کر ضیاء الحق کی آئندہ پالیسیوں کا پول کھل چکا تھا۔

شاہ ایران کی حکومت آخری سانسوں پر تھی۔ امام خمینی کی چودہ سالہ جلاوطنی رنگ لا رہی تھی۔ شاہنشاہیت کے خاتمے کیلئے جدو جہد کو تیز تر کرنے کے سلسلے میں اُن کی ولولہ انگیز تقاریر کی کیسٹیں اب عوام میں کھلے عام سنی جا رہی تھیں۔ شاہ کی خفیہ پولیس ساوک کا خوف لوگوں کے دلوں سے ماؤف ہو چکا تھا۔ غیر ملکی فوجی مشیر جن میں زیادہ تر امریکی تھے، پڑھے لکھے بیروزگار نوجوانوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے تھے۔ تہران میں آئے دِن مظاہرے ہو رہے تھے۔ شاہی افواج عوامی اِحتجاج کے سامنے بے بس دکھائی دیتی تھیں۔ عوامی جذبات کا آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔

بھٹو کو سزائے موت

بھٹو کے خلاف نواب محمد احمد کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کا مقدمہ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اُن کے وکیل صفائی یحییٰ بختیار کی قانونی موشگافیاں، اور خود اُن کا اپنا اکھڑ پن اور تضحیک آمیز رویّہ سب رائیگاں گئے۔ اُن کو اپنی بریّت اور دوبارہ اِقتدار میں آنے کا اِس قدر یقین تھا کہ وہ ججوں سمیت سب کا سر منڈھوا دینے کی علی الاعلان دھمکیاں دینے سے بھی گریز نہ کرتے۔ لیکن ان کی اِن دھمکیوں نے کوئی اثر نہ دکھایا۔ ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو فل بنچ کے تمام ججوں نے متفقہ طور پر اُنہیں مجرم قرار دے کر موت کی سزا سنا دی۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ مقدمے کا بڑا مجرم ذاتی اغراض کی بنا پر اِس مقدمے میں ملوث پایا گیا۔ اُس نے جو سازش احمد رضا قصوری کے قتل کیلئے تیار کروائی تھی وہ نواب محمد احمد کی موت پر ہی ختم نہ ہوئی بلکہ اِس کے بعد بھی جاری رہی۔ فاضل جج نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ مسٹر بھٹو ججوں کی بے عزتی کرتے رہے اور اُنہیں دھمکیاں بھی دیتے رہے۔ اُن کا رویہ نہایت غیر ذمہ دارانہ اور نامناسب رہا۔ اُنہوں نے مزید لکھا کہ وہ نام کا مسلمان اور عادی دروغ گو ہے۔ اُنہوں نے ذاتی اِنتقام کی آگ بجھانے کی خاطر اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لئے فیڈرل سیکورٹی

کے اراکین کو مجرموں اور قاتلوں میں تبدیل کر دیا۔

جس نہج پر مقدمہ چل رہا تھا اُس سے پتہ چل رہا تھا کہ بھٹو صاحب کو مولوی صاحب بخشیں گے نہیں لیکن چونکہ وہ براہِ راست قتل میں ملوث نہ تھے اِسلئے سزائے موت متوقع نہ تھی۔ چنانچہ عدالت کا فیصلہ سن کر ساری قوم سکتے میں آ گئی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ دلی ہمدردی ہونے کے باوجود سوائے اِکا دُکا واقعات کے اُن کی سزا کے خلاف ملک کے کسی حصہ میں بھی عوام نے کھلے بندوں گلیوں میں آ کر اِحتجاج نہ کیا۔ سزائے موت کے اعلان کے باوجود عوام الناس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُن کے محبوب لیڈر کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ البتہ وہ طبقہ جسے اُنہوں نے دائرۂ اسلام سے خارج کرا کر اپنے انتقام کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ جس کے خلیفہ کو حقیر جانتے ہوئے اُس کی جگہ اپنی طرف سے نیا خلیفہ نامزد کر دینے کا دعویٰ کیا تھا۔ اور جس کو امریکہ کے یہودیوں سے تشبیہ دیتے ہوئے اُس کے افراد کے ہاتھوں میں کشکول تھما دینے کی بڑ ہانکی تھی۔ اُس فرقہ کے علماءَ نے اپنے فرقے کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی کی آج سے نوے سال قبل مشتہر کردہ ایک پیشگوئی کی تعبیر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اس پیشگوئی کی رو سے بھٹو صاحب کا موت کے پھندے سے بچنا بظاہر محال دکھائی دیتا ہے۔

اس پیش گوئی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

''اور ابھی چند روز کا ذکر ہے کہ ایک شخص کی موت کی نسبت خدا تعالیٰ نے اعدادِ تہجی میں مجھے خبر دی جس کا ماحاصل یہ ہے کہ کلب'' یموتُ علیٰ کلب، یعنی وہ کتا ہے اور کتے کے عدد پر مرے گا جو باون سال پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی اُس کی عمر باون سال سے تجاوز نہیں کرے گی۔ جب باون سال کے اندر قدم دھریگا تب اُسی سال کے اندر اندر راہیٔ ملکِ بقا ہوگا۔'' (۱۴۷)

یہ بات ذہن میں یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس دِن بھٹو صاحب کو سزائے موت سنائی گئی تھی اُس دِن اُن کی عمر پچاس سال اور ساڑھے تین ماہ تھی۔ اگر اُن کو اسی سال کے اندر اندر پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تو مرزا صاحب کی پیشگوئی اُن پر فٹ نہ ہوتی۔ لیکن خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کی بجائے وہ آخر دم تک کبر اور نخوت میں مبتلا رہے۔ وہ اور اُن کا خاندان عوام میں اپنی مقبولیت کے بھروسے پر ابھی تک خدا کی بجائے عوام کو ہی طاقت کا سر چشمہ گردان رہا تھا۔ بھٹو صاحب اپنے آپ کو ابھی تک ملک کا وزیر اعظم اور اِسلامی کانفرنس کا سربراہ تصور کر رہے تھے۔ اُن کو اپنی بین الاقوامی شہرت پر بہت مان تھا۔ چنانچہ وہ مقدمہ کو

سیاسی رنگ دے کر عالمی لیڈروں کی مداخلت پر تکیہ کرتے رہے۔ مقررہ مدت کے اندر اندر اس فیصلے کیخلاف سپریم کورٹ میں اپیل تو دائر کردی گئی لیکن بعد میں اُن کے وکیل مقدمے کو حیلوں بہانوں سے ٹال دیتے رہے۔ اس اُمید پر کہ عالمی لیڈروں کے دباؤ میں آ کر جنرل ضیا بھی ایوب خان کی طرح مقدمہ واپس لینے پر مجبور ہو جائے گا۔

عالمی لیڈروں کی مداخلت اور بھٹو کے اکھڑ پن نے حکومت کو اُن کے حفاظتی اقدامات کو سخت تر کردینے پر مجبور کردیا۔ چنانچہ اُن کو عام قاتلوں کی جیل میں رکھنے کی بجائے حکومت کی طرف سے اُن کیلئے راولپنڈی جیل کے اندر ہی سیکورٹی وارڈ کے نام سے چھ سپیشل کوٹھڑیوں پر مشتمل ایک منی جیل تیار کروائی گئی۔ اِن کوٹھڑیوں کی دیواریں، چھت اور فرش لوہے اور کنکریٹ کی دبیز تہوں سے مضبوط کردی گئیں اور اِن کے گرداگرد خاردار تاروں کے گچھوں کے متعدد جنگلوں کا دفاعی حصار بنادیا گیا تاکہ سیکورٹی وارڈ پر کسی ممکنہ حملے یا وہاں سے بھٹو کے فرار کی کوشش کو ناکام بنایا جاسکے۔ علاوہ ازیں اِن کوٹھڑیوں کی نگرانی کیلئے چاروں کونوں پر مینار تعمیر کئے گئے جن پر ہر وقت چاق و چوبند نگہبان متعین رہتے۔ رات کے وقت سیکورٹی وارڈ کے اردگرد کے علاقے پر سرچ لائٹ کے ذریعے نظر رکھی جاتی۔ کسی ممکنہ ہوائی حملے کے ذریعے اُن کے اغوا کی کوشش کو ناکام بنانے کیلئے سیکورٹی وارڈ کے اردگرد طیارہ شکن توپیں نصب کردی گئیں۔ سیکورٹی وارڈ کی وہ کوٹھڑی جہاں بھٹو کو رکھنا مقصود تھا اُس میں خفیہ جاسوسی آلات بھی نصب کردئے گئے۔ اِس منی جیل کی داخلی نگرانی اور حفاظت کیلئے محکمہ جیل کے عملہ میں مزید پچاس وارڈرز کا اضافہ کردیا گیا۔ بیرونی حفاظتی ڈیوٹی کیلئے ایس ایس پی راولپنڈی کی نگرانی میں ضلعی پولیس میں سہالہ پولیس ٹریننگ کالج اور آئی جی ریزروفورس سے پانچ پانچ سو مزید سپاہیوں کا اضافہ کردیا گیا۔ اِس سارے آپریشن کی نگرانی کیلئے پاک فوج کے لیفٹیننٹ کرنل رفیع الدین کو اُن کے زیرِ کمان ۲۷ پنجاب رجمنٹ اور ۱۳ ایف ایف کی ایک اضافی کمپنی کے ساتھ لگادیا گیا۔ اِن حفاظتی انتظامات کے باوجود کرنل رفیع الدین کا بیان ہے:

"یہ تھے وہ حفاظتی انتظامات جو اسیری کے دوران بھٹو صاحب کی حفاظت یقینی بنانے کیلئے ان کو سینٹرل جیل راولپنڈی لانے سے پہلے عمل میں لائے گئے۔ ویسے اُن کی اسیری کے دوران نت نئے واہمے اور مفروضے جنم لیتے رہے اور ان کے توڑ بھی صادر ہوتے رہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ذوالفقار علی بھٹو کی شخصی ہیبت اور عوامی مقبولیت کی شدید دہشت طاری ہے اور اِن تہہ در تہہ حفاظتی اقدامات کے

باوجود کسی غیر متوقع اور اچانک اقدام سے بھٹو صاحب کے بچ نکلنے کے کئی امکانات موجود ہوں۔ سنگ و آہن کی دیواروں اور فولادی چھتوں کے اندر محبوس ایک شخص کی نگرانی پر مامور دائرہ در دائرہ مسلح دستوں کی موجودگی نے بھی ہماری نیند حرام کر رکھی تھی۔ لیکن دوسری طرف جب میں بھٹو صاحب کو دیکھتا تو وہ ہمیشہ مجھے بے پروائی اور بے نیازی ہی کے عالم میں نظر آئے۔'' (۱۴۸)

بلوچ سینٹر ایبٹ آباد

میری میڈیکل کیٹگری ڈاؤن ہوئے پورا سال ہو چکا تھا لیکن میری تبدیلی ابھی تک اس پہاڑی علاقے سے کسی میدانی علاقے میں نہیں ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے گھٹنوں میں پھر سے درد ہونے لگا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں پھر سی ایم ایچ ایبٹ آباد پہنچ گیا۔ انہیں دنوں یعنی ۱۷ مئی ۱۹۷۸ء کو بھٹو صاحب کو بھی راولپنڈی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ ۲۰ مئی کو میری بدلی بلوچ سینٹر ایبٹ آباد میں ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے فیملی اکاموڈیشن مل گئی اور میرے بیوی بچے بھی منگلا سے یہاں پہنچ گئے۔ ایبٹ آباد اگرچہ ایک خوبصورت وادی میں واقع ہے لیکن شہر کی آبادی پہاڑ کی ڈھلوان پر ہونے کی وجہ سے گلی کوچے، بازار اور سڑکیں سب، کبھی تو نیچے اتھاہ گہرائیوں کی طرف چل پڑتے ہیں اور کبھی اُن کا رخ آسمان کی طرف ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو مضبوط ترین گھوڑے بھی ایسی چڑھائیوں پر بے بس ہو جاتے ہیں۔

افغانستان اور ایران میں انقلاب

انہی دنوں افغانستان میں نور محمد ترکئی نے روس کی مدد سے سردار محمد داؤد کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اُس کے خاندان کا صفایا کر دیا۔ ایران میں بھی سفید انقلاب کے نام پر ملک کو مغربی تہذیب میں ڈھالنے کا شاہی پروگرام غریب اور مذہب پرست ایرانی عوام نے چند ہی سالوں میں رد کر دیا۔ تیل کی دولت کی بدولت مغربی طرز کی جدیدیت صرف تہران اور دیگر بڑے بڑے شہروں میں ہی نظر آتی تھی۔ دیہی علاقے ابھی تک غربت اور افلاس کا شکار تھے۔ ملک کی ساری دولت شاہی خاندان، فوجی جرنیلوں، سیاستدانوں اور رؤسا کے ہاتھوں میں گردش کر رہی تھی۔ ہر طرف اقربا پروری، بے ایمانی اور کرپشن کا دور دورہ تھا۔ مراعات یافتہ طبقے کے مغربی طرز معاشرت نے اُنہیں غربا اور درمیانے طبقے کے لوگوں سے کاٹ کے رکھ دیا تھا۔ بیروزگاری کا شکار تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ امریکی مشیروں کی فوج ظفر موج کو اپنے حقوق کا

غاصب تصور کرنے لگا تھا۔ ایران میں امام خمینی کے پیروکار کھلے بندوں شاہ سے تخت چھوڑ کر اقتدار عوام کے حوالے کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اُن کی ایک آواز پر لاکھوں کا مجمع تہران اور دیگر بڑے بڑے شہروں کی گلیوں میں اُمڈ پڑتا تھا۔ تنگ آ کر شاہ نے پچھلے بارہ سال سے اپنے معتمدِ خاص امیر علی عباس ہویدا کو وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کرنے کے بعد دیگر اپنے مُہروں کو آزمانا شروع کر دیا۔ جولائی ۷۸ء میں جمشید آموز گار کو وزیرِ اعظم بنایا گیا۔ ان کے وزیرِ اعظم بننے کے صرف ایک ماہ بعد ۱۹ اگست ۱۹۷۸ء کو اصفہان میں ایک سینما گھر کو نذرِ آتش کر دیا گیا جس کے نتیجے میں پانچ سو کے قریب تماشائی جل کر یا دم گھٹ کر جان بحق ہو گئے۔ شاہ نے نااہل قرار دے کر اُسے بھی فارغ کر دیا۔ اس کے بعد شاہ نے شیعہ علماء کی ہمدردیاں حاصل کرنے کیلئے جعفر شریف امامی کو وزیرِ اعظم نامزد کر کے متعدد مذہبی اقدامات کا اعلان کیا۔ میکدوں اور قمار خانوں پر پابندی لگا دی گئی۔ ہجری کیلنڈر متعارف کرایا گیا۔ لیکن یہ مصنوعی اقدامات بھی کام نہ آئے۔ ایران کی تاریخ میں اس مرتبہ پہلی دفعہ رمضان المبارک پورے اِحترام سے منایا گیا۔ رمضان المبارک کے بعد ۴ ستمبر کو تہران میں ایک لاکھ کے مجمع نے عید الفطر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد عید کی خوشی میں لوگ گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے۔ انتظامیہ کی مداخلت پر ہجوم مشتعل ہو گیا اور توڑ پھوڑ پر اُتر آیا اور بالآخر اُس نے شاہی فوج کے ٹھکانوں پر بلہ بول دیا اور فوجیوں کو پکڑ پکڑ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ ملک کے ۱۳ بڑے شہروں میں کرفیو نافذ کر کے اقتدار فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ جعفر امامی کی جگہ فوج کے کمانڈر انچیف جنرل غلام رضا ازہری کو وزیرِ اعظم بنا دیا گیا لیکن اِن میں سے کوئی بھی عوامی سیلاب کے آگے بند باندھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اِس طرح ایک ایک کر کے سب حکومتیں سوکھے پتوں کی طرح گرتی گئیں۔ ایرانی فوج امام خمینی کے فدایانِ خلق اور پاسدارانِ انقلاب کے سامنے برف کی طرح پگھل رہی تھی۔ مشہور کہاوت ہے کہ بلی کے پاؤں جلنے لگے تو اُس نے اپنے بچے پاؤں تلے رکھ لئے۔ شاہِ ایران کی حالت بھی کچھ اسی طرح کی ہو گئی تھی۔ اپنی شاہنشاہیت کو بچانے کی خاطر اب وہ اپنے وفاداروں کی بھینٹ چڑھانے پر اُتر آیا تھا۔ چنانچہ مذہبی رہنماؤں کو خوش کرنے کیلئے آخری حربے کے طور پر اُس نے امیر علی عباس ہویدا سمیت اپنی رستا خیز پارٹی کے ۱۳۲ رہنماؤں کو جیل میں ڈال کر آیت اللہ حسین علی منتظری اور دیگر ایک ہزار کے قریب سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ لیکن یہ حربہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ عوام کا ایک ہی مطالبہ

تھا "Step-down" ''تخت چھوڑ دو!'' امام خمینی کے فدائین اور پاسداران انقلاب نے شاہ کو دھکیل کر اب دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ اُس کے قریبی حلیف امریکہ نے اُس سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ آخر اُس نے اپنی بھلائی اسی میں جانی کہ کچھ عرصہ چھٹی کے بہانے ملک سے باہر گزارا جائے۔ دسمبر ۱۹۷۸ء کے آخر میں اُس نے اقتدار شاہ پور بختیار کے حوالے کیا اور ۱۶ جنوری ۱۹۷۹ء کو اپنے خاندان کے ساتھ چپکے سے ملک سے باہر پرواز کر گیا۔ شاہ کے جانے کے بعد امام خمینی نے اعلان کیا کہ وہ بہت جلد ایران واپس آ رہے ہیں۔ شاہ پور بختیار نے اعلان کیا کہ امام خمینی کو ایران میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ مگر حکومت کی طرف سے روکنے کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود یکم فروری ۱۹۷۹ء کو فرانسیسی فضائیہ کا بوئنگ طیارہ امام خمینی کو لے کر تہران کے ہوائی اڈے پر اُترنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُن کا ایسا شاندار اِستقبال ہوا جس کی مثال اس ملک میں قبل ازیں نہیں ملتی۔ امام خمینی نے شاہ پور کی حکومت کو غیر قانونی قرار دے کر اُس کی جگہ مہدی بازرگان کو ملک کا وزیرِ اعظم نامزد کر دیا۔ دو متوازی حکومتوں کی وجہ سے ملک میں انارکی پھیل گئی۔ آخر گھٹنے ٹیک کر شاہ پور کو بھی راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ بعد ازاں اسلامی اِنقلاب نے جو خون کی ندیاں بہائیں وہ ایک دردناک داستان ہے۔ آئے دِن ندایانِ خلق کے ہاتھوں شاہی فوج کے افسر ذلیل و خوار ہو کر کھلے عام پھانسی پر چڑھنے لگے۔

پاک فوج کو سلام!!

ایرانی فوج کا عبرتناک انجام دیکھ کر میرے دِل میں بھی یہ گمان گھر کر گیا کہ پاکستانی عوام بھی روز روز کے فوجی انقلابوں سے تنگ آ چکی ہو گی۔ بھٹو کی سزائے موت سلگتی ہوئی چنگاری کو بھڑکانے کیلئے کافی تھی۔ قبل اس کے کہ پاکستانی عوام ہمارا بھی اِیرانی فوج جیسا حشر کرے وقت پر گھر پہنچا جائے۔ ویسے بھی میڈیکل کیٹگری ڈاؤن ہونے کے بعد اب چونکہ میرے لئے ترقی کا راستہ بند تھا اِسلئے میرا دِل بھی فوجی نوکری سے بھر چکا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے عزت کی روزی کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ اِسلئے جلد بازی میں چھوڑنا بھی کفرانِ نعمت تھا۔ آزاد کشمیر کے پہاڑوں سے ایبٹ آباد میں میری بدلی آسمان سے گرا کھجور پہ اٹکا والا معاملہ تھا۔ شومئی قسمت سے مجھے جو رہائش ملی وہ بھی پہاڑی کے دامن میں تھی۔ وہاں سے میرا دفتر صرف آدھے میل کے فاصلے پر اُسی ایک پہاڑی کے دامن میں واقع تھا درمیان میں ایک

بہت گہرا برساتی نالہ بہتا تھا۔ اِسلئے مجھے میل بھر کا چکر کاٹ کر پُل پر سے دفتر پہنچنا پڑتا تھا۔ آدھا راستہ پہاڑی کی ڈھلوان سے نیچے کی طرف اور پُل سے آگے کا آدھا راستہ چڑھائی پر تھا۔ میرے پاس گاڑی وغیرہ قسم کی کوئی چیز تو تھی نہیں۔ سائیکل اس پہاڑی پر چلانا میرے لئے پیدل چلنے سے بھی زیادہ مضر تھا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصے بعد میرے گھٹنوں میں پھر سے تکلیف ہوگئی۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ جب کبھی درد ناقابلِ برداشت ہوتا ہسپتال جا کر گھٹنوں میں ٹیکہ لگوا آتا۔ وہاں پر میری ملاقات کوئٹہ والے سرجن کرنل ریاض سے ہوگئی۔ وہ وہاں سے فل کرنل کے رینک پر ترقی پا کر یہاں ایبٹ آباد سی ایم ایچ میں آ گئے تھے۔ بہت خلوص سے ملے۔ میں نے جب اُنہیں بتایا کہ میڈیکل کیٹگری اے ہونے کی وجہ سے سٹاف کالج سے مجھے آزاد کشمیر میں بدلی کر دیا گیا جہاں میرے گھٹنوں کی حالت اور بھی بگڑ گئی جس کی وجہ سے مجبوراً کیٹگری سی ہونا پڑا۔ یہاں پر بھی حالات پہاڑی علاقے جیسے ہی ہیں۔ ایک دفعہ جب میں ٹیکہ لگوانے گیا تو میں نے اُن سے دبے لفظوں میں کہہ ہی دیا کہ اگر وہ مہربانی کریں تو میری جان فوج سے چھوٹ سکتی ہے۔ میری بات سن کر وہ خاموش ہوگئے اور کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے کہ ''دو ہفتے بعد سوچ کر آنا۔'' دو ہفتے بعد میں پھر کرنل ریاض کے پاس چلا گیا۔ اُنہوں نے مجھے داخل کر کے میرا چیک اپ شروع کر دیا۔ اور کچھ دنوں بعد میڈیکل بورڈ نے مجھے فوج کیلئے نااہل قرار دیدیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۷۸ء کو میں فوج سے پینشن پا کر فیصل آباد پہنچ گیا۔

پی این اے کے لیڈروں کی الیکشن سیل اور جنرل ضیاء سے ملاقاتوں کی خبریں چھپتی رہتی تھیں لیکن بھٹو صاحب کو مجرم قرار دئے جانے کے بعد اِن ملاقاتوں کا سلسلہ کچھ زیادہ ہی ہوگیا تھا۔ چونکہ پی پی پی کے مقابلے میں انتخابات میں جیتنا اِن لوگوں کو اب بھی ناممکن دکھائی دیتا تھا اِسلئے اُنہوں نے عقبی دروازے سے اِقتدار میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ ہر جماعت زیادہ سے زیادہ وزارتیں ہتھیانے کی کوشش میں تھی۔ جنرل کے ایم عارف کے مطابق نوابزادہ نصراللہ خان اپنی پدّی جماعت کیلئے تین وزارتوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چنانچہ اِس بندر بانٹ کے نتیجے میں ۲۳ اگست ۱۹۷۸ء کو جس کیبنیٹ نے حلف اُٹھایا اُس میں اکثریت بھٹو دشمن عناصر کی تھی۔ پی پی پی کے رہنماؤں اور بین الاقوامی ناقدوں کا منہ بند کرنے کیلئے ضیاؑ نے اِس کے ساتھ ہی چار دیواری کے اندر سیاسی سرگرمیوں کی اجازت کا اعلان کر کے ۱۹۷۹ء کو اِنتخابات کا سال قرار دے دیا۔ اِس کے ساتھ ہی ضیاؑ الحق کی کچن کیبنیٹ کے وزراؑ اپنے اپنے بلوں سے

نکل کر عالمی رائے عامہ کے برخلاف کھلے عام بھٹو کی موت کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس کارِ خیر کیلئے ضیاؔ نے اُنہیں اپنے عہدوں کے ناجائز استعمال کی کھلی چھٹی دے دی۔

شاہِ ایران کے اپنے اقتدار کی ناؤ اسلامی انقلاب کے گرداب میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ اُن کے اقتدار کے دِن گنے جا چکے تھے۔ اِس کے باوجود اُس نے جنرل ضیاؔ سے بھٹو کی موت کی سزا کے خلاف رحم کی اپیل کرتے ہوئے پیشکش کی کہ وہ اُنہیں اپنے ملک میں پناہ دینے کیلئے تیار ہیں۔ اس قسم کی پیشکش سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے بھی ہو چکی تھی۔ لیکن ضیاؔ نے چپ سادھ رکھی تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ اِدھر ۱۸ دسمبر ۱۹۷۸ء کو سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کی اپیل کی سماعت شروع ہوئی اور اُدھر شاہ ایران کے خاندان کی ڈھائی ہزار سالہ شاہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا۔ بھٹو کے وکلاءَ نے نو ماہ تک کیس کو صرف اِس اُمید پر لٹکائے رکھا کہ ضیاءُالحق عالمی رہنماؤں کے دباؤ میں آ کر اُن کی سزا کو کم یا معاف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن جو شخص خدا کی گرفت میں ہو اُسے دنیا کی کوئی طاقت معاف نہیں کر سکتی۔ اِسلئے کہ طاقت کا سرچشمہ اِنسان نہیں خدا کی ذات ہے۔ سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کا رَویّہ مناسب تھا۔ عدالت کے ججوں کو وہ احترام اور عزت سے مخاطب کرتے تھے۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ اِس دفعہ اپنے کیس کی وکالت زیادہ تر اُنہوں نے خود کی۔ اپنے زورِ خطابت کے بل بوتے پر اُنہوں نے ملکی حالات پر بھرپور تبصرہ کیا۔ عالمی سیاست کی اُفق پر رونما ہونے والے واقعات اور اُن کے پاکستان پر اثرات کی پیشگوئیاں کیں۔ ملک اور اِسلام کیلئے اپنی خدمات کا تذکرہ کیا۔ خاص طور پر احمدیوں کو غیر مسلم قرار دلوا کر اِسلام کی لاجواب خدمت کا پھر ایک دفعہ دعویٰ کیا۔ اُنہیں سب سے زیادہ دُکھ یہ تھا کہ ماتحت عدالت نے اُنہیں نام کا مسلمان اور عادی دروغ گو قرار دیا تھا، جو اُن کے ساتھ سراسر زیادتی تھی۔ اُن کا بیان تھا کہ انسان کے مذہب کا تعلق خدا سے ہوتا ہے۔ یہ صرف خدا جانتا ہے کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں!!...... کہتے ہیں جھوٹے کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ ...... ماتحت عدالت نے جو اُنہیں عادی دروغ گو قرار دیا تھا اُس کی بنیاد ٹھوس شواہد پر تھی۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب اُنہوں نے مسلمانوں کے ایک ایسے فرقے کو دائرۂ اِسلام سے خارج کروایا تھا، جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر تہِ دل سے ایمان رکھتا ہے، جس کے قبلہ و کعبہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ دیگر مسلمانوں کی طرح جزوِ ایمان ہیں۔ جو قرآن مجید کے ہر حکم اور سنتِ رسول کو واجب العمل سمجھتے ہیں اور جو سچے

مسلمان ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ کیا اُن کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ خدا کے ہاتھ میں نہ تھا؟ کاش سپریم کورٹ کے کسی جج نے بھٹو سے یہ سوال پوچھا ہوتا! جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ آج موت کو سامنے دیکھ کر بھٹو صاحب جیسا عادی دروغ گو بھی سچ بولنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اور زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ مذہب کا فیصلہ دنیاوی عدالتوں یا اسمبلیوں کے اختیار میں نہیں بلکہ خدائے بزرگ و برتر کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن آج بھٹو کی حق گوئی کا بھی وہی حشر ہوا جو آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل موسیٰ اور اُس کی قوم کے تعاقب میں فرعون کا سمندر میں غوطے کھا کر ''آمَنتُ بِربّ مُوسیٰ و ھارُون'' کہنے پر ہوا تھا۔ جس طرح فرعون موسیٰؑ کی قوم کے تعاقب میں غرق ہو کر قیامت تک تاریخ کا حصہ بنا اسی طرح بھٹو بھی مرزا غلام احمد قادیانیؑ کی جماعت کو یہودی قرار دے کر اُن کا پیچھا کرتے کرتے تختۂ دار پر چڑھ کر تا قیامت تاریخ کا اَنمٹ حصہ بن گیا۔ فاعتبرو یا اولی الابصار

چنانچہ بھٹو کا زورِ خطابت، اُن کی فصاحت و بلاغت اور اُن کا دانشورانہ اندازِ بیاں ایسے ہی تھا جیسے بھینس کے آگے بین۔ اب یہ سب بے کار تھا۔ سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کے فیصلے سے اتفاق کرتے ہوئے تمام ملزمان کی سزائے موت کو برقرار رکھا اور ۲ فروری ۱۹۷۹ء کو جو فیصلہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس انوار الحق نے پڑھ کر سنایا وہ کچھ یوں تھا:

''مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ استغاثہ اپنا کیس ثابت کرنے میں مکمل طور پر کامیاب ہوا ہے۔

اس دعوے کی حمایت میں قطعاً کوئی دلیل نہیں کہ مقدمہ سیاسی بنیادوں پر بنایا گیا ہے۔ یہ کتنے ستم کی بات ہے کہ اپیل کنندہ کے ذہن میں مقدمہ کے آغاز ہی سے ماتحت عدالت کے خلاف تعصب پایا جاتا تھا۔ جوں جوں استغاثہ کی طرف سے اُن کے اس کیس میں ملوث ہونے کے ثبوت پیش کئے جاتے رہے توں توں بجائے اس کے کہ وہ اپنا دفاع کرتے، اُنہوں نے عدالت پر توہین آمیز حملے کرنے شروع کر دئے۔ اس طرح عدالت میں کھینچا تانی کا ماحول پیدا کرنے کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ ...... اِنتظامیہ کے سربراہ کی حیثیت سے اُنہوں نے حکومتی ذرائع کا سفاکانہ اِستعمال کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ پاکستان کے شہریوں کی زندگی کی حفاظت کرتے، وہ فیڈرل سیکورٹی کے ذریعے اپنے ایک سیاسی مخالف کی جان کے درپے ہوگئے۔''

فیصلے کے آخر میں اُنہوں نے لکھا: ''یہ تمام حقائق یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایسے شواہد اور ایسے حالات موجود نہیں جو سزا کو اپیل کنندہ کے حق میں کم کر دینے کا باعث بن سکیں۔ ہائی کورٹ اِس سلسلے میں سزا دینے میں حق بجانب تھی جو اِس قسم کے مقدموں میں از روئے قانون قتلِ عمد اور اعانتِ جرم

کے مرتکب ہونے والوں کو دی جاتی ہے۔'' (۱۴۹)

جسٹس انوار الحق کی رائے کے ساتھ تین ججوں نے اِتفاق کیا اور تین نے اختلاف۔ اِس طرح چیف جسٹس کے علاوہ باقی جج صاحبان کی نصب تعداد کی رائے میں بھٹو صاحب کے خلاف جرم ثابت نہ ہوا تھا۔ روایت کے مطابق ایسی صورت میں مجرم کو اِنتہائی سزا نہیں دی جاتی۔ چنانچہ اُن کی سزائے موت خلافِ قانون تو نہ تھی لیکن مروجہ روایات کے خلاف ضرور تھی۔

فوج سے آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد مجھے کریسنٹ جیوٹ ملز جڑانوالہ میں بطور سیکورٹی آفیسر ملازمت مل گئی۔ جڑانوالہ فیصل آباد سے کوئی چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کرنل بوطاب شوکت مجھ سے پہلے وہاں پر مینجر ایڈمنسٹریشن تھے۔ جیسا کہ اُن کے نام سے ظاہر ہے وہ کٹر قسم کے شیعہ معلوم ہوتے تھے۔ کافی عرصے سے وہاں پر تھے۔ اِس لئے مل کے معمولات سے اچھی طرح سے واقف تھے۔ لیکن میرے لئے کسی انڈسٹریل یونٹ میں کام کرنے کا یہ بالکل پہلا موقع تھا۔ نہ تو اُنہوں نے میری ڈیوٹی کے بارے میں مجھے کوئی لائحہ عمل بتایا اور نہ ہی اپنے تجربہ کی بنا پر مزدوروں کے ساتھ خوشگوار ماحول میں کام کا طریق۔ میں چونکہ نیا نیا فوج سے آیا تھا اِسلئے ابھی تک فوجی طور طریقوں کا عادی تھا۔

میں نے اپنی ڈیوٹی کے دوران مشاہدہ کیا کہ ہر کھاتے میں بہت ساری لُو میں چل رہی ہیں لیکن وہاں اُن کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں۔ مزدور کام کے اوقات میں گروپوں کی شکل میں کینٹین میں بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ میں نے گندے بدبودار ٹائلٹوں میں گروہ در گروہ مزدوروں کو بیٹھے سگریٹ پیتے دیکھا۔ مِل مینجر سے بات کی تو اُس گھاگ میمن نے میری سادہ لوحی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کھاتہ اِنچارجوں کی بلا میرے گلے میں ڈال دی اور کہنے لگا کہ آپ اور آپ کا سٹاف اس بات کا بھی یقین کریں کہ لوگ ٹائلٹوں میں بلا وجہ زیادہ وقت نہ گزاریں۔ میں مزدور کی مزدوری اور اُن کیلئے بہتر سہولتیں تو مہیا کروانے کی پوزیشن میں نہ تھا البتہ اُنہیں ٹائلٹوں سے نکال کر کھاتوں میں پہنچانے کا کام میرے سٹاف کے ذمے لگ گیا۔ اب مجھے گاہے بگاہے ٹائلٹوں کا راؤنڈ بھی لگانا پڑتا۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ لوگ وہاں سے کھسک جاتے۔ کھاتوں کی حاضری بڑھ گئی۔ مل مینجر اور مالک تو خوش تھے مگر مزدور مجھ سے ناراض۔

میں نے محسوس کیا کہ مل مالکان کو اِس بات کا اِحساس نہ تھا کہ مزدور خوش ہوگا تو دِل لگا کر کام کرے گا اور پیداوار بھی یقینی طور پر بڑھے گی۔ وہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کے چکر

میں مزدوروں کو کم سے کم مزدوری اور نہ ہونے کے برابر سہولتیں مہیا کرنے کی کوشش میں ہوتے۔ برعکس اس کے مزدوروں کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ اگر پیداوار زیادہ ہوگی تو اُن کے روزگار کا ذریعہ بھی قائم رہے گا۔ اُن کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ کم سے کم کام کرکے مالک سے زیادہ سے زیادہ مزدوری بٹوری جائے۔ فوج میں آفیسر اور ماتحت ایک خاندان کی مانند ہوتے ہیں۔ ہر کمانڈر اپنے ماتحت کی خوراک، صحت و آرام اور اُس کی بہبود کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن یہاں سول میں دونوں طرف سے احساس ذمہ داری کا فقدان تھا۔

فروری ۱۹۷۹ء کی بات ہے۔ اِن دنوں بھٹو صاحب کی موت کی سزا کے خلاف نظر ثانی کی درخواست سپریم کورٹ میں زیرِ غور تھی۔ اِخلاقی اور قانونی لحاظ سے جب تک کوئی مقدمہ کسی عدالت میں زیرِ سماعت ہو اُس وقت تک اُس پر پبلک یا اِنتظامیہ کی طرف سے کسی قسم کی بیان بازی عدالتی فیصلے پر اثر انداز ہونے کے مترادف ہوتی ہے جو قانون کی نظر میں توہین عدالت اور قابلِ گرفت ہوتی ہے۔ لیکن پاکستان کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ پہلے بھٹو نے قانون کی دھجیاں اُڑا کر اپنے مخالفوں کو ہراساں کیا اور اب اُس کی زیادتیوں کا نوحہ کرنے والے اِقتدار میں آ کر وہی حربہ اُس کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ کسی ممکنہ ردِعمل کے ڈر سے ضیاءُ الحق نے بے نظیر اور نصرت بھٹو کو سہالہ کے ریسٹ ہاؤس میں نظر بند کر رکھا تھا۔ بھٹو صاحب کے دونوں صاحبزادے بھاگ کر ہمسایہ ممالک میں جا چھپے تھے۔ اگرچہ حکومت نے چار دیواری کے اندر رہ کر سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے رکھی تھی لیکن پی پی پی کے رہنما پھر بھی چوہوں کی طرح اپنے اپنے بلوں میں سہمے بیٹھے تھے۔ برخلاف اِس کے ضیاءُ الحق کی کچن کیبنیٹ کے ارکان جن میں اکثریت بھٹو مخالف جماعتوں کے افراد کی تھی، کھلے بندوں جلسے منعقد کر کے بھٹو کو پھانسی دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

باب ۱۹

بھٹو تختۂ دار پر

انہیں دنوں وفاقی وزیر برائے لیبر اور افرادی قوت چوہدری ظہور الٰہی کی ہدایت پر انجمن مزدوراں کے زیرِ اہتمام جڑانوالہ میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ جڑانوالہ کے وسیع و عریض بس سٹینڈ کی چار دیواری میں لوکل صنعتی یونٹوں کے مزدوروں اور کارکنوں کو انتظامیہ کے ذریعے اکٹھا کیا گیا۔ مجھے بھی چوہدری صاحب کی تقریر کا کچھ حصہ سننے کا موقع ملا۔ اُنہوں نے مزدوروں کی بہبود کی تو کوئی خاص بات نہ کی البتہ اُن کا سارا زور ضیاءالحق سے بھٹو کو تختۂ دار پر لٹکوانے کے مطالبے پر تھا۔

۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو سپریم کورٹ نے بھٹو کی نظر ثانی کی درخواست بھی مسترد کر دی۔ اِس کے بعد قانونی چارہ جوئی کا کوئی راستہ باقی نہ رہا تھا۔ اب صرف ایک ہی راستہ باقی تھا اور وہ تھا صدر کے پاس رحم کی اپیل لیکن بھٹو نے اپنے اہلِ خانہ کو ہدایت کر رکھی تھی کہ عدالتی چارہ جوئی کے بعد ضیاءالحق سے اُس کی زندگی کی بھیک نہیں مانگنی۔ پی پی پی کی انتظامیہ کی طرف سے رحم کی درخواستیں پیش کی گئیں۔ یکم اپریل کے اخبارات میں یہ خبر بھی سرخیوں کے ساتھ چھپی کہ اُن کی ہمشیرہ نے بھی صدر سے رحم کی اپیل کی ہے۔ بین الاقوامی دباؤ کے پیشِ نظر ضیاءالحق جلد از جلد اِس قضیئے کو نپٹانا چاہتے تھے۔ وقت اب بہت تیز رفتاری سے گزر رہا تھا۔ اُس وقت کے وزارتِ داخلہ کے سیکریٹری جنرل روئیداد خان کا بیان ہے کہ وہ ابھی رحم کی اپیل کی درخواستوں کی سمری تیار کر کے اُس کی نوک پلک ہی درست کر رہے تھے کہ چیف مارشل لاء سیکریٹریٹ کی طرف سے زور دیا جانے لگا کہ ''سمری جلدی بھیجو، سمری جلدی بھیجو۔''

وزارت داخلہ نے جو سمری بھیجی اُس کا خلاصہ یہ تھا:

سپریم کورٹ میں نظرِ ثانی کی درخواست پر فیصلہ

''ہم نے ریویو کی درخواست کے حق میں پیش کیے گئے دلائل سنے۔ اگرچہ ہم ان دلائل کی بنا پر سزائے موت کا حکم بدلنے سے قاصر ہیں لیکن حکومت کے پاس رحم کا اختیار خصوصی ہے۔ وہ اپنا یہ اختیار اِستعمال کرتے وقت اِن دلائل پر غور کرسکتی ہے۔''

وزارتِ قانون کی رائے

''قانون میں رحم دلی کا مطلب ہے کہ قاتل کو قتل کر دیا جائے، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ قاتل کا جرم ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے سامنے ثابت ہو چکا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ سزائے موت میں تخفیف یا تبدیلی کا خصوصی اختیار مقتول اُس کے ورثا اور اُس کے اقربا کے ساتھ بے رحمی ہے۔ رحم کے نام پر سزائے موت میں تخفیف یا تبدیلی، انصاف کے تقاضوں سے نا اِنصافی ہے۔ قاتل تو محض قانونی موشگافیوں کی بدولت زندہ ہے لیکن ہمیں اِنصاف تو اُس شخص سے کرنا ہے جواب زندہ نہیں۔ جس کی روح اب بھی اِنصاف اِنصاف پکار رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ اس کی موت کا بدلہ لیا جائے، موت کے بدلے موت دی جائے اور سچ تو یہ ہے کہ موت کے بدلے موت رحم دلی کا تقاضا بھی ہے۔''

وزارتِ داخلہ کی رائے

''یہ ایک ایسا مقدمہ ہے جس کی ماضی میں نظیر نہیں ملتی، ملک میں شدید اِضطراب ہے اور ملک سے باہر کافی دلچسپی ہے، سزائے موت پر عمل درآمد کو بیرونِ ملک خصوصاً امریکہ اور مغربی یورپ میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا، جس سے پاکستان کی شہرت کو بھی دھچکا لگے گا۔ ایسے مقدمات جن کے مضمرات خصوصی یا سیاسی ہوں اُن کے بارے میں رہنما اصول یہ ہے کہ اُنھیں اُن کے اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں نپٹایا جائے، بعض اوقات سزائے موت کو عمر قید میں بدلنا زیادہ قرینِ مصلحت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ سزائے موت پر عمل درآمد سے رائے عامہ بجائے مقتول کے حق میں رہنے سے قاتل کے حق میں ہوجائے۔'' (۱۵۰)

یکم اپریل کی شام وزارتِ قانون کے جوائنٹ سیکریٹری اور جنرل عارف وزارتِ داخلہ کی سمری لے کر جنرل ضیاؒ کے پاس پہنچے۔ جنرل عارف کے مطابق:

''جنرل ضیاؒ نے سمری کا بغور مطالعہ کیا۔ یکم اپریل ۱۹۷۹ء کو جب شام کی تاریکی پھیل رہی تھی تو اُنہوں نے اپنے مکان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر معمول کی فائلیں نمٹاتے ہوئے مسٹر بھٹو کی فائل پر لکھا 'درخواست مسترد کی جاتی ہے۔''' (۱۵۱)

برخلاف اس کے روئیداد خان کا بیان ہے کہ ارشاد خان نے اسے بتلایا:

''کہ جب وہ جنرل عارف کیساتھ ہماری سمری لے کر صدر کے پاس پہنچے تو صدر نے رحم کی

عرضداشت کو پڑھا تک نہیں اور بغیر پڑھے مسترد کر دیا۔'' (۱۵۲)

بہر حال عرضداشت کو پڑھا یا نہیں پڑھا۔ ۲ اپریل کے اخبارات نے رحم کی اپیل کے مسترد کیے جانے کی موٹی موٹی خبریں چھاپیں۔ رحم کی اپیل کے مسترد کیے جانے کے باوجود کسی کے گمان میں نہ تھا کہ بھٹو صاحب کو پھانسی دینے میں اتنی عجلت سے کام لیا جائے گا۔ ۴ اپریل کو گیارہ بجے کے قریب میری ملاقات کرنل شوکت سے ہوئی تو اُس نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا:

"Waheed! do you know! Mr Bhutto has been hanged today?"

میں یہ سن کر گم صم سا ہو گیا۔ مجھے ہکا بکا دیکھ کر وہ پھر گویا ہوا:

"And not a dog barked."

مِل مزدور خاموش تھے۔ سب پر سکتہ طاری تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے تک رہا تھا۔ کوئی کھل کے بات نہیں کر رہا تھا۔ ایسے جیسے کسی کو یقین نہ آ رہا ہو کہ بھٹو کو پھانسی بھی دی جا سکتی تھی؟ اُسے مارا بھی جا سکتا تھا!!...... نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا! اللہ کرے یہ سب جھوٹ ہو!...... لیکن...... لیکن یہ سب سچ تھا!!...... بہت کڑوا سچ جو کسی کے حلق سے بھی نیچے نہیں اُتر رہا تھا۔ اگلے دِن کے اخبارات اُن کی پھانسی کی خبروں اور بے نظیر اور نصرت بھٹو کی اُن سے آخری ملاقات کی تصویروں اور خبروں سے اٹی پڑی تھیں۔ بھٹو کے مرنے کا سب کو غم تھا۔ اپنوں کو بھی اور اُن کو بھی جنہیں وہ گلیوں میں بھیک منگوانے کی دھمکیاں دیتے رہے تھے۔ افسوس اُنہوں نے تکبر کیا۔ وہ خدا کے بندوں سے ٹکر لینے سے بھی نہ ٹلے۔ آخری وقت بھی اُن کی زبان پر اللہ ذوالجلال کے نام کی بجائے اپنی چہیتی نصرت کا نام تھا جس سے اُنہیں گلہ تھا کہ وہ اُنہیں جیل میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ حسرت و یاس کی انتہا تھی۔

فاعتبرو یا اُولی الابصار!

ضیا کے دست راست جنرل کے ایم عارف کے مطابق:

''مسٹر بھٹو کی پھانسی نے پورے ملک کو حیرت میں ڈال دیا۔ اگرچہ غم و اندوہ اور اُداسیوں کی فضا پورے ماحول پر محیط ہو گئی پھر بھی لوگوں نے بالعموم اس فیصلے کو پُر سکون ہو کر سنا۔ احتجاج اور گڑ بڑ کے بعض معمولی واقعات ضرور ہوئے لیکن جیسا کہ پہلے جگادری پنڈتوں نے پیشگوئی کی تھی، نہ کوئی ہمالہ رویا اور نہ دریائے خوں رواں ہوئے۔'' (۱۵۳)

روئیداد خان کا بیان ہے:

''میں سمجھتا ہوں کہ ذوالفقار علی بھٹو کو سب سے زیادہ دھچکا، صدمہ اور رنج جس بات سے ہوا ہو گا وہ یہ

تھی کہ اُن کی اشد ضرورت کے وقت اُن کی پارٹی اُن کو دغا دے گئی۔ لیکن اس کے ذمہ دار بھی وہ خود ہی تھے۔ اپنے پانچ سالہ دورِ اقتدار میں اُنہوں نے لوگوں کے دل نہیں جیتے تھے۔ اُن کی پارٹی اب وہ پارٹی نہیں رہی تھی جو کبھی عوام کی پارٹی کہلاتی تھی۔ صرف چند لوگ اُن کے اردگرد رہ گئے تھے وہ بھی دل ہی دل میں اس فکر میں رہتے کہ کب ذوالفقار علی بھٹو راستے سے ہٹیں اور وہ اُن کی جگہ لیں۔ جب اصل آزمائش کی گھڑی آئی تو سب اُن کا ساتھ چھوڑ گئے۔ سوائے اُن کے اپنے خاندان کے گنے چنے افراد کے ملک میں نہ کوئی جلوس نکلے اور نہ احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ ہم لوگوں کو امنِ عامہ برنظر رکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ جب کچھ بھی نہ ہوا تو ہم سب حیران رہ گئے۔ کاش پی پی پی والوں کو معلوم ہوتا کہ ہم کتنے فکرمند تھے۔ اور دُعائیں مانگ رہے تھے کہ ملک میں، خصوصاً بڑے بڑے شہروں میں، عوام اور سیکورٹی ایجنسیوں کے درمیان کوئی سنگین جھڑپ نہ ہو۔ اگر مزاحمت سنگین ہو جاتی۔ اگر مڈبھیڑ اور مقابلے میں خون بہہ جاتا تو شاید پاکستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔'' (۱۵۴)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''سوال پیدا ہوتا ہے کہ بایں ہمہ ذوالفقار علی بھٹو سے کیا غلطی ہوئی؟ کہاں ہوئی؟ ذوالفقار علی بھٹو کا جو انجام ہوا کیا وہ ناگزیر تھا؟ کیا اُن کا انجام اٹل تھا؟" .....ذوالفقار علی بھٹو پاکستان میں اپنے اقتدار کو استحکام نہ بخش سکے، اپنے اقتدار کے نقطہ عروج پر پہنچ کر وہ اتنے مغرور ہو گئے تھے کہ پہچانے نہ جاتے تھے۔ وہ وہ ذوالفقار علی بھٹو نہ رہے تھے جن سے پہلی بار میں پشاور میں ۱۹۵۹ء میں ملا تھا۔ وہ اب جابر بن چکے تھے۔ اب وہ اختلاف رائے ذرا بھی نہ برداشت کر سکتے تھے۔ کوئی اُن سے ملنے جاتا تو ڈرتے ڈرتے جاتا کہ اُن سے ملنے کے بعد اُس کی عزتِ نفس بچ بھی سکے گی یا نہیں۔ پاکستان کے عوام نے ذوالفقار علی بھٹو کو اپنا ہیرو، اپنا مردِ غازی مانا۔ اُن کا ایمان تھا کہ وہ اُن کے آدرشوں اُن کے خوابوں میں برابر کا شریک ہے۔ انہی عوام کو ذوالفقار علی بھٹو نے مایوس کیا تھا۔ کسی زمانے میں یہی عوام اُس کے اقتدار کی اساس تھے، جیسے ہی وہ اساس نہ رہی، ذوالفقار علی بھٹو سب سے الگ تھلگ، تن تنہا، فوجیوں کے رحم وکرم پر رہ گئے۔'' (۱۵۵)

اگر نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی تو بھٹو کو موت سے بچانے کیلئے کون خون دیتا؟ روٹی، کپڑا اور مکان سے محروم عوام کو جھوٹے دلاسے دینے والے ان داتا کے حق میں اُن کو کون متحرک کرتا؟ کیا بلوچستان کے سردار یہ کام کرتے؟ کیا سرحد کے عوام بھٹو کو جیل سے نکالنے کیلئے بندوقیں لے کر آ جاتے؟ کیا احمدیوں کا خلیفہ یہ کام کرتا؟ خان صاحب آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ بھٹو نے عوام کو مایوس کیا تھا۔ لوگ اُن کے قریب جانے سے ڈرتے تھے۔ وہ لوگوں کی عزتِ نفس تک کو مجروح کر کے رکھ دیتے تھے۔ تو پھر کون تھا جو سوئی ہوئی عوام کو

ایوانوں سے نکال کر گلیوں اور سڑکوں پر لا کھڑا کرتا؟ یہ کام بے نظیر اور نصرت بھٹو کے بس میں بھی نہ تھا۔ وہ آہ و بکا سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ اور یہ کام اُنہوں نے خوب کیا۔

جس طرح بھٹو کو پاکستانی قوم کی خدمت کرنے کا موقع ملا تھا اس سے فائدہ اُٹھا کر اگر وہ چاہتے تو قائد اعظم کی طرح قوم کے محسنوں میں شمار ہوتے لیکن اُنہوں نے یہ سنہری موقع خود غرضی کے ہاتھوں ضائع کر دیا۔ وہ اگر چاہتے تو سر ونسٹن چرچل سے بھی زیادہ محبوب لیڈر بن سکتے تھے۔ دونوں کے اقتدار کا عرصہ تقریباً ایک جتنا تھا۔ سر ونسٹن چرچل دوسری جنگ عظیم کے دوران ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک اقتدار میں رہے۔ محوری طاقتوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر کے انہوں نے اپنی قوم کو فتح و نصرت سے ہمکنار کرایا۔ لیکن جنگ کے بعد جب اُن کی قوم نے اقتدار اُن سے واپس لینے کا فیصلہ کیا تو وہ نہایت وقار کے ساتھ اقتدار سے علیحدہ ہو گئے۔ اُن کی جنگی خدمات کے صلے میں اُنہیں سر کا خطاب دیا گیا اور یوں وہ رہتی دنیا تک امر ہو گئے۔

بھٹو ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک اقتدار میں رہے۔ جس وقت انہوں نے اقتدار سنبھالا اُس وقت پاکستانی قوم ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گری ہوئی تھی۔ پاکستانی افواج ذلت آمیز شکست کے بعد غیر مشروط طور پر ہندوستان کے سامنے ہتھیار ڈال چکی تھی۔ ہاری ہوئی قوم کے حوصلے پست تھے۔ اور اس ذلت کی ذمہ داری کے چھینٹوں کی لپیٹ میں وہ بھی صاف دکھائی دیتے تھے۔ تاہم قوم نے اپنی قسمت کا فیصلہ اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ لیکن وڈیرہ خصلت بھٹو نے سمجھا کہ یہ ہاری ہوئی قوم استعماری طاقتوں نے اُن کے ہاتھوں بیعہ کر دی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے پاکستان کو اپنی جاگیر سمجھ کر اُس کی قسمت سے کھیلنا شروع کر دیا۔ اپنے ذاتی اقتدار کو دوام بخشنے کی خاطر اُنہوں نے ایک ایک کر کے تمام اداروں کو بے اثر کر دیا۔ اپنے خاندان کی شان و شوکت اور وجاہت قائم کرنے کیلئے اُنہوں نے عوام کے مفاد کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اپنے مخالف لیڈروں کو ہر حالت میں نیچا دکھانے کی کوشش میں عوام پر عدم اعتماد کرتے ہوئے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں اُنہوں نے دھاندلی کا راستہ اختیار کیا۔ عوام نے اقتدار سے علیحدہ ہو کر از سر نو انتخابات کروانے کا مطالبہ کیا لیکن وہ اقتدار سے چمٹے رہے۔ سر ونسٹن چرچل والی عالی ظرفی اور وقار کا اُن میں فقدان تھا۔ حشر کیا ہوا؟ عبرتناک !! بندوق کی نالی سے اُنہیں اقتدار سے علیحدہ کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ مجرمانہ قتل کی سازش کا اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت نے اُنہیں نہ صرف مجرم بلکہ محض نام کا مسلم اور عادی دروغ گو گردان کر موت کی سزا

سنائی۔ ۳۲۳ دن تک اُنہیں اذیت ناک قید تنہائی میں رکھا گیا۔ عوام اُن کا ساتھ چھوڑ گئے۔ نہایت حسرت و یاس کے عالم میں وہ تن تنہا رہ گئے۔ موت کے پھندے تک چل کر جانے کی اُن میں سکت نہ رہی ۔۔ اُنہیں گھسیٹ کر پھانسی گھاٹ تک لے جایا گیا۔ اور بالکل اُسی طرح گلے میں پھندا ڈال کر لٹکا دیا گیا جیسے کتے کو لٹکاتے ہیں....

بھٹو جب اکیاون سال کے ہوئے اور باون میں قدم رکھا تو اُس وقت سپریم کورٹ نے اُن کی موت کی سزا کی توثیق کر دی تھی۔ جن ملاؤں نے اُنہیں تختۂ دار تک پہنچایا تھا وہی اب حاکم وقت سے مطالبہ کرنے لگے کہ پھانسی کو ایک سال کیلئے مؤخر کر دیا جائے۔ اسلئے نہیں کہ وہ بھٹو کو مزید ایک سال تک زندہ دیکھنا چاہتے تھے بلکہ اِسلئے کہ اگر اس سے قبل اُنہیں پھانسی دیدی جاتی تو مرزا غلام احمدؑ کی وہ پیشگوئی پوری ہو جاتی جس میں اُن کی جماعت کو اِستحصال کا نشانہ بنانے والے ایک شخص کی باون سال کی عمر میں کتے کی موت مارے جانے کی خبر تھی۔ لیکن بھٹو کی سزا کو مزید مؤخر کرنے میں ضیاء الحق کی اپنی جان کو خطرہ لاحق تھا۔ اُس کے مطابق قبر ایک تھی اور لاشیں دو۔ ایک سال کے بعد ضیاءؔ کو خود اُس قبر میں پہنچ جانے کا خدشہ تھا۔ اِسلئے یہ تقدیرِ مبرم تھی کہ مرزا غلام احمدؑ کی پیشگوئی کے مطابق بھٹو کی موت اپنی عمر کے ۵۲ ویں سال کے آغاز میں واقع ہو۔

جس بات کو کہے کہ کرونگا یہ میں ضرور
ٹلتی نہیں وہ بات خدائی یہی تو ہے

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے بھٹو کو اِس قدر عجلت اور رازداری سے پھانسی دی گئی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اس کیلئے اس قدر سخت حفاظتی اِنتظامات کئے گئے تھے کہ پھانسی والے دِن راولپنڈی جیل اور سہالہ ریسٹ ہاؤس کو، جہاں نصرت بھٹو اور بے نظیر نظر بند تھیں، کا رابطہ تمام دنیا سے کاٹ دیا گیا۔ جس لمحے جیل کے عملے کو بتایا گیا کہ آج رات بھٹو کو پھانسی دی جا رہی ہے، اُس لمحے کے بعد نہ تو کسی شخص کو جیل میں داخل ہونے دیا گیا اور نہ ہی کسی کو باہر نکلنے دیا گیا جب تک کہ اُن کی لاش اُن کے آبائی گاؤں نہ پہنچ گئی۔ جیل کے دروازوں پر فوج کے سپاہی متعین کر کے تمام راستے بند کر دئے گئے۔ ٹیلیفون لائنیں کاٹ دی گئیں۔ صرف وائرلیس اور فوجی ٹیلیفون کے ذریعے مارشل لاءٔ حکام سے رابطہ تھا۔ پھانسی سے پہلے بھٹو سے اُن کی اہلیہ نصرت بھٹو اور اُن کی بیٹی بے نظیر کے علاوہ اور کسی رشتہ دار کو اُن سے آخری ملاقات کا

پہنچا دیا گیا۔ جیل سے متعلقہ سٹاف کے علاوہ سول اِنتظامیہ کے کسی آفیسر کو بھی اِس کے بارے میں خبر نہ دی گئی۔ حتیٰ کہ بھٹو کو پھانسی دیئے جانے کے بعد آئی جی جیل خانہ جات جب رہائش گاہ کو جانے لگے تو فوجی سپاہیوں نے اُنہیں بھی روک لیا۔ تاہم بعد میں اُنہیں جانے دیا گیا۔ اُن کے ذریعے یہ خبر لاہور سے ہوتی ہوئی بارڈر پار کر گئی۔ اس طرح صبح آٹھ بجے کے قریب آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے سب سے پہلے دنیا تک پہنچی۔ اخباری نمائندوں کو پھانسی کے وقت نہ تو جیل کے اندر جانے کی اجازت دی گئی اور نہ ہی کفن دفن سے پہلے اُن تک کوئی خبر پہنچنے دی گئی۔ چنانچہ جن حالات میں بھٹو کو پھانسی دی گئی اُس کے بارے میں جو بھی خبر اخباروں میں چھپتی وہ محض قیاس آرائیوں پر مبنی ہوتی۔

حکومت کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ اور پریس کو ہر طرح کی قیاس آرائی کرنے کی اجازت۔ اسلئے اخبارات نے محض افواہوں کی بنیاد پر بھٹو کی پھانسی کے آخری لمحات کے بارے میں نہایت ہی دلسوز اور سنسنی خیز خبریں چھاپنی شروع کر دیں۔ کئی مہینوں تک اخبارات اور رسالہ جات اُلٹی سیدھی خبروں کے ذریعے اُن کی موت کو کیش کرتے رہے۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کو چونکہ صیغہ ٔراز میں رکھا گیا تھا اِسلئے لوگ ہر نئی خبر کو بڑے تجسس سے پڑھتے۔ جس کے ذہن میں جو آتا وہ لکھ دیتا۔ سب سے سنسنی خیز خبر یہ تھی کہ اُنہیں پھانسی پر چڑھانے سے پہلے ہی فوجی افسروں نے ٹھڈے مار مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اور جب وہ دم توڑ گئے تو اُن کو اُٹھا کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ایک افواہ یہ تھی کہ جنرل چشتی اُن سے بعض دستاویزات پر دستخط کروانا چاہتے تھے۔ جب اُنھوں نے اِنکار کیا تو اُن پر تشدد کیا گیا جس کے نتیجے میں وہ دم توڑ گئے۔ اِس پر پردہ ڈالنے کیلئے اُن کو پھانسی دے کر سپردِ خاک کر دیا گیا۔

جو ذمہ دار حکام عینی شاہد تھے اُن کے حوالے سے کوئی بیان جاری نہ ہوا۔ آخر اخبارات نے نچلے عملے کی ٹوہ لگانی شروع کر دی۔ سب سے اہم کردار تارا مسیح تھا جس نے بھٹو صاحب کے گلے میں پھندا کسا تھا۔ حکومت نے اُس کی جان کو خطرے کے پیشِ نظر کافی عرصہ تک اُسے منظرِ عام سے غائب کروا دیا۔ کئی سالوں کے بعد جب اُس کے واسطے سے خبر چھپی تو اُس سے صرف یہ تصدیق ہوسکی کہ جس وقت اُنہیں پھانسی پر لٹکایا گیا اُس وقت نہ صرف یہ کہ وہ زندہ تھے بلکہ اپنے پاؤں پر بھی کھڑے تھے۔

بھٹو کی موت کے بعد ضیاءُ الحق نے آٹھ سال تک مطلق العنان آمر کی حیثیت سے ملک

پر حکومت کی۔ اس عرصہ میں اُن کے درباری بدلتے رہے۔ سب سے پہلے چشتی کی چھٹی ہوئی۔ اس کے بعد جنرل سوار خان گئے۔ جنرل رحیم الدین الوداع ہوئے اور کے ایم عارف رخصت ہوئے۔ کسی کو بھی بھٹو کی پھانسی کے بارے میں ضیاٗ کی زندگی میں لب ہلانے کی جراٗت نہ ہوئی۔ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو ضیاٗ الحق کی ہلاکت کے بعد ملک میں پہلی بار اولی انتخابی جمہوریت قائم ہوئی۔ ضیاٗ الحق کے درباریوں کو بھی بھٹو کی موت کے اصل حالات پر سے پردہ اُٹھانے کی توفیق ملی۔ اس سلسلے میں جو سب سے مستند کتاب چھپی، وہ اُس شخص کے مشاہدات اور انکشافات پر مشتمل ہے جو بھٹو کے آخرِی ۳۲۳ دِن کی قیدِ تنہائی کے عرصہ میں مارشل لاٗ اتھارٹی کی طرف سے راولپنڈی جیل کے سپیشل سپر نٹنڈنٹ تھے۔ کرنل رفیع الدین لکھتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنے دوستوں کے اِصرار پر ۱۹۸۷ء کے اواخر میں جنرل ضیاٗ سے ملاقات کر کے اُن سے اپنی یاداشتیں لکھنے کی اجازت چاہی تو اُنہوں نے سخت غصے میں مجھے متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ بھٹو کو مرے ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں اور لوگ اُسے بھول چکے ہیں۔ حتیٰ کہ اس کے اپنے رشتہ دار بھی اُسے بھولنے والے ہیں۔ مجھے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھتے ہوئے عقل سے کام لینا چاہیئے اور مردوں کو قبروں سے نکالنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ضیاٗ الحق کی موت کے تین سال بعد کرنل رفیع الدین نے بھٹو کے آخری ۳۲۳ دِن کے نام سے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب شائع کی۔ اپنی اِس یادداشت میں اُنہوں نے بھٹو صاحب کے شب و روز کی مصروفیات اور اُن سے اپنی ذاتی گفتگو پر مبنی تفصیلی حالات بیان کئے ہیں۔

باب ۲۰

بھٹو کے آخرِی لمحات

بھٹو صاحب کو پھانسی دیئے جانے کا وقت مقرر ہو جانے کے بعد تین اپریل ۱۹۷۹ء کی صبح سویرے بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو اُن سے آخری ملاقات کی اطلاع کر دی گئی۔ اُسی دن گیارہ بج کر ۳۰ منٹ پر ان دونوں خواتین کی بھٹو صاحب سے ملاقات شروع ہوئی۔ بھٹو سیل کے اندر رہے اور باہر سے لوہے والے جنگلے پر تالا لگا رہا۔ بیگم نصرت بھٹو کیلئے سیل کے دروازے کے ساتھ باہر کرسی لگا دی گئی۔ جبکہ محترمہ بے نظیر بھٹو سیل کے جنگلے کے باہر دالان کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ یہ ملاقات بعد دوپہر دو بجے تک جاری رہی۔ ملاقات شروع ہونے کے چند لمحوں بعد بھٹو نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ کیا یہ آخرِی ملاقات ہے؟ جس کا اُس نے ہاں میں جواب دیا۔ بھٹو نے محترمہ بے نظیر کو ایک طرف ہونے کو کہا اور جیل سپرنٹنڈنٹ کو اِشارے سے بالکل اپنے پاس بلایا اور پوچھا واقعی یہ آخرِی ملاقات ہے۔ اُنہوں نے جواب میں کہا ہاں یہ درست ہے۔ پھر بھٹو نے پوچھا آخرِی فیصلے کا کیا ہوا؟ اِس پر یار محمد نے جواب دیا کہ وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ پھر بھٹو نے پوچھا کس وقت؟ اُنہوں نے جواب دیا 'معمول کے مطابق یعنی صبح ساڑھے پانچ بجے۔ بھٹو نے ہاتھ کے اِشارے کے ساتھ کہا: Thats all?' ''بس ختم؟'' جیلر نے کہا ''جی جناب!!''

''اِس پر بھٹو صاحب نے کہا کہ میں نے شیو کرنی ہے اور میرے کپڑوں کا کیا ہوگا اور پھر میری وصیت کا کیا ہوگا جس پر چودھری یار محمد نے اُنہیں بتایا کہ ان کو وقت دیا جائے گا تا کہ وصیت لکھ سکیں۔ جیلر کے بیان کے مطابق بیگم بھٹو تقریباً پوری ملاقات میں خاموش بیٹھی

رہیں۔ محترمہ بے نظیر زیادہ وقت روتی رہیں اور بھٹو صاحب سے باتیں کرتی رہیں۔ بھٹو نے چاہا کہ ملاقات جاری رہے لیکن جیل حکام نے دو بجے بعد دوپہر ملاقات ختم کرادی۔

ملاقات کے فوراً بعد دونوں بیگمات نے کرنل رفیع الدین سے ملاقات کی۔ اُنہوں نے دونوں کو غم میں ڈوبا اور نڈھال پایا۔ اُن کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی دکھائی دے رہیں تھیں۔ بیگم بھٹو نے انہیں کہا کہ وہ جنرل ضیاءُ الحق سے ذاتی رحم کی اپیل کرنا چاہتی ہیں۔ اُن کا پیغام حکام بالا تک پہنچادیا گیا۔ جنرل ضیاءُ الحق کی نمائندگی میں میجر جنرل صغیر حسین سید ڈپٹی مارشل لاءایڈمنسٹریٹر نے سہالہ ریسٹ ہاؤس میں دونوں بیگمات سے ملاقات کی۔ بیگم بھٹو نے اُنہیں تحریری طور پر صدر کے نام اپنے شوہر کیلئے رحم کی اپیل کی درخواست پیش کی۔ اس اپیل کا حشر بھی وہی ہوا جو اِس سے پہلی اپیلوں کا ہو چکا تھا۔

شام ساڑھے چھ بجے کے قریب سپرنٹنڈنٹ جیل، مجسٹریٹ، ڈاکٹر اور کرنل رفیع الدین کے ہمراہ بھٹو صاحب کے سیل میں اُنہیں پھانسی دیئے جانے کی اطلاع دینے کے لئے گئے۔ اُس وقت وہ گدے کے اوپر دیوار کے ساتھ پشت لگائے بیٹھے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے اُنہیں پھانسی کا حکم پڑھ کر سنایا جس کا متن یہ تھا:

''آپ، مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو لاہور ہائی کورٹ نے ۱۸ مارچ ۱۹۷۸ء کو نواب محمد احمد خاں کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ آپ کی اپیل سپریم کورٹ آف پاکستان نے ۶ فروری ۱۹۷۹ء کو نامنظور کردی اور ریویو پٹیشن بھی ۲۴ مارچ ۱۹۷۹ء کو نامنظور کردی گئی۔ صدر پاکستان نے اس کیس میں مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اِسلئے آپ کو اب پھانسی دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔''

کرنل رفیع کا بیان ہے کہ بھٹو صاحب نے خندہ پیشانی کیساتھ بغیر کسی گھبراہٹ یا پریشانی کے یہ حکم سنا۔ اس کے بعد اُنہوں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تحکمانہ انداز میں کہا:

''پھانسی لگنے سے چوبیس گھنٹے قبل حاکم مجاز کی طرف سے مجھے اِس کے بارے میں بتایا جانا چاہیئے تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اِس کے برعکس آج ساڑھے گیارہ بجے جب میری بیٹی اور بیگم مجھ سے ملاقات کیلئے آئیں تو اُن کو اِس کا یقینی علم نہ تھا۔ میری پھانسی کا تحریری حکم مجھے ابھی تک نہیں دکھایا گیا۔ میں اپنے وکلاء سے جلد سے جلد ملنا چاہتا ہوں۔ میرے دوسرے رشتہ داروں کو بھی مجھ سے ملنے کی اجازت دی جانی چاہیئے تھی۔ میرے دانت خراب ہیں اِسلئے میں اپنے ڈینٹسٹ مسٹر ظفر نیازی سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔''

کرنل رفیع الدین کا بیان ہے کہ بھٹو صاحب کے ان الفاظ کے معاً بعد مجسٹریٹ درجہ اول مسٹر بشیر احمد خاں نے اپنے آپ کو متعارف کرایا اور بھٹو صاحب سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی وصیت لکھ سکتے ہیں جس کیلئے کاغذ وغیرہ مہیا کر دیا جائے گا۔ یہاں جیل سپرنٹنڈنٹ کا سرکاری پیغام ختم ہوا۔ اور پارٹی جانے لگی۔ کرنل رفیع بیان کرتے ہیں کہ اس ماحول میں اُن کی کیفیت اُس وقت عجیب سی ہوگئی وہ بھی کچھ حواس باختہ سے ہو کر جیسے سکتے میں آ گئے۔ اتنے میں بھٹو صاحب اُٹھے اور پہلا قدم لینے پر لڑکھڑائے۔ اُنہوں نے اُنہیں سہارا دیا۔ کہنے لگے میرے پیٹ میں لاغری ہے۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہنے لگے رفیع میں ٹھیک ہوں۔ —— اس کے بعد بھٹو صاحب نے اپنے مشقتی عبدالرحمٰن کو آواز دی اور اُسے کہا کہ میں شیو کرنا چاہتا ہوں۔ ''میں بلڈی ملاں نہیں کہ ایسی حالت میں خداوند تعالیٰ کے سامنے جاؤں۔'' اس کے بعد وہ اُن کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے رفیع یہ کیا ڈرامہ کھیلا جارہا ہے؟ اُنہوں نے جواب دیا: ''جناب میں نے کبھی آپ کے ساتھ مذاق کیا ہے؟'' اُنہوں نے فوراً کہا'' تمہارا کیا مطلب ہے؟'' اُنہوں نے پھر دہرایا تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں نے جواب دیا: ''جناب آخری حکم مِل گیا ہے۔ آج آپ کو پھانسی دی جارہی ہے۔''

کرنل رفیع بیان کرتے ہیں کہ اُنہوں نے مسٹر بھٹو میں پہلی دفعہ وحشت کے آثار دیکھے۔ اُنہوں نے بلند آواز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا: ''ختم......؟؟ بس ختم —— ؟؟'' میں نے جواب میں کہا: ''جی جناب!'' بھٹو صاحب کی آنکھیں وحشت اور اندرونی گھبراہٹ سے جیسے پھٹ سی گئی ہوں۔ اُن کے چہرے پر خشکی اور زردی طاری ہوگئی جو اُنہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُن کی حالت بیان سے باہر تھی۔ بھٹو صاحب نے پوچھا: ''کس وقت؟'' میری خاموشی پر پھر پوچھا: ''کس وقت......؟'' اور پھر پوچھا: ''کیا آج؟'' کرنل رفیع کا بیان ہے کہ اُس نے اپنے ہاتھوں کی سات انگلیاں اُن کے سامنے کیں۔ ''سات دِن بعد؟'' بھٹو صاحب نے پھر سوال کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اُن کے نزدیک ہو کر سرگوشی میں بتایا: ''جناب گھنٹے!!'' اُنہوں نے کہا: ''آج رات سات گھنٹوں بعد؟'' کرنل رفیع نے سر ہلاتے ہوئے ہاں میں جواب دیا۔ کرنل رفیع بھٹو صاحب کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب سے اُنہیں پنڈی جیل میں لایا گیا تھا اُس وقت سے وہ مضبوط اور سخت چٹان بنے ہوئے تھے لیکن

اس موقع پر وہ بالکل تحلیل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد وہ پھر بولے:
"رفیع بس؟" اُنہوں نے پھر سر ہلاتے ہوئے ہاں کا اِشارہ کیا۔

تھوڑے وقفے کے بعد اُنہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا:

"میرے وکلاء نے اِس کیس کو خراب کیا۔ یحیٰ (بختیار) میری پھانسی کا ذمہ دار ہے۔ وہ مجھے غلط بتاتا رہا۔ اُس نے اِس کیس کا ستیاناس کیا۔ اُس نے ہمیشہ مجھے سبز باغ دکھائے۔"

پھر کہنے لگے: "میری پارٹی کو مردہ بھٹو کی ضرورت تھی زندہ بھٹو کی نہیں۔"

یوں معلوم ہوتا ہے کہ بھٹو صاحب کو مکمل یقین تھا کہ اُنہیں پھانسی نہیں دی جائے گی۔ وہ اس مقدمے کو ایک سیاسی سٹنٹ ہی سمجھتے رہے۔ اُنہیں اپنی عالمی شہرت اور عوام میں مقبولیت پر بے حد گھمنڈ تھا اسلئے آخر دم تک وہ یہی خیال کرتے رہے کہ ضیاءُ الحق عالمی رائے عامہ کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔ اور اُنہیں پھانسی دینے کی جرأت نہیں کرے گا۔ چنانچہ تین اپریل کو اُن کی بیگم اور بیٹی کو تو یقین آ گیا تھا کہ حکومت اُن کو پھانسی لگانے کا تہیہ کر چکی ہے لیکن بھٹو صاحب کو ابھی تک سب کچھ دکھاوا معلوم ہو رہا تھا۔

ہائی کورٹ کے فیصلے میں عادی دروغ گو قرار دئے جانے پر سپریم کورٹ میں بیان دیتے ہوئے بھٹو صاحب نے اِس بات پر زور دے کر کہا تھا کہ اُنہیں بیشک پھانسی پر لٹکا دیا جائے مگر وہ یہ ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ تاریخ میں اُن کا نام جھوٹوں کے ساتھ لکھا جائے۔ کاش بھٹو پھانسی پر چڑھتے وقت بھی اِس بات کو یاد رکھتے اور جوانمردوں اور بہادروں کی طرح تختۂ دار پر چڑھتے اور پھانسی کا پھندا چوم کر خود اپنے گلے میں ڈال لیتے!! اگر وہ ایسا کرتے تو آج اُن کا نام تاریخ میں سنہری لفظوں کے ساتھ لکھا جاتا! تمام عینی شاہدوں کا اِس بات پر اتفاق ہے کہ جس وقت بھٹو صاحب کو اِس بات کا یقین ہو گیا کہ اب اُن کو پھانسی دے دی جائے گی اور اس سے کسی صورت بھی مفر نہیں اُسی لمحے اُن کا اپنے اعصاب پر سے کنٹرول جاتا رہا۔ اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔

کرنل رفیع کے مطابق رات ۷ بج کر ۵ منٹ پر بھٹو صاحب نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ خواجہ غلام رسول کی نگرانی میں شیو بنائی۔ شیو کے دوران اُنہوں نے مندرجہ ذیل بات چیت کی:

"ڈپٹی صاحب آپ لوگوں کو ایسا لیڈر کہاں سے ملے گا۔ مگر آپ کو ضرورت کیا ہے، ضرورت تو غریبوں کو تھی۔ میں موچی دروازے میں موچیوں کے سامنے تقریریں کیا کرتا تھا کیونکہ میں خود موچی

ہوں۔ تم لوگ غریبوں کا لیڈر چھین رہے ہو۔ میں اِنقلابی آدمی ہوں۔ غریبوں کا حامی۔ یار مجھے مارنا ہی تھا تو دو سال خراب کیوں کیا۔ (بھٹو صاحب شاید یہ بھول گئے تھے کہ مقدمے کو طول اُنہوں نے خود دیا تھا) میری عزت کیوں نہیں کی جو ساری دنیا میں ہے؟ مجھے کسی ریسٹ ہاؤس یا کسی کوٹھی میں رکھتے اور عزت سے مار دیتے۔ آج اِسلامی کانفرنس کے چیئرمین کو (بھٹو ابھی تک اپنے آپ کو اِسلامی کانفرنس کا چیئرمین تصور کرتے تھے) جسے ساری دنیا نے منتخب کیا ہے شیو کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ ساتھ کھڑے ہو کہ بلیڈ سے خود کو ضرب نہ لگا لوں۔ دوسری بات ہاں! یار تجھے میں نے بہت تنگ کیا ہے، مجھے معاف کر دینا، دوسرے مجرموں سے جھوٹ بکواس کروا کر مجھے پھانسی کے پھندے پر چڑھا کر اُنہیں چھوڑ دینا چاہتے ہو۔"

پھر اُنہوں نے باہر والے سنتری کو بلایا اور ڈپٹی صاحب سے کہا:

''میرے مرنے کے بعد میری گھڑی اِس سپاہی کو دے دینا۔''

ڈپٹی نے کہا: ''ٹھیک ہے جناب!''

شام آٹھ بج کر پانچ منٹ پر مشقتی عبدالرحمٰن نے بھٹو صاحب کے کہنے پر کافی کا ایک کپ بنا کر دیا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس سے کہنے لگے:

''رحمٰن مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ پھانسی تو لگ ہی جانا ہے۔ آج میری آخری رات تیرے ساتھ ہے۔ میں چند گھنٹوں کیلئے تیرا مہمان ہوں۔''

کرنل رفیع بیان کرتے ہیں کہ ۸ بج کر ۱۵ منٹ سے ۹ بج کر ۴۰ منٹ تک وہ وصیت لکھتے رہے۔ اِس کے بعد دس منٹ وہ میز پر شیشہ، کنگھی، بالوں کا برش، تیل کی بوتل، اور جائے نماز اور تولیہ بچھا کر اُس پر رکھتے اور ہٹاتے رہے۔ ۹ بج کر ۵۵ منٹ پر برش سے دانت صاف کئے۔ منہ ہاتھ دھویا، بالوں کو کنگھی سے سنوارا۔ پھر تقریباً ۵ منٹ کیلئے سگار کی راکھ اور چند جلے ہوئے کاغذوں کی راکھ کاغذ کی مدد سے صاف کرتے رہے۔...... رات ۱۰ بج کر ۱۰ منٹ سے ۱۱ بج کر ۵ منٹ تک لکھتے رہے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے تمام کاغذ جو اُنہوں نے لکھے تھے جلا ڈالے۔ جلے ہوئے کاغذوں کی راکھ سیل میں پھیل گئی۔ اُنہوں نے مشقتی عبدالرحمٰن کو بلایا اور اُسے سیل صاف کرنے کو کہا۔ اُنہوں نے سنتری سے پوچھا: ''کتنا وقت رہ گیا ہے؟'' سنتری نے جواب دیا: ''جناب کافی وقت ہے۔''

کہنے لگے: ''کتنا؟ ایک گھنٹہ؟ دو گھنٹے؟'' مگر سنتری خاموش رہا۔ پھر خود ہی کہا کہ ایک دو گھنٹے سو سکتا ہوں۔ سنتری نے جواب دیا: ''جی جناب!'' پھر کہا: ''کہیں جگا تو نہ دو گے؟''

۱۱بج کر۱۰منٹ پر وہ لیٹ گئے۔ ۱۱بج کر۲۵ منٹ پر کہا:

''میں کوشش کرتا ہوں تھوڑی دیر سو لوں کیونکہ میں کل رات نہیں سویا! ویسے مجھے پتہ ہے کہ آپ لوگ مجھے ۱۲بجے جگا دیں گے!!''

کچھ دیر بعد لیٹے لیٹے اُنہوں نے صنم ! صنم!......پکارا۔ صنم بھٹو صاحب کی چھوٹی صاحبزادی کا نام ہے۔ بھٹو صاحب کا شک درست نکلا۔ جیل کا عملہ ۱۲بجے سے پہلے ہی اُنہیں جگانے کیلئے آ پہنچا۔ اُنہوں نے بھٹو صاحب کو جگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ جاگے۔ اس پر اُن کو شک گزرا کہ اُنہوں نے کہیں خودکشی تو نہیں کرلی۔ چنانچہ اُن کا تین دفعہ ڈاکٹری معائنہ کیا گیا۔ ہر دفعہ ڈاکٹر نے بتایا کہ اُن کی نبض چل رہی ہے، آنکھ کی پتلی ٹھیک ہے، دِل کی دھڑکن ٹھیک ہے۔ اسلئے وہ زندہ ہیں۔ کرنل رفیع سمیت جیل کا عملہ ۱۲بجے سے لے کر ایک بجے تک اُنہیں جگاتا رہا لیکن وہ نہ جاگے۔ اِس سارے عرصے میں وہ اُنہیں چوری آنکھ سے دیکھ لیتے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے سیل میں داخل ہوتے وقت بھٹو صاحب کی کھلی آنکھ دیکھ لی تھی۔ ڈاکٹر نے اُنہیں بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ بھٹو صاحب بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ مکر کر رہے ہیں۔ اسلئے اُنہوں نے اُنہیں مزید جگانے کی کوشش ترک کردی اور واپس اپنے دفتر میں آ کر بیٹھ گئے۔ کرنل رفیع لکھتے ہیں:

''رات ایک بج کر دس منٹ پر بھٹو صاحب خود بخود اُٹھ بیٹھے۔ مسٹر قریشی نے اُنہیں بتایا کہ نہانے کیلئے گرم پانی موجود ہے مگر بھٹو صاحب نے بتایا کہ اب وہ نہانا نہیں چاہتے۔

''حکم کے مطابق بھٹو صاحب کو۳/۴ اپریل ۱۹۷۹ کی درمیانی شب کو دو بجے انسپکٹر جیل خانہ جات کی موجودگی میں پھانسی لگانا تھا۔ وہ تین اپریل کی صبح سے راولپنڈی جیل میں حاضر تھے......

''متذکرہ بالا افسران کی پارٹی رات ایک بج کر۳۵ منٹ پر پورے حفاظتی انتظامات کرنے کے بعد بھٹو صاحب کے سیل کے اندر گئی۔ بھٹو صاحب گدے پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور جاگ رہے تھے۔ مجسٹریٹ نے پوچھا: 'کیا وہ وصیت چھوڑنا چاہتے ہیں؟' ...... بھٹو صاحب خاموش رہے۔ اُن کا رنگ بالکل پھیکا اور زرد پڑ چکا تھا۔ کچھ دیر کے بعد بولے تو اُن کی آواز نحیف اور بے حد کمزور تھی اور صاف سنائی نہ دے رہی تھی۔ اُنہوں نے کوشش کرکے کہا:

''I-----had ---tried---but----my ----thoughts ---- were ----so upset --- that.--- I------ could ---- not----do ---it. --- I --have--- burnt--- it.

مطلب یہ کہ ''میں نے کوشش تو کی تھی لیکن میرے خیالات اس قدر درہم برہم تھے کہ میں لکھ نہ سکا۔ میں نے اسے جلا دیا۔''

کرنل رفیع لکھتے ہیں کہ انہوں نے بھٹو صاحب کے قریب جا کر کہا کہ آیا وہ چل کر جائیں گے یا وہ لوگ اُنہیں اُٹھا کر لے جائیں؟ اُنہوں نے اُنہیں کوئی جواب نہ دیا بلکہ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ چند لمحوں بعد اُنہوں نے اُسی فقرے کو دہرایا۔ لیکن وہ انہیں اسی طرح دیکھتے رہے اور پھر بولے: "I pity ee" اِس کے بعد جو اُنہوں نے کہا وہ ہم میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُنہوں نے آگے جھک کر کہا:

''معاف کیجئے گا میں آپ کو سمجھ نہیں سکا!''

اُنہوں نے اُسی فقرے کو دہرایا لیکن میں آخری ایک دو لفظ پھر بھی نہ سمجھ سکا۔ میں اُن کے چہرے پر پوری طرح جھک گیا اور کہا:

''معاف کیجئے گا! میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔''

وہ بے حد کمزوری اور وقفے وقفے کے بعد بولے:

'"I pi ty my wa if lef t me"

یعنی ''افسوس کہ میری بیوی مجھے چھوڑ کر چلی گئی!''

کرنل رفیع کہتے ہیں کہ وہ بہت پر اضطرار اور دلسوز حالت تھی۔ وہ اُن کے اِس جواب پر بالکل شل اور بے حِس ہو گئے۔

مجسٹریٹ نے دوبارہ آگے بڑھ کر اُن سے پوچھا: ''آپ کچھ وصیت کرنا چاہتے ہیں؟''

بھٹو صاحب خاموش رہے۔ مجسٹریٹ نے پھر پوچھا: ''آپ وصیت لکھوانا چاہتے ہیں؟''

اُنہوں نے جواب دیا: "--Ye s I wou ld l ike to dic tate"

آخری لمحات کرنل رفیع کے الفاظ میں ملاحظہ ہوں:

''اس لمحے وقت ختم ہو چکا تھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے ہیڈ وارڈر کو حکم دیا کہ وہ اپنے آدمی اندر لائے اور مسٹر بھٹو کو اُٹھا لیں۔ چار وارڈر اندر داخل ہوئے۔ دو نے اُن کے بازو اور دو نے اُن کے پاؤں اور ٹانگیں پکڑ کر اُن کو اوپر اُٹھا لیا۔ جب اُن کو اُٹھایا جا رہا تھا تو اُنہوں نے کہا: ''مجھے چھوڑ دو!'' جب اُن کو سیل سے باہر نکالا جا رہا تھا تو اُن کی کمر تقریباً فرش کے ساتھ لگ رہی تھی۔ اُن کی قمیص کا پچھلا حصہ اُن وارڈروں کے پاؤں کے نیچے آیا جو اُن کو ٹانگوں سے پکڑے ہوئے تھے، اور قمیص پھٹنے کی آواز آئی۔ دالان میں اُن کو سٹریچر پر ڈال دیا گیا۔ اُن کے دونوں ہاتھ پیٹ کے سامنے لا کر اُن میں ہتھکڑی لگا دی گئی۔......

''چاروں وارڈروں نے سٹریچر کو چاروں کونوں سے اُٹھالیا۔ بھٹو صاحب سٹریچر پر بے جس و حرکت پڑے رہے۔ اُن کے پاؤں پیلے زرد نظر آ رہے تھے جیسے کہ جسم میں خون بالکل کم ہوگیا ہو۔ پھانسی گھاٹ وہاں سے کوئی ڈھائی سو گز کے فاصلے پر تھا۔ پھانسی کی جگہ وارڈروں نے سٹریچر زمین پر رکھا اور دو نے بھٹو صاحب کی بغلوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر اُن کو پھانسی کے پھندے تک پہنچایا۔ میں بھٹو صاحب کے نزدیک ترین تھا۔ میرے کان اُن کے چہرے سے ایک یا دو فٹ سے زیادہ دور نہ تھے۔ اُن کے ہاتھوں سے کڑی نکال کر اُن کے ہاتھ ایک جھٹکے سے کھینچ کر اُن کی کمر کے پیچھے لے جا کر اُن میں دوبارہ ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اسی دوران تارا مسیح نے اُن کے سر اور چہرے پر ماسک چڑھا دیا۔ شاید اُنہیں سانس لینے میں دقت ہوئی یا ہتھکڑی اُن کے ہاتھوں کو چبھتی تھی، اسلئے اُنہوں نے کہا: 'یہ مجھے......' شاید وہ کہنا چاہتے ہوں کہ یہ مجھے تکلیف دے رہی ہے۔ مگر میں اُن کی یہ آخری بات نہ سن سکا۔ ٹھیک دو بج کر چار منٹ پر ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو جلاد نے لیور دبایا اور بھٹو صاحب ایک جھٹکے کے ساتھ پھانسی کے کنوئیں میں گر پڑے۔ میں اوپر سے سیڑھیوں کے ذریعے اُتر کر کنوئیں کے کھلے رُخ نیچے گیا اور دیکھا کہ بھٹو صاحب کا جسم معمولی ہل رہا تھا جو اوپر سے نیچے گرنے کی وجہ سے تھا۔ لیکن وہ اُس وقت مردہ حالت میں تھے۔ میں انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کے پاس اُن کرسیوں پر آ کر بیٹھ گیا جو لٹکی ہوئی لاش کے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب کا سر اُن کی گردن پر بائیں طرف جھک گیا تھا کیونکہ پھانسی کے پھندے کا رسا اُن کی دائیں طرف سے اوپر گیا ہوا تھا۔

''بھٹو صاحب کی لاش کا اِس طرح لٹکنا میرے لئے ایک نہ بھلا سکنے والا منظر ہے۔ میں آج تک جب بھی اِس کا تصور کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ پھانسی پر لٹکائے جانے کے بعد اور جیل ڈاکٹر کے سرٹیفکیٹ پر کہ اُن کی موت واقع ہو چکی ہے، بھٹو صاحب کی لاش کو دو بج کر پینتیس منٹ پر پھانسی کے پھندے سے جدا کیا گیا۔ اُن کی میت کو غسل دیا گیا جس کا بندوبست وہیں کرلیا گیا تھا۔ ایک فوٹو گرافر نے، جسے ایک انٹیلی جینس ایجنسی نے خاص طور پر بھیجا تھا، ضرورت کے مطابق بھٹو صاحب کی لاش کے چند فوٹو اُتارے۔ اِن تصویروں سے حکام کا شک دور ہوگیا کہ اِسلامی سنت کے مطابق اُن کے ختنے نہیں ہوئے تھے۔'' (۱۵۶)

عبرت کا مقام ہے کہ وہ شخص جسے اسلامی ملکوں کی کانفرنس کا منتخب سربراہ ہونے کا دعویٰ تھا اور جس نے اسلام کا علمبردار بننے کی خاطر مسلمانوں کے ایک فرقے کو دائرۂ اسلام سے خارج کروایا تھا، اُسے اُس کی زندگی میں عدالت عظمیٰ نے محض نام کا مسلمان اور عادی دروغ گو قرار دیا اور موت کے بعد اُس وقت تک اُس کی نماز جنازہ نہ پڑھنے دی گئی جب تک حکام نے یہ تصدیق نہ کرلی کہ اُس کے اسلامی سنت کے مطابق ختنے بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔

بہر حال راتوں رات بھٹو صاحب کی لاش بذریعہ ہوائی جہاز جیکب آباد اور پھر وہاں سے بذریعہ ہیلی کاپٹر نوڈیرو پہنچا دی گئی۔ وہاں پر اُن کے گاؤں کے لوگوں اور اُن کے رشتہ داروں نے اُن کی نماز جنازہ ادا کی۔ اس طرح نہایت رازداری سے اُنہیں اُن کے آبائی قبرستان واقع گڑھی خدا بخش بھٹو میں سپرد خاک کردیا گیا۔

بھٹو کو اپنے راستے سے ہٹا کر جنرل ضیاءٔ نے سکھ کا سانس لیا۔ جنرل کے ایم عارف کے مطابق بھٹو کی پھانسی کے بعد اگلے دِن وہ بڑے اکڑ کر اپنے مشیروں کی میٹنگ کی صدارت کیلئے آئے۔ اُن کے بال سیاہ تھے۔ اُن میں پہلے سے زیادہ خوداعتمادی پائی جاتی تھی۔ روئیداد خان کے مطابق ضیاء الحق بھٹو کو اپنے راستے سے ہٹانے کیلئے تلے ہوئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یا اُس کی گردن تہہ تیغ ہوگی یا میری۔ اسلئے وہ اپنی جان کیلئے کسی قسم کا خطرہ مول لینے کیلئے تیار نہ تھے۔ روئیداد خان لکھتے ہیں کہ یہ تأثر غلط ہے کہ ضیاءُ الحق اِنصاف کے تقاضے پورے کر رہے تھے یا عدالتوں کی طرف سے دی گئی سزاؤں میں اصولی طور پر کوئی کمی یا تبدیلی نہ کرتے تھے۔ بھٹو کی سزا سے قبل بھی اور بعد میں بھی اُنہوں نے اعلیٰ عدالتوں کی طرف سے دی گئی سزاؤں میں تخفیف بھی کی اور تبدیلی بھی۔ اِس سلسلے میں نہ تو وہ اعلیٰ عدالتوں کی پرواہ کرتے تھے اور نہ ہی وزارتِ داخلہ کی۔

ضیاءٔ کے سیکریٹری داخلہ کے نزدیک ۵ جولائی سے قبل کے حالات سے ملک میں مارشل لاء نافذ کرنے کا ہرگز کوئی جواز نہ تھا۔ جس انداز سے بھٹو کے خلاف از سرِ نو مقدمہ قتل کی تفتیش ہوئی، اُن پر مقدمہ چلا، اُس کا فیصلہ ہوا اور پھر جس عجلت سے فیصلے پر عمل درآمد ہوا یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھے۔ جس دِن بھٹو کی حکومت کا فوج نے تختہ اُلٹا تھا اُن کی موت اُسی لمحے اُن کا مقدر بن چکی تھی۔ (۱۵۷)

مجیب اور بھٹو

مماثلت

☆ دونوں کے خلاف سازش کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ ایک کے خلاف ملک کے خلاف سازش اور دوسرے کے خلاف فردِ واحد کے خلاف سازش۔

☆ دونوں کے خلاف فوجی حکومتوں نے مقدمات بنائے۔

☆ دونوں کے خلاف سول عدالتوں میں مقدمہ چلا۔

☆ دونوں کیسوں میں سزا موت تھی۔

☆ دونوں کے ساتھ دیگر لوگ بھی شامل تھے جنہیں اُنہوں نے جرم پر اُکسایا۔

☆ دونوں فوج کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔

☆ دونوں کی اولاد میں سے صرف دو دو بیٹیاں زندہ بچیں۔

☆ دونوں کی بڑی بیٹیاں باپ کے نام پر سیاست کر کے ملک کی وزیراعظم بنیں۔

تضادات

☆ شیخ مجیب تحریک پاکستان میں شامل تھے جبکہ بھٹو قیام پاکستان کے کئی سال بعد پاکستان آئے۔

☆ شیخ مجیب کے خلاف سیاسی بنیادوں پر جبکہ بھٹو کے خلاف اپنے سیاسی مخالف کے قتل میں موث پائے جانے پر مقدمہ قائم ہوا۔

☆ شیخ مجیب کا رویہ عدالت میں مؤدبانہ اور تعاون کا رہا جبکہ بھٹو صاحب کا رویہ ججوں کے ساتھ تحقیر آمیز اور کھلے بندوں نفرت کا۔

☆ شیخ مجیب کے وکلاء نے کیس کی پیروی پوری تیاری سے کی جبکہ بھٹو صاحب کے وکلاء قانونی پہلوؤں کو نظرانداز کر کے اُسے سیاسی رنگ دینے کی کوشش میں مصروف رہے۔

☆ شیخ مجیب کی رہائی کیلئے تمام سیاست دان ایوب خان کے خلاف متحد ہو گئے۔ اس کے برعکس بھٹو صاحب کے معاملہ میں کم وبیش سارے سیاست دان ضیاءُ الحق سے اُن کی موت کا مطالبہ کرنے لگے۔

☆ شیخ مجیب کی رہائی کیلئے لوگ گلیوں میں نکل آئے۔ بھٹو صاحب کی رہائی کیلئے پی پی پی نے کوئی مہم نہ چلائی۔ بلکہ اُن کے پھانسی پر لٹک جانے کے بعد بھی لوگ سہمے رہے۔

☆ شیخ مجیب کا بیت المکرم والا گھر اور فوجی چھاؤنی کا وہ ریسٹ ہاؤس جہاں وہ فوج کی حراست میں رہے تھے بنگلہ دیش حکومت نے قومی میوزیم بنا دئے۔ جبکہ بھٹو صاحب کی ایسی کوئی یادگار نہ ہے۔

بے حس سرمایہ دار

کچھ دن قوم بھٹو کے سوگ میں گم سم رہی اس کے بعد زندگی پھر اپنی پرانی ڈگر پر چل پڑی۔ مالی سال ختم ہونے کو تھا اس لئے مزدوروں کی یونین مل مالکان سے زیادہ سے زیادہ بونس حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گئی۔ چند دن بعد صبح کی شفٹ کی تبدیلی کے وقت یونین کے عہدیداروں نے اپنی گیٹ میٹنگز کرنی شروع کر دیں۔ مزدور لیڈر ان جلسوں میں انتظامیہ کو خوب لتاڑتے مگر جلسہ جلوس کے معاً بعد یونین کے سارے کے سارے عہدیدار کرنل شوکت کے دفتر میں جا پہنچتے جہاں پر وہ چائے اور بسکٹ اُڑا رہے ہوتے۔ جس کو بیٹھنے کیلئے کرسی نہ ملتی وہ اُس کی میز پر بیٹھ جاتا۔ سابقہ فوجی ہونے کے ناطے میرے لئے یہ ڈسپلن اور تہذیب کے خلاف تھا۔ میں چونکہ اُنہیں اپنے دفتر میں اس قسم کی حرکات نہیں کرنے دیتا تھا اس لئے وہ مجھ سے نالاں تھے۔ بعد میں جو مجھ پر گزری اُس کے تناظر میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن کو میرے عقیدے کی بنا پر بھی مجھ سے عناد ہو لیکن اس سلسلے میں کھل کر کوئی سامنے نہ آیا۔

چنانچہ اب اُنہوں نے مجھے بھی اپنی گیٹ میٹنگز میں طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور پھر ایک دِن وہ میرے دفتر میں گھس آئے۔ اُن میں سے ایک نے چپکے سے میرے دفتر کے دروازے کی اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اُن کی اِس حرکت سے میں اُن کی نیت بھانپ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ مجھے کرسی پر بیٹھے کو دبوچ لیتے میں نے جلدی سے اُٹھ کر ایک زوردار مکے کی ضرب سے قریبی کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ اُن کا مقابلہ کرنے کیلئے میں نے اپنی کرسی اُٹھا لی جس سے میں اُن کے وار روکتا رہا۔ میرے چپڑاسی کے شور مچانے پر وہ جلدی سے کنڈی کھول کر بھاگ گئے۔ میرے دائیں بازو کی بڑی شریان کٹ گئی تھی جس سے خون کا فوارہ اُبل رہا تھا۔ میں نے ہمت کر کے اپنے بائیں ہاتھ کی پوری قوت سے زخم والی جگہ سے بازو کو جکڑ لیا۔ تاہم ہسپتال تک پہنچتے پہنچتے کافی خون ضائع ہو چکا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ بر وقت طبی امداد مل جانے سے جان بچ گئی۔ زخم اتنا بڑا تھا کہ خون بند کرنے کیلئے نو ٹانکے لگانے پڑے۔ علاج کیلئے مجھے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا جہاں میں تین ہفتے زیرِ علاج رہا۔ میرے عزیز و اقارب کے علاوہ ساتھی افسران اور عملہ کے لوگ بھی میری تیمارداری کیلئے کم و بیش ہر روز آتے رہے۔ لیکن مل مالکان نے نہ تو ہسپتال میں میری خیریت دریافت کی اور نہ ہی دوبارہ ڈیوٹی

پر حاضر ہونے پر ہی میری مزاج پُرسی کی۔ اُس بات کا مجھے دلی طور پر دکھ تھا۔ سرمایہ داروں کے اس قسم کے رویّے کی وجہ سے مل مزدور یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ اُن کی نظر میں مشین اور مزدور میں کوئی فرق نہیں۔ مشین ناکارہ ہو جائے بدلی کر دو۔ مزدور بیکار ہو جائے بدلی کر دو۔ لہٰذا مل مالکان کے رویّے سے دلبرداشتہ ہو کر میں نے وہاں سے استعفیٰ دیدیا۔

انہی دنوں ضیاء الحق نے ایک آرڈیننس کے ذریعے جداگانہ نظام انتخاب نافذ کرکے غیر جماعتی بنیادوں پر لوکل باڈیز کے انتخابات کا ڈھونگ رچایا۔ اس کے باوجود پیپلز پارٹی کے ''بے نظیر'' ٹائپ کے امیدوار اچھی خاصی تعداد میں جیت گئے۔ جس سے ضیاء اور اُس کے ساتھی بوکھلا گئے۔ چنانچہ جنرل ضیاء نے اکتوبر کے دوسرے ہفتے ۱۷نومبر ۱۹۷۹ء کو اعلان کردہ انتخابات ایک دفعہ پھر غیر معیّنہ مدت کیلئے ملتوی کر دئے۔ مارشل لأ سخت کرکے سیاسی پارٹیوں کے دفاتر سر بمہر کر دئے گئے۔ اُن کے فنڈ زمنجمد کر دئے گئے اور ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اخبارات پر سنسر لگا دیا گیا۔ اِس کے ساتھ ہی ضیاء الحق نے بھٹو مخالف جماعتوں کو ایک دفعہ پھر اپنے ساتھ ملا کر قومی حکومت سازی کا ڈھونگ رچانا چاہا لیکن سوائے جماعت اِسلامی کے اور کسی بھی اہم پارٹی نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔

پی این اے والوں نے بھٹو کی حکومت کی برطرفی پر خوب خوشیاں منائیں تھیں لیکن اُس کے خاتمے کے ساتھ ہی پی این اے کا بھی شیرزاہ بکھر گیا۔ چھوٹی چھوٹی سیاسی پارٹیاں آئندہ اِنتخابات میں پی پی پی کی جیت سے خوفزدہ ہو کر فرداً فرداً جنرل ضیأ سے ملاقات کرکے اُن کو مشورہ دینے لگیں کہ فی الحال اِنتخابات کیلئے فضا سازگار نہیں ہے اِسلئے اِنہیں کچھ عرصہ کیلئے ملتوی کر دیا جائے۔ لیکن جب ضیأ الحق نے اپنا اقتدار مستحکم ہونے پر سیاسی لیڈروں کو اقتدار کی ہوس میں دم ہلانے والے کتوں سے تشبیہ دینی شروع کی تو تب اُنہیں اپنی غلطی کا اِحساس ہوا۔ اس کے بعد پی این اے کے لیڈروں نے اِس بات کا علی الاعلان اقرار کیا کہ فوج کی طرف سے ۵ جولائی کو مارشل لأ لگانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ حکومت نے تو پی این اے کے تمام اہم مطالبات تسلیم کر لئے تھے اور اگلے دِن معاہدے پر دستخط ہونے والے تھے۔ لیکن اصغر خان اور بیگم نسیم ولی خان نے فوج کی شہ پر مزید نو نکات پیش کرتے ہوئے اِسے رد کر دیا اور اعلان کیا کہ جب تک اِن مطالبات کو تسلیم نہیں کیا جاتا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ حالات سازگار دیکھ کر اگلے دِن ضیاء الحق نے حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں

پک گئیں کھیت۔ اب تو پیر تسمہ پا قوم کے کندھوں پر سوار ہو چکا تھا۔ خود کردہ را علاج نیست۔

انتخابات سے توجہ ہٹا کر دائیں بازو کی مذہب پرست جماعتوں کی حمایت حاصل کرنے کیلئے ضیاء نے نفاذِ اسلام کے نام پر بعض تعزیراتی اقدامات کا اعلان کیا۔ اس کے تحت بھوک کے ہاتھوں روٹی کا ٹکڑا چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹنا، زنا بالجبر کا شکار ہونے والی بے سہارا عورتوں کو غنڈوں اور وڈیروں کی جھوٹی گواہیوں کی بنا پر سنگسار کرنا اور مخالفوں کے گھروں میں دو بوتلیں شراب کی چھپا کر پولیس کی مخبری سے اُن کو کوڑوں کی سزا دلوانا تھا۔ پولیس کی تو چاندی ہوگئی۔ ملک میں اب بیک وقت تین قسم کے قوانین نافذ تھے۔ تعزیراتِ پاکستان، مارشل لاٗ اور حدود آرڈیننس۔ جس پر جو قانون فٹ آتا پولیس اُس کے تحت اُسے دھر لیتی اور معاملہ آخر کار مک مکا پر ختم ہوتا۔ اور جو مک مکا نہ کر سکتا وہ جیلوں میں پڑا سڑتا رہتا۔

بھٹو سے امریکہ اس لئے ناراض تھا کہ اُنہوں نے پاکستان میں جوہری پروگرام کا آغاز کیا۔ اُنہیں اقتدار سے علیحدہ کروا کر امریکہ کو اُمید تھی کہ نیا حکمران طبقہ امریکی خوشنودی کی خاطر اپنا جوہری پروگرام ترک کر دے گا۔ لیکن جب اُس کے بار بار کے دباؤ کے باوجود بھی پاکستان نے اپنی جوہری ترقیاتی پالیسی کو ترک نہ کیا تو اُس نے پاکستان کی ہر قسم کی ترقیاتی امداد بند کر دی۔ حالات نے پلٹا کھایا۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں روسی فوجیں افغانستان میں داخل ہوگئیں۔ لاکھوں افغان اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ اِن مہاجرین پر اُٹھنے والے اخراجات نے ایک طرف تو پاکستان کی معیشت کو کمزور کیا دوسری طرف ضیاء الحق کے اقتدار کی بقا کو دوام بخش دیا۔ دنیا بھر میں روس کے اِس اقدام کے خلاف سخت احتجاج ہوا۔ اسلامی کانفرنس کی تنظیم، غیر وابستہ ملکوں کی تحریک اور اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے الگ الگ قرار دادیں منظور کر کے مطالبہ کیا کہ روسی فوجیں فوری طور پر افغانستان سے نکل جائیں۔ ہر فورم پہ انسانی ہمدردی کے نام پر پاکستان میں افغان مہاجرین کی مالی اور سفارتی امداد کی اپیل کی جانے لگی۔ دنیا کی توجہ پاکستان میں فوجی مداخلت سے ہٹ کر افغانستان میں غیر ملکی مداخلت کی طرف مبذول ہوگئی۔

شاہ کی ایران سے رُخصتی کے بعد امریکہ کے مفادات کے تحفظ کیلئے اس خطے میں پاکستان کی سٹریٹیجک پوزیشن اور بھی اہمیت کی حامل ہوگئی تھی۔ روسی فوجیں خلیج فارس کے دہانے پر کھڑی تھیں۔ اپنے وسیع تر قومی مفادات کے تحفظ کی خاطر اُس وقت کے امریکی صدر جمی

کارٹر کو پھر سے پاکستان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جمہوریت اور انسانی حقوق کے خودساختہ اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر از سرنو پاکستان کے ساتھ تعلقات اُستوار کرنے کی کوشش کی گئی۔ امریکہ کی طرف سے ۴۰۰ ملین ڈالر کی فوجی امداد کی پیشکش کی گئی۔ اُس وقت تک جنرل ضیا کو اپنی اہمیت کا علم ہو چکا تھا۔ اسلئے اُس نے ''مٹھی بھر مونگ پھلی'' سے تشبیہ دے کر یہ امداد قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کارٹر کے جانے کے بعد امریکی پالیسی میں تبدیلی آئی اور ریگن انتظامیہ نے افغان مہاجرین اور مجاہدین کیلئے رہائش، خوراک اور اسلحہ کی فراہمی کیلئے پاکستان کی بھرپور امداد کرنا شروع کر دی۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے پچھلے چند سالوں سے عرب ممالک اپنی مسلح افواج کو منظم کرنے میں مصروف تھے۔ اِتفاق سے اُن دِنوں لیبیا کیلئے سابقہ فوجیوں کی بھرتی ہو رہی تھی۔ میں نے بھی درخواست دے دی۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد اُن کے رابطہ آفیسر کرنل حسین امام سے میری جان پہچان ہوگئی۔ اُس نے مجھے بطور ایڈمنسٹریٹو آفیسر بھرتی کر کے ۲۶ جون ۱۹۸۰ء کو اپنے ایک لبی کارکن کے ہمراہ لیبیا بھجوا دیا۔ ۲۷ جون بروز جمعۃ المبارک پانچ بجے بعد دوپہر ہمارا طیارہ ٹریپولی ایئرپورٹ پر اُترا۔

باب ۲۱

قذافی اور شگاری کے دیس میں

لیبیا رقبہ کے لحاظ سے پاکستان سے دگنا لیکن آبادی کراچی سے بھی کم۔ تیل کی دولت سے مالا مال۔ کرنل قذافی نے ساٹھ کے عشرے میں شاہ ادریس کا تختہ اُلٹ کر فوج کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کیا اور پھر سوشلزم کے نام پر عرب نیشلزم کا علمبردار بن گیا۔ فوج اور پولیس کی مدد سے اُس نے لیبیا میں سٹالن ٹائپ ڈکٹیٹرشپ قائم کر رکھی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں پاکستان کے شہر لاہور میں منعقدہ اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس کے موقع پر بھٹو نے سوشلزم کے نام پر کرنل قذافی کیساتھ ذاتی دوستی گانٹھ لی جس نے بعد میں دونوں خاندانوں کے قریبی مراسم کی بنیاد ڈالی۔ انہی تعلقات کی بنا پر بھٹو کے دور میں بہت سے سابق اور حاضر سروس فوجی لیبیا میں بطور مشیر بھیجے گئے۔ اس کے بعد حالات بدلے۔ فوج نے بھٹو کی حکومت کا تختہ اُلٹ کر اُن پر قتل کا مقدمہ چلایا۔ سپریم کورٹ نے اُنہیں موت کی سزا سنائی۔ دیگر سربراہانِ مملکت کی طرح قذافی نے بھی ضیأ سے رحم کی اپیل کی۔ لیکن ضیاء نے سب اپیلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھٹو کو پھانسی پر لٹکوا دیا۔ اِس پر کرنل قذافی نے طیش میں آکر لیبیا میں مقیم پاکستانیوں کو ملک چھوڑ دینے کا حکم دے دیا۔ کرنل قذافی کا غصہ ٹھنڈا ہونے پر لیبیا کی حکومت نے از سرِ نو افرادی قوت بھرتی کرنے کیلئے حکومت پاکستان سے رابطہ کیا۔ اِس دفعہ نظم و ضبط قائم کرنے والے افراد کے نام سے ایسے افراد کو بھی بھرتی کیا گیا جنہیں تخریب کاری کی تربیت دے کر الذوالفقار جیسی تنظیموں میں شامل کیا جس سکے۔

بہر حال ائرپورٹ سے فارغ ہونے میں ہمیں کوئی ایک گھنٹہ لگا۔ ہمارے پاسپورٹوں پر

دخول لگوانے کے بعد ہمارے ساتھ آنے والا لحی ہمیں ایئرپورٹ پر چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ ہم سب یہ سوچ کر انتظار کرنے لگے کہ شاید وہ ہمارے لئے ٹرانسپورٹ کا بندوبست کرنے گیا ہے۔ لیکن جب گھنٹہ بھر گزرنے کے بعد بھی وہ نہ آیا تو ہمیں پریشانی ہوئی۔ ادھر اُدھر اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ ہم سب نے اپنے بیگ اُٹھائے اور اس اُمید پر ائرپورٹ سے باہر آکر کھڑے ہوگئے کہ شاید کوئی فوجی گاڑی ہمیں لینے آجائے۔ اتنے میں مجھے ملٹری پولیس کی ایک گاڑی آتی نظر آئی۔ ہماری جان میں جان آئی کہ چلو دیر سہی کوئی ہمیں لینے آتو گیا۔ گاڑی آکر کار پارک کے دروازے پر رُک گئی۔ ہم لپک کر اُس کی طرف گئے تو ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر دراز دوفیتیوں والے نائیک نے کرخت لہجے سے ہمیں جھڑکتے ہوئے عربی میں کچھ کہا اور اِس سے پہلے کہ ہم اُسے اپنی بپتا سناتے وہ گاڑی لے کر واپس چلے گئے۔ جمعہ کا دِن تھا سارے لیبیا میں ہفتہ وار تعطیل تھی۔ سورج بھی آہستہ آہستہ نیچے جارہا تھا۔ ائرپورٹ پر اب خال خال آدمی نظر آتا تھا۔ ٹریپولی شہر یہاں سے کوئی تیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ ایئرپورٹ کے نزدیک نہ تو کوئی ہوٹل تھا اور نہ ہی ہمارے پاس اِتنے پیسے تھے کہ ہم ہوٹل کا خرچہ برداشت کرسکتے۔ کچھ فاصلے پر ایک ملٹری پولیس کی چوکی پر ملٹری پولیس کے دو سپاہی کھڑے تھے۔ میں نے اُنہیں انگریزی میں بتانے کی کوشش کی کہ ہم کون ہیں اور کیسے یہاں آئے ہیں لیکن اُنہوں نے بھی کندھے اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا کہ ہمیں تمہاری زبان کی سمجھ نہیں آتی۔

ابھی ہم یہ باتیں کرہی رہے تھے کہ اِتنے میں ہم سے چند میٹر کے فاصلے پر ایک فوجی جیپ آکر رُکی۔ اُس میں سے ایک نوجوان فوجی آفیسر اُتر کر چوکی کی طرف جانے لگا۔ میں نے اُس کے پاس جاکر پوچھا کہ آیا اُسے انگریزی آتی ہے۔ اُس نے مجھے انگریزی میں جواب دیا کہ ہاں آتی ہے۔ میں نے اُسے اپنی کہانی سنائی تو وہ بڑی ہمدردی سے بولا کہ آج جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل ہے جس کی وجہ سے ہمیں تکلیف اُٹھانی پڑی ہے۔ اُس نے ہمیں تسلی دی اور کہا کہ ہم یہیں اِنتظار کریں وہ پتہ کرکے ہمیں چھاؤنی میں پہنچانے کا بندوبست کرتا ہے۔ اِس کے بعد وہ چوکی میں چلا گیا اور کافی دیر ٹیلیفون کرتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد آکر کہنے لگا جمعہ کی چھٹی کی وجہ سے آپ لوگوں کے کیمپ کا پتہ لگانا تو مشکل ہے۔ میں نے گاڑی کا بندوبست کردیا ہے وہ آپ کو چھاؤنی میں پہنچا دے گی۔ یہ کہ کر وہ بھی چلا گیا اور ہم پھر انتظار

کرنے لگے۔ انتظار کی گھڑیاں بھی لمبی ہوتی ہیں۔ مجھے آنے والے حالات کے آثار بھی کچھ اچھے دکھائی نہ دیتے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے:

"Coming events cast their shadows before."

خدا خدا کر کے مزید گھنٹہ بھر کے انتظار کے بعد ایک فوجی ٹرک ہمارے پاس آ کر رکا۔ ہم خاموشی سے اس میں سوار ہو گئے اور وہ ہمیں لے کر اُجاڑ بیابان ریگستان میں ایک سنسان سڑک پر دوڑنے لگا۔ کوئی پون گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ ہمیں سمندر کے کنارے فوجی آفیسرز کی میس میں لے گیا۔ یہاں پر روس کے فوجی مشیر ٹھہرے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ باہر آیا اور اشارے سے بتایا کہ یہ جگہ نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ ہمیں ایک اور میس میں لے گیا۔ یہاں پر یوگوسلاویہ کے فوجی ٹھہرے ہوئے تھے جو ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی ہمارا مستقر نہ تھا۔ وہ ہمیں لے کر بحیرہ روم کے کنارے سڑک پر فراٹے بھرنے لگا۔ سورج ڈھل چکا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کھلے ٹرک میں سمندر کی ٹھنڈی ہوا بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ سارے دن کے سفر سے تھک کر سب لوگوں پر غنودگی طاری تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہمارا ٹرک اچانک ایک فوجی کیمپ کے گیٹ پر آ کر رُکا۔ سنتری نے ہماری گنتی کی اور ٹرک پھر چل پڑا اور ہمیں ایک بیرک کے سامنے لا کر اُتار دیا گیا۔ اس کے بعد میرے ساتھ آنے والے ایئر فورس کے عملے کو وہ بیرک میں لے گئے اور مجھے آفیسرز میس میں پہنچا دیا۔ میں نے میس میں کھانا کھایا اور مزے سے سو گیا۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد مجھے کیمپ کمانڈنٹ نے بلا کر بتایا کہ باقی لوگ تو اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے ہیں لیکن آپ کا چونکہ ایئر فورس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اس لئے اُس نے افسران بالا سے رابطہ کیا ہے جو آپ کو آپ کی ڈیوٹی کی جگہ پر پہنچانے کا بندوبست کریں گے۔ بہر حال یہاں سے مجھے ایک نوجوان پرائیویٹ کار میں لینے آیا اور اُس نے مجھے ٹریپولی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں پہنچا دیا۔ اور کہنے لگا کہ آج رات تو یہاں گزاریں کل آپکا پکا بندوبست کریں گے۔ اللہ کی شان ہے یا تو رات گزارنے کیلئے جگہ نہیں اور یا پھر انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل!! ایک دن اور دو راتیں میں نے سٹیٹ گیسٹ کی حیثیت سے اِنٹر کان میں گزاریں۔

پیر کے دِن دس بجے کے قریب وہ آدمی پھر گاڑی لے کر آ گیا اور مجھے لے کر ٹریپولی شہر میں طرابلس نامی ایک درمیانے درجے کے دس منزلہ ہوٹل میں پہنچا دیا۔ واہ مولا تیرے

رنگ کہاں انٹرکانٹی نینٹل اور کہاں یہ دس مربع میٹر کا کیوبیکل! سادہ سا سنگل بیڈ، ایک چھوٹا سا میز اور ایک کرسی۔ مشترکہ ٹائلٹ۔ کھانے کے کمرے میں بھی چھوٹے چھوٹے میز اور سادہ سی کرسیاں۔ لیکن تھا صاف ستھرا۔ یہاں پر بہت سی یوگوسلاوین نرسیں اور دیگر ہسپتالوں وغیرہ میں کام کرنے والا غیر ملکی مردانہ سٹاف ٹھہرا ہوا تھا۔ ہمارے ملک کے افسران کو لیبیا والے دیگر ممالک کے نچلے درجے کے سٹاف کے برابر حقوق دیتے تھے۔ بہر حال اُن کا ملک تھا، ان کا ہوٹل۔ میں نے کونسا یہاں پر مستقل قیام کرنا تھا جو احتجاج کرتا۔ میں کوئی دس دن تک یہاں پڑا رہا۔ کسی نے میری بات نہ پوچھی۔ ایک دو دفعہ میں نے ہوٹل کے منتظم سے دریافت کیا کہ مجھے میری ڈیوٹی کی جگہ پر کون پہنچائے گا تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ نہ تو وہ مجھ سے پیسے مانگتا اور نہ ہی کمرہ خالی کرنے کو کہتا۔ آخرِ ایک دِن میں پوچھتا پچھاتا فوجی ہیڈ کوارٹر میں جا پہنچا۔ یہ فوجی ہیڈ کوارٹر کئی ایکڑ زمین پر محیط ایک بہت اونچی فصیل نما چار دیواری کے اندر قائم تھا۔ اس بیرونی فصیل کے اندر ایک اور چار دیواری تھی۔ فصیل کے اوپر گردا گرد سنتری پوسٹیں تھیں۔ اس فصیل اور اندرونی چار دیواری کے درمیان سخت فوجی پہرہ تھا۔ فصیل کے باہر بھی دور دور تک فوج متعین تھی۔ مین گیٹ تک پہنچنے کیلئے مجھے متعدد بار چیکنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ استقبالیہ پر پہنچ کر میں نے اپنا تعارف کرایا تو اُنہوں نے مجھے ایک بیرک کے ویٹنگ روم میں پہنچا دیا۔ یہاں پر مجھ سے پہلے کوئی دس بارہ آدمی خاموشی سے بُت بنے بیٹھے تھے۔ ماحول خاصا پُر تکلف اور سنجیدہ تھا۔ ویٹنگ روم کی سامنے والی دیوار میں اُس آفیسر کے دفتر کا دروازہ کھلتا تھا جس سے ملنے کی خاطر ہم سب بیٹھے تھے۔ دروازے کے عین سامنے ایک دبلا پتلا لمبی ایک بڑی سے میز کے سامنے اپنے سے دوگنی بڑی کرسی میں گھسا بیٹھا تھا۔ اُس کا نام تو عثمان تھا لیکن بربری اُسے عُتمان کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو اُس نے مجھے بھی اِنتظار کرنے والوں کی قطار میں بٹھا دیا۔ گھنٹہ بھر کے اِنتظار کے بعد مجھے بتایا گیا کہ میں اگلے دِن آؤں۔ خوش قسمتی سے اگلے دِن جلد ہی میری ملاقات کی باری آ گئی۔ میں دفتر میں داخل ہؤا تو ایک لمبی سے ڈائننگ ٹیبل ٹائپ کی میز کے سرے پر فل کرنل کی وردی میں ایک دبلا پتلا مگر سمارٹ آفیسر بیٹھا تھا۔ عمر کوئی چالیس سال۔ اُس نے میری بات بڑے غور سے سنی اور پھر بولا: ''کرنل حسین ایم امام نے آپ کے بارے میں مجھے مطلع نہیں کیا۔ بہر حال ایک دو دِن میں آپ کو کسی مناسب کام پر لگا دیا جائے گا!!''

دو دِن کے بعد ایک صبح دس بجے کے قریب وہی ڈرائیور گاڑی لے کر پھر آ گیا جو مجھے اس ہوٹل میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر شہر سے باہر ریگستان کی طرف چل پڑا۔ ۱۲ بجے کے قریب ہم ایک فوجی کیمپ میں پہنچے۔ کیمپ کا انچارج ایک لیفٹیننٹ تھا۔ اُس نے مجھے میری ڈیوٹی کے بارے میں سمجھاتے ہوئے بتایا کہ میرا کام وہاں پر زیرِ تربیت لوگوں کو فوجی ٹریننگ دینا ہو گا۔ میں نے سوچا اُن کے اپنے لوگ ہوں گے جن کیلئے اُنہیں فوجی اِنسٹرکٹرز کی ضرورت ہے۔ اِسلئے میں نے مزید کوئی سوال پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور شام تک اپنا سامان لیکر واپس آنے کا کہہ کر وہاں سے رخصت ہوا۔

دفتر سے نکلا تو اچانک میرا ٹاکرہ ایک پاکستانی سے ہو گیا۔ پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر ہکا بکا سا رہ گیا اور پھر پوچھنے لگا کہ آیا میں یہاں پر پہلی دفعہ آیا ہوں؟ میں نے کہا ہاں مجھے آئے ہوئے چند دِن ہی ہوئے ہیں۔ جب اُسے پتہ چلا کہ میں سابقہ فوجی آفیسر ہوں تو کہنے لگا کہ وہ بھی پاکستان فوج کا سابقہ صوبیدار ہے اور ساتھ والے کیمپ میں مقیم ہے جہاں اور بھی سابقہ فوجی آفیسر ہیں۔ میں تو اپنے پاکستانی بھائیوں کو ملنے کو ترسا ہوا تھا۔ ڈرائیور کو انتظار کرنے کا کہہ کر میں اُس صوبیدار کے ہمراہ ساتھ والے کیمپ کی طرف چل پڑا۔ راستے میں مَیں نے دیکھا کہ ننگ دھڑنگ افریقی مویشیوں کی طرح پھر رہے ہیں۔ کسی کے کندھے پر تولیہ تھا اور کسی کے ہاتھ میں صابن لیکن اُن کے تن پر کپڑا نما کوئی چیز نہ تھی۔ کوئی اِدھر کھڑا جھاڑی کی طرف مُنہ کرکے پیشاب کر رہا تھا تو کوئی نل پر الف ننگا نہا رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس فوجی نے مجھے بتایا کہ مجھے ان وحشیوں کو فوجی ٹریننگ دے کر مہذب لوگوں کی موت کا ذمہ دار بننا تھا۔ اُنہیں دیکھ کر میں تو حواس باختہ ہو گیا۔

دوسرے کیمپ میں پہنچا تو میری ملاقات سردار عبدالرشید مرحوم کے بیٹے میجر (ر) اختر رشید سے ہوئی۔ میری سولہ سالہ فوجی نوکری کے دوران اُس کا اور میرا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ واہ میرے مولا کہاں کہاں کیسے کیسے لوگوں سے ملا دیا۔ بہرحال ایسے ملے جیسے صدیوں سے بچھڑے دو بھائی ملتے ہیں۔ پردیس جو ٹھہرا۔ مجھے دیکھتے ہی بھاگ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اِس کے بعد دوسرے ساتھیوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ اِن میں زیادہ تر سابقہ صوبیدار اور نائب صوبیدار تھے۔ میجر اختر کے علاوہ تین چار اور سابقہ فوجی آفیسر تھے جن میں ایک لیفٹیننٹ کرنل اشفاق احمد چیمہ بھی تھا۔ یہ آفیسر بعد ازاں فیصل آباد ترقیاتی ادارہ میں ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن اور

پھر نواز شریف دور میں گوجرانوالہ ترقیاتی ادارہ کا ڈائریکٹر جنرل بنا۔ میرے اس کیساتھ دوستانہ تعلقات اُس وقت قائم ہوئے جب وہ لیبیا سے واپس آ کر فیصل آباد ترقیاتی ادارہ میں ڈپٹی ڈائریکٹر لگا۔ میں نے جب اُنہیں اپنی کہانی سنائی تو سب کے سب یک زبان ہو کر بولے کہ اگر ممکن ہو سکے تو کیمپ میں ہرگز نہ آنا۔ یہ کیمپ قید خانے سے کم نہیں۔ انسان کی کوئی آزادی نہیں۔ یہ لوگ معاہدے کی شرائط سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ نہ تو اُس کے مطابق معاوضہ ادا کرتے ہیں اور نہ ہی دیگر سہولیات۔ یہ کیمپ نہیں بیگار کیمپ ہیں۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ اوّل تو اُنہیں ہر ماہ باقاعدگی سے تنخواہ دی نہیں جاتی، اور اگر دی جاتی ہے تو اُس میں سے صرف آدھی تنخواہ لیبیا سے باہر اپنے بال بچوں کو بھیجنے کی اجازت ہے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اُن سے ہر قسم کی بیگار کراتے ہیں۔ آفیسر اور ماتحت کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ لیبیا والوں نے اپنے اِرد گرد کے ہمسایہ افریقی ملکوں کی حکومت مخالف تنظیموں کے کارکنوں کو فرسٹ اپریل، گیارہ ستمبر اور اِسی قسم کے دیگر خفیہ کوڈ ناموں کے تحت مختلف کیمپوں میں جمع کر رکھا ہے۔ اِن لوگوں کو تخریب کاری کی ٹریننگ اور ہتھیار دیکر اُنہیں کرائے کے سپاہیوں کے طور پر حکومت مخالف کارروائیوں کیلئے بھیجا جاتا ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ جب اُنہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کے خلاف آواز بلند کی تو اُن کے کیمپ کو لبی فوجیوں نے گھیرے میں لے لیا اور دھمکی دی کہ ہڑتال ختم نہ کی تو سب کو شوٹ کر دیا جائے گا۔ اُس دِن سے نہ تو اُنہیں تنخواہ دی جاتی ہے اور نہ ہی کام۔ اُن کے پاسپورٹ اُنہوں نے پہلے ہی جمع کر رکھے تھے۔ اُن میں سے اِکّا دُکّا کو صرف اشد ضرورت کے تحت کیمپ سے باہر جانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اب وہ بے کسی کی حالت میں پڑے تھے۔ اُنہوں نے مجھے پھر زور دے کر کہا کہ میرے لئے بہتر یہی ہے کہ واپس پاکستان چلا جاؤں لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو اِس کیمپ میں ہرگز نہ آنا۔ ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے۔

چنانچہ میں نے پختہ اِرادہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں کیمپ میں نہیں آؤں گا۔ مجھے اِنہی لوگوں سے پتہ چلا کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس نہ تو کوئی کام ہے اور نہ کاج اور وہ اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہیں، لیکن وزارتِ داخلہ اُن کے پاسپورٹ پر خروج نہیں لگاتی۔ بے چارے بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔ اِس قسم کی کہانیاں سن کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے لیبیا سے واپس چلے جانے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ لیکن مشکل یہ تھی

ہ واپس جانا بھی اِتنا آسان نہ تھا۔ خوش قسمتی سے میرا پاسپورٹ ابھی تک میرے پاس تھا لیکن ایک تو میرے پاس کرائے کے پیسے نہ تھے دوسرے جب تک لیبیا کی وزارتِ داخلہ درج نہ لگائے اُس وقت تک میں لیبیا سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ واپس ہوٹل میں آ کر میں نے بہت دُعا کی کہ یا اللہ اگر روزی دینی ہی تھی تو عزت کی تو دیتا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ ہمارے خلیفہ ثالث حضرت مرزا ناصر احمدؒ صاحب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ نائیجیریا چلا جاؤں واپس جانے کی بجائے کیوں نہ نائیجیریا میں قسمت آزمائی جائے۔

اگلے دِن میں اپنے سفارت خانہ جا پہنچا۔ خوش قسمتی سے وہاں پر میری ملاقات توپخانے کے کرنل (ر) شاہ سے ہوگئی۔ افسوس کہ مجھے اُن کا نام بھول گیا ہے۔ وہ پاکستانی سفارت خانہ میں فرسٹ سیکریٹری تھے۔ میں نے جب اُنہیں اپنی کہانی سنا کر مدد کی درخواست کی تو وہ یکدم غصے میں آگئے اور کہنے لگے کہ پہلے تو لوگ حکومتِ پاکستان کو بتائے بغیر پیسوں کے لالچ میں مُنہ اُٹھا کر یہاں آجاتے ہیں اور یہاں آ کر جب مصیبت پڑتی ہے تو ہمارا مغز کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ میں تو پہلے ہی کئی دِنوں کا بھرا بیٹھا تھا۔ میں نے غصے میں سوال کہا:

''سر کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا حکومت پاکستان نے یہ سفارت خانہ ہم لوگوں کی خاطر نہیں کھولا؟ کیا آپ کا فرض نہیں کہ آپ ہماری مدد کریں؟''

''ہاں! مگر ہم صرف اُن لوگوں کی مدد کر سکتے ہیں جو حکومت سے این او سی لے کر آئیں۔ یہاں کیمپوں میں جتنے بھی پاکستان کے سابقہ فوجی پڑے ہیں اُن میں سے بلا اِمتیاز کوئی بھی حکومت سے این او سی لے کر نہیں آیا! کسی کا کنٹریکٹ لانگری کا ہے کسی کا بھنگی کا اور کسی کا واچ مین کا! اسلئے وہ اُن سے ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔''

کرنل صاحب نے بھی ذرا تیکھے انداز میں جواب دیا۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ میں نہ صرف یہ کہ وزارتِ دفاع سے بلکہ جی ایچ کیو سے بھی تحریری طور پر لیبیا، نائیجیریا اور جرمنی میں ملازمت اِختیار کرنے کی اجازت لے کر آیا ہوں۔ میں نے اُنہیں یہ بھی بتایا کہ میرا کنٹریکٹ لیبیا کی حکومت کیساتھ ایڈمنسٹریٹو آفیسر کا ہے۔ اگلے دِن جب میں نے اُنہیں اپنے سارے کاغذات دِکھائے تو اُن کی تسلی ہوئی۔ اب وہ مجھ سے بہت احترام سے بات کرنے لگے۔ اور چائے پانی بھی پلایا۔ مجھے اُنہوں نے بتایا کہ لیبیا کی حکومت کے حکام بہت سبک سر اور بدمغز ہیں۔ وہ تو سفارت کاروں کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ اُن کے مطابق جب وہ اُن سے ملنے

جاتے ہیں تو اُنہیں بھی کئی کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ اُن کا ایک جاننے والا ہے۔ وہ نسبتاً اچھا آدمی ہے۔ کرنل صاحب نے اُسے ٹیلیفون کرنے کا وعدہ کیا۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ اگر وہ میری مزید تھوڑی سی مدد کر دیں تو میں پاکستان جانے کی بجائے نائیجیریا میں قسمت آزمائی کرتا جاؤں۔ اُنہوں نے میرے سامنے ہی نائیجیریا کے سفارت خانہ میں فون کیا اور کہا کہ کل وہاں جا کر ویزہ لگوا لینا۔ اگلے دِن میں نائیجیریا کے سفارت خانہ گیا۔ وہاں سے مجھے تین ماہ کا ویزٹ ویزہ مِل گیا۔

میرے آنے کے تقریباً دو ہفتے بعد رمضان المبارک شروع ہو گیا تھا۔ لیبیا میں ماہِ رمضان کے دوران کاروبار زندگی تقریباً بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو لوگ تو ملازمت پیشہ نہیں وہ صبح سحری کھا کر سو جاتے ہیں اور جو دفتروں میں کام کرتے ہیں وہ گاڑیاں بھگاتے صبح دفتروں میں پہنچ جاتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے کرسیوں پر بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتے اور اگر کوئی کسی مجبوری کی وجہ سے اُن سے کوئی بات پوچھنا چاہے تو بڑی بے رخی سے جواب دیتے ہیں: ''انا صائم!'' یعنی بھائی صاحب تنگ مت کرو میں روزے سے ہوں۔ سب بازار بعد از دوپہر کھلتے ہیں لیکن افطار کے بعد تو سارا شہر زندہ ہو جاتا ہے ساری رات بازاروں میں رونق اور چہل پہل۔ ساری رات سحری تک خورد و نوش اور خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جونہی صبح کی نماز کی اذان ہوئی ہر دکان بند اور سارا بازار سنسان۔ یوں سمجھیں کہ یہاں ماہ رمضان میں دِن رات میں اور رات دِن میں بدل جاتے ہیں۔

مجھے لیبیا میں آئے تین ہفتے ہو چلے تھے۔ لیکن میں ابھی تک اِسی ہوٹل میں پڑا تھا۔ نہ مجھے کسی نے پوچھا اور نہ ہی میں کیمپ میں گیا۔ اِس وقفے میں میں نے نائیجیریا جانے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ ساری تیاری کے بعد کرنل شاہ کے کہنے پر میں پھر اُسی کرنل کے دفتر پہنچا تا کہ ٹکٹ اور خروج کا بندوبست ہو سکے۔ اُس کا سیکریٹری عُثمان آنکھیں بند کئے کرسی میں گھسا سویا پڑا تھا۔ میں نے جا کر اُسے بلایا تو آنکھیں ملتے ہوئے بولا:

''اب کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے کہا کہ میں نے کرنل صاحب سے ملنا ہے۔

وہ بھِنا کر کرسی کی طرف اِشارہ کر کے بولا: ''انا صائم!''

مجھے چونکہ عربی نہیں آتی تھی اور اُسے انگریزی بہت کم۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے پھر کہا: ''بھائی میں نے تیرے صاحب سے ملنا ہے!'' وہ ماتھے پہ ہاتھ

ہر بار پھر بولا: ''انا صائم!''

اس پر پہلے سے اِنتظار میں بیٹھے ایک پاکستانی نے میرے پاس آ کر آہستہ سے میرے کان میں کہا کہ یہ کہتا ہے میں روزے سے ہوں آرام سے بیٹھ کر انتظار کرو۔ مجھے تنگ نہ کرو۔ میں نے تعجب سے پوچھا: ''یہ رمضان میں کام نہیں کرتے کیا؟''

وہ بولا: ''کرتے ہیں، مگر اپنے انداز سے!''

قہر درویش بر جانِ درویش۔ میں بھی اُن کے ساتھ بیٹھ کر اِنتظار کرنے لگا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد اُس نے آنکھ کھولی۔ گھڑی کی طرف دیکھا۔ اور ایک لمبی سی انگڑائی لے کر بڑی مشکل سے کرسی سے اُٹھا اور کاپی پنسل لے کر اندر گیا۔ چند منٹوں کے بعد واپس آ کر مجھے کہنے لگا کرنل کہتا ہے کل آنا۔ میں صبر شکر کر کے واپس آ گیا۔ اگلے دِن پھر گیا۔ پھر یہی جواب کہ کل آنا۔ جب تیسرے دِن اُس نے اندر سے آ کر کہا کہ صاحب کہتا ہے کہ کل آنا تو میں اُس کے گلے پڑ گیا۔ وہ بندہ بھی غصے میں آ گیا اور بلند آواز سے عربی میں کچھ کہنے لگا جو میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس پر وہی پاکستانی آدمی جس نے مجھے انا صائم کا مطلب سمجھایا تھا پھر اُٹھ کر میرے پاس آیا۔ اُس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک طرف لے گیا اور پھر کان میں کہنے لگا:

''برخوردار! لگتا ہے نئے آئے ہو! کیوں اپنا سر کھپاتے ہو؟ میں تین دِن سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ ان لوگوں کو تیرے واہ ویلے کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں پاکستان فوج کا کرنل ہوں۔ پچھلے چار دِن سے مجھے بلا رہا ہے۔ میں آتا ہوں اور بیٹھ کر چلا جاتا ہوں۔ اِس بندے کے پاس میرے لئے وقت نہیں ہے۔ ان لوگوں کو کام وام کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف رُعب داب چاہیئے۔ کیوں اپنے آپ کو پریشان کرتے ہو! کھاؤ پیو اور موج کرو اور اِن سے تنخواہ وصول کرو!''

مجھے اُس کرنیل کی سوچ پر بہت حیرانی ہوئی۔ اُس کی نصیحت کو نظرانداز کرتے ہوئے میں نے اُسے بھی غصے سے جواب دیتے ہوئے کہا:

"I damm care ! I don`t want to stay here. I want to go back'

وہ بے چارہ پاکستانی کرنیل تو اپنا سا مُنہ لیکر بیٹھ گیا لیکن اِس شور شرابے کو سن کر لبی کرنل نے مجھے اندر بلا لیا۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ بڑے غصے میں بیٹھا تھا۔ اُس نے چھوٹتے ہی بڑے غصے سے پوچھا:

"What is the matter now?"

"I want to go back to Pakistan sir!

میں نے بھی بے دھڑک ہو کر جواب دیا۔

"What? you want to go back! why did you come here then?

وہ غصے سے پھٹ کر بولا۔ میں نے بڑے تحمل سے جواب دیتے ہوئے کہا:

"Sir! I was given a contract of an administrative officer but I am being asked to do something els on much lower salary. I am ready to work in accordance with my original contract but if you don`t have that job, just send me back to my country! I am even ready to forego my pay! you just give me a ticket and the exit on my passport, nothing more!"

اُس نے ایک دفعہ پھر حیران ہو کر پوچھا:

"Do you really want to go back?"

"Yes sir! I shall be thankful.I just want a ticket nothing more!"

اُس نے کہا ٹھیک ہے۔ چنانچہ اُس کے حکم پر ایک ہفتے کے اندر اندر میرے پاسپورٹ پر خروج بھی لگ گیا اور مجھے ٹریپولی سے اسلام آباد کا واپسی ٹکٹ بھی مِل گیا۔ وہ ٹکٹ میں نے براستہ لاگوس نائیجیریا تبدیل کروالیا اور جولائی کے آخر میں ایروفلوٹ کے کھٹارے میں بیٹھ کر لاگوس کے احمدیہ مشن ہاؤس میں پہنچ گیا۔ اللہ بھلا کرے کرنل شاہ کا جس کی مدد سے نہ صرف میرا خروج لگا بلکہ ایک ماہ کے بعد ہی لیبیا کی حکومت نے مجھے واپس جانے کیلئے ہوئی جہاز کا ٹکٹ بھی دے دیا۔ ورنہ وہ لوگ جو مجھ سے پہلے کیمپوں میں پڑے تھے مزید ڈیڑھ سال تک خجل خوار ہوتے رہے۔ اُن لوگوں کو نومبر ۱۹۸۱ء میں ضیأ حکومت کے وفاقی وزیر برائے محنت و افرادی قوت کی سرکردگی میں حکومت کا ایک وفد وہاں سے رہا کروا کر لایا۔ (۱۵۸)

بارہ کروڑ نفوس پر مشتمل آبادی کے لحاظ سے نائیجیریا افریقہ کا سب سے بڑا اور گنجان ترین آباد ملک ہے۔ تیل کی دولت سے مالا مال۔ ساٹھ کی دہائی میں انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ مسلمانوں کی تعداد تقریباً ساٹھ فی صد ہے۔ دوسرا بڑا مذہب عیسائیت ہے۔ اس کے علاوہ لامذہب اور بھوت پریت کے ماننے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ نائیجیریا کے شمالی حصہ میں ھاؤزہ مغرب میں یروبا اور جنوب مشرقی علاقہ میں ایبو قبائل کے لوگ آباد ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت ھاؤزہ قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایبو قبیلے میں مسلمان اور عیسائی دونوں مذاہب کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔ کئی سالوں کی فوجی حکومت کے بعد حال ہی میں

دوبارہ جمہوریت قائم ہوئی تھی۔ ملک کا صدر شگاری نام کا ایک مسلمان تھا۔ پاکستان کے برعکس یہاں پر ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ مسلمان اور عیسائی کھلے عام بازاروں، بسوں اور ریل گاڑیوں میں اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ جماعت احمدیہ سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُس وقت نائیجیریا میں اُن کی چالیس کے قریب مساجد تھیں۔ اس کے علاوہ اِن کے مشن ہاؤس بڑی مستعدی سے متعدد سکول، کالج، ہسپتال اور تبلیغی مراکز چلا رہے تھے۔ ان سارے اداروں کے نظم و نسق کیلئے لاگوس شہر میں جماعت احمدیہ کا مشن ہاؤس تھا جہاں پر اُن کا امیر و مشنری انچارج اپنے عملے اور دیگر مبلغین کے ساتھ مقیم تھا۔ امیر و مشنری انچارج، مبلغین، ڈاکٹرز اور اُساتذہ میں سے اکثریت کا تعلق پاکستان سے تھا۔

نائیجیریا کی سرکاری زبان انگریزی تھی۔ اپنی مخصوص قبائلی زبان کے علاوہ ہر شخص انگریزی سمجھتا اور بولتا تھا۔ حتیٰ کہ بازاروں میں چھابڑی لگانے والے بھی اپنے مخصوص افریقی لہجے میں انگریزی بولتے تھے۔ وہاں کے باشندے بڑے زندہ دِل اور موسیقی کے دلدادہ تھے۔ چھوٹوں، بڑوں، عورتوں، مردوں اور بچوں کے کان میں جونہی کہیں سے موسیقی کی دُھن پڑتی وہ وہیں اپنی کمر مٹکانے لگتے۔ اپنی سیاہ رنگت کی وجہ سے ابھی تک احساس کمتری کے شکار تھے۔ عامتہ الناس کیلئے یورپین کے علاوہ ہم ایشین بھی "وائٹ مین" تھے۔ غیر ملکیوں کے خلاف وہ تعصب نہیں تھا جو بر بر نسل کے عربوں میں پایا جاتا تھا۔ اُن کے مقابلے میں وہ بہت تہذیب یافتہ تھے۔ ہمارے ساتھ ادب اور اِحترام کا سلوک کرتے تھے۔ لاگوس شہر کی آبادی دو ملین کے قریب تھی۔ دولت زیادہ تر سرداروں اور صنعت کاروں کے ہاتھوں گردش کرتی۔ تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود عوام کی اکثریت بے حد غریب تھی۔ اکثر کے پاس تو سر چھپانے کیلئے بھی جگہ نہ تھی۔ رات کے وقت سڑکوں کے کنارے اور فٹ پاتھوں پر بچے اور بڑے اکثر سوئے پائے جاتے۔ جرائم کی شرح کافی اونچی تھی۔ کوئی کام بھی رشوت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ Bread یعنی ڈبل روٹی کے نام سے رشوت لیتے تھے۔

انہی دنوں ایک واقف کار کے ذریعے مجھے اوکاڈا گروپ آف کمپنیز میں بطور ایڈمنسٹریٹو آفیسر ملازمت مِل گئی۔ اِس کا مالک بنین شہر کا چیف اگبیڈین تھا۔ ہیڈ آفس لاگوس میں عام طور پر اُس کا انگریز جنرل مینیجر، ایک لیڈی سیکریٹری، ایک آفس کلرک اور دو تین مددگار

کارکنان تھے۔ چیف دفتر میں کبھی کبھی آتا تھا۔ کام کاج تو کوئی تھا نہیں۔ دو تین دن تک میں سارا سارا دِن بے کار بیٹھ کر شام کو واپس آجاتا۔ جی ایم سے جب کام کے بارے میں پوچھتا تو وہ کہتا کہ جب تک چیف کوئی کام نہیں دیتا آرام کرو۔ اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ لیکن نہ تو مجھے ابھی تک تقرری کا خط ملا تھا اور نہ کوئی ڈیوٹی۔ میں یہاں پر بغیر کاغذات کے کام کر رہا تھا جو خلاف قانون تھا۔ میں نے چیف سے اس بارے میں بات کی تو اُس نے کہا مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں یہ کمپنی کی ذمہ داری ہے۔ علاوہ ازیں معاہدے کے مطابق نہ تو مجھے ابھی تک رہائش مہیا کی گئی تھی اور نہ ہی ٹرانسپورٹ۔ میں ابھی تک مشن ہاؤس میں ہی رہ رہا تھا جو مناسب نہ تھا۔ لیکن کرتا بھی کیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

کچھ دنوں بعد چیف کا دس سیٹوں والا جیٹ جہاز انگریز عملہ برطانیہ سے لے کر آگیا۔ یہ اُس کی اوکاڈا ائرلائن کا تجرباتی جہاز تھا۔ چیف جب اِس کمپنی کے انگریز چیف اگزیکٹو کے ساتھ نائیجیریا کے مختلف علاقوں میں لینڈنگ سٹرپس کا معائنہ کرنے جاتا تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ اِس طرح میں نے قریب قریب سارے نائیجیریا کی سیر کرلی۔ میرے علاوہ دو اور نائیجیرین پبلک ریلیشنز آفیسرز اِس کمپنی میں کام کرتے تھے۔ ایک دن اِن میں سے ایک دفتر ذرا دیر سے آیا۔ چیف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ غصے میں آکر اُسے نوکری سے فارغ کر دیا۔ وہ بے چارہ تو حواس باختہ ہوگیا۔ فوراً گھٹنے ٹیک کر چیف کے کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ وہ اپنی زبان میں اِلتجائیں کر رہا تھا لیکن چیف بڑی رعونت سے اُسے اپنے پاؤں سے دور رکھنے کے لئے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ میرے لئے یہ منظر بہت عبرتناک تھا۔ مجھے اُس کی بے چارگی اور چیف کی نخوت پر بہت دُکھ ہوُا۔

چیف کی پینتالیسویں سالگرہ کے موقع پر مجھے بھی بنین جانے کا موقع ملا۔ اُس کے بنین کے محل نما بنگلے پر اُس کی انگریز بیوی کا قبضہ تھا۔ یہاں آکر پتہ چلا کہ یہ خونخوار قسم کا چیف اپنی پچاس سالہ برطانوی جورو سے کِس قدر خوف کھاتا تھا۔ یہاں بنین میں اُس کی دیگر بیویوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر واضح ہوتا گیا کہ چیف اکبیڈین کو مختلف شہریتوں کی عورتوں سے شادی رچانے کا شوق تھا۔ لاگوس میں وہ اپنی نئی نویلی جمیکن نسل کی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ چار بیویاں ہونے کے باوجود ہر وقت کسی نئی کی تلاش میں رہتا۔ یہاں لاگوس میں تجارت پیشہ انڈین نسل کے ہندو بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ ایک دن مجھ سے پوچھنے لگا کہ یورپین

عورتیں تو سیاہ فام افریقیوں سے بخوشی شادی کرلیتی ہیں تمہارے ملکوں کی عورتیں کیوں نہیں
کرتیں۔ میں نے اُسے سمجھانے کی غرض سے بتایا کہ یہ آپس کی تہذیبوں کے بُعد کی وجہ سے
ہے۔ سیاہ فام چھوڑ انڈیا پاکستان کی عورتیں تو سفید فام یورپین نسل کے لوگوں سے بھی شادی نہیں
کرتیں۔ میری بات سن کر اُسے پتہ چل گیا کہ یہاں دال گلتی نظر نہیں آتی۔

مجھے اب اس جگہ کام کرتے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا تھا لیکن نہ تو کمپنی کی طرف
سے مجھے ابھی تک تنخواہ ملی تھی اور نہ ہی رہائش اور دیگر سہولیات۔ جمعہ کے روز میں نے ارادہ
کیا کہ آج میں جی ایم سے اِس بارے میں بات کروں گا۔ لیکن قبل اِس کے کہ جی ایم دفتر آتا
چیف دفتر آدھمکا۔ کچھ دیر دفتر میں بیٹھ کر جلدی جلدی چند ایک کاغذوں پر دستخط کئے اور پھر
کہیں دورے پر چل پڑا اور چلتے چلتے میری طرف اِشارہ کرکے کہنے لگا: "Come major,
let us go!" میں چپ چاپ ساتھ چل پڑا۔ گاڑی میں بیٹھے ایئرپورٹ پر اور وہاں سے جیٹ
کے ذریعے دو گھنٹے میں بنین۔ وہاں پہنچ کر مجھے اُسی ہوٹل میں جا کر ٹھہرنے کو کہا جہاں میں ہفتہ
بھر پہلے اُس کی سالگرہ کی تقریب کے دنوں میں ٹھہرا تھا۔ میں نے عذرا پیش کیا کہ میرے
پاس تو ہوٹل کے کرائے کے پیسے نہیں ہیں۔

"They know that you are my guest."

یہ کہا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ میرے پاس جو پیسے تھے وہ میں نے ٹیکسی والے کو
دے اور ہوٹل میں پہنچ گیا۔ اگلے دِن گیارہ بجے کے قریب چیف کے بنگلے پر پہنچا۔ ملازم نے
مجھے اُس کے دفتر میں پہنچا دیا۔ میں کوئی گھنٹہ بھر بیٹھا اِنتظار کرتا رہا۔ اِس کے بعد چیف کے
ملاقاتی آگئے جن میں اُس کی ایک پرانی کلاس فیلو بھی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد چیف اِس کلاس
فیلو کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد جب دونوں کمرے سے
باہر آئے تو دونوں کے چہرے پھول کی طرح کھلے ہوئے تھے۔ اِس کے بعد وہ ملاقاتی چلے
گئے۔ موقع غنیمت جان کر میں نے بھی ہمت کرکے کہہ ہی دیا کہ جناب نہ تو میرے پاس کوئی
کپڑا ہے اور نہ ہی کوئی پیسہ۔ آپ اگر مجھے آج شام واپس لاگوس بھجوا دیں تو آپ کی مہربانی
ہوگی۔ اِتنا سننا تھا کہ چیف کا موڈ فوراً بدل گیا۔ وہ غصے سے لال پیلا ہوکر بولا:

"What did you say, you want to go back today? No, we will go back on Monday morning. You want to spoil my week end."

اب میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا۔ میں نے اِحتجاج کرتے ہوئے کہا:

''جناب میری بھی کوئی چھٹی ہے کہ نہیں؟ نہ تو آپ نے مجھے تنخواہ دی ہے اور نہ ہی رہائش کیلئے مکان۔ مجھے کھانے پینے اور آرام کی ضرورت ہے کہ نہیں؟''

اِس پر وہ اور بھی لال پیلا ہوگیا اور دھمکی کے انداز سے بولا:

"Do you know to whom you are talking? I am the Mayor of this city! I can put you in jail!!"

اُس نے غصے میں کہیں فون کر کے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد ہم دونوں خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ماحول خاصا کشیدہ اور سنسنی خیز ہوگیا تھا۔ وقت تھا کہ جیسے تھم گیا ہو۔ میں دِل میں خوفزدہ ہو رہا تھا۔ اسلئے میں نے اِس خاموشی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دِل ہی دِل میں جتنی دعائیں مجھے یاد تھیں پڑھ ڈالیں۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک باوردی پولیس آفیسر نے آ کر چیف کو سیلوٹ مارا۔ میرے دِل میں تو خوف تھا لیکن میں نے اپنے چہرے سے ایسا کوئی تأثر نہ دیا اور بڑی بے اِعتنائی اور وقار سے اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ چیف نے چند منٹ اُس سے علیحدگی میں بات چیت کی اور اِس کے بعد وہ جیسے خاموشی سے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا۔ بہر حال پیر کو ہم واپس لاگوس آ گئے۔ میں نے سارا قصہ جی ایم کو بتایا اور آئندہ نوکری سے معذرت کی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کمپنی کے ذمے میرا کتنا بقایا بنتا ہے۔ میں نے حساب لگا کر بتایا کہ میرے دو ہزار اور آٹھ سو نائیرے بنتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ دو دِن بعد شام پانچ بجے چیف کے بنگلے پر آ کر مجھ سے یہ رقم لے جانا۔ وعدے کے مطابق میں وہاں پہنچا تو اُس نے میرے ہاتھ میں نوٹوں سے بھرا ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ گننے کی ضرورت نہیں یہ لو اور جلدی سے یہاں سے چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ چیف آ جائے اور کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ میں نے چپ چاپ لفافہ جیب میں ڈالا اور وہاں سے چلتا بنا۔ گھر پہنچ کر جب میں نے رقم گنی تو وہ پوری تھی۔ میں اُس انگریز جنرل منیجر کی ایمانداری اور اِنسانی ہمدردی کے جذبے سے بیحد متاثر ہوا۔ اب بھی جب کبھی وہ مجھے یاد آتا ہے تو بے اِختیار میرے دِل سے اُس کیلئے دعا نکلتی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو چیف شاید مجھے ایک پیسہ بھی ادا نہ کرتا۔ اس سے پہلے میں افریقی پی آر او کا اُس کے ہاتھوں حشر دیکھ چکا تھا۔ اور مجھے تو ابھی تک کام کرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ اِسلئے میں قانونی چارہ جوئی بھی نہیں کر سکتا تھا بلکہ اُلٹا میں خود قانون کی گرفت میں آتا تھا۔

خیر سے پھر سے گھر کو آئے!!

خدا کا کرنا اوکاڈا کمپنی سے فراغت پانے کے چند دِن بعد ہی مجھے امیر جماعت نائیجیریا مولانا محمد اجمل شاہد صاحب کی وساطت سے ایک مخلص نائیجیرین احمدی بزنس مین حاجی الا موتو کی کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ کمپنی میں اچھے خاصے مشاہرے پر مینیجر کی پوسٹ مل گئی۔ معاہدے کے مطابق مجھے تین ماہ کے اندر اندر پاکستان سے ویزہ لگوا کر واپس آ کر فرم میں رپورٹ کرنا تھی۔ مجھے بھی گھر سے آئے چار ماہ کے قریب ہوگئے تھے۔ بچوں سے ملاقات کا اچھا موقع تھا۔ چنانچہ اکتوبر کے تیسرے ہفتے چار ماہ بعد میں خیر و عافیت کے ساتھ دوبارہ اپنے بال بچوں میں واپس پاکستان پہنچ گیا۔ **الحمدُ لِلہِ عَلیٰ ذالک!!**

چند دن آرام کے بعد میں نے نائیجیریا کے سفارت خانہ سے ورک ویزہ لگوا کر اپنے واپسی سفر کیلئے ضابطہ کی ساری کارروائیاں مکمل کرلیں۔ فیصلہ ہوا کہ دسمبر کے آخری ہفتے جماعت احمدیہ کے جلسہ سالانہ میں شمولیت کے بعد جاؤں گا۔ میری بیگم اور والدہ میرے نائیجیریا دوبارہ واپس جانے کے حق میں نہ تھیں۔ اسلئے کہ میرے بعد بچے اُن کے قابو میں نہ آتے تھے اور سکول بھی باقاعدگی سے نہ جاتے تھے جس سے اُن کی پڑھائی کا ہرج ہوتا تھا۔ سچ پوچھیں تو میرا دِل بھی بدیس میں دھکے کھا کھا کر بھر گیا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی واپس جانے کا ارادہ ترک کر کے پھر سے پاکستان میں تلاشِ روزگار شروع کردیا۔

لیبیا جانے سے پہلے میں نے فیصل آباد ترقیاتی ادارے میں ملازمت کیلئے درخواست دے رکھی تھی۔ میں تو اِس کے بارے میں بھول چکا تھا لیکن ایک دِن مجھے وہاں سے انٹرویو کیلئے کال آگئی۔ بعض دفعہ بروقت اپنی خواہش کے مطابق کام نہ ہونے پر ناشکرے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسان خدا سے گلے شکوے کرنے لگتا ہے لیکن اگر صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے تدبر سے کام لیا جاوے تو اُس وقتی رکاوٹ کے پیچھے بھی اُسے خدا کی کوئی حکمت پنہاں نظر آئے گی۔ اِس اثنا ٔ میں نائیجیریا کی نوکری سے ایک تو میری مالی حالت بہتر ہوگئی دوسرے سابق مشرقی پاکستان کا ویٹرن بریگیڈئر سعداللہ خان ریٹائرمنٹ کے بعد فیصل آباد ترقیاتی ادارے کا ڈائریکٹر جنرل بن کر آچکا تھا۔ بریگیڈئر صاحب کی دینداری اور ایمانداری کے بہت چرچے تھے۔ اور تیسرے اس دفعہ سترہویں سکیل کی دو آسامیوں کیلئے صرف چار اُمیدوار تھے

جن میں سے ہم دو ریٹائرڈ میجر تھے۔ تعلیم، عمر، صحت اور فوجی کورسز کے لحاظ سے تو دوسروں پر مجھے سبقت تھی ہی، لیکن جب بریگیڈئر صاحب کو یہ پتہ چلا کہ اُن کی طرح میں نے بھی پنجاب رجمنٹ کیساتھ سابق مشرقی پاکستان میں نوکری کی ہے تو میری نوکری تو پکی ہوگئی۔ دوسری آسامی میجر شفیق کے حصے آئی۔ دینے والا جب دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ میجر شفیق کو اسٹیٹ مینجمنٹ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر لگا دیا گیا اور مجھے سیکورٹی اور ٹرانسپورٹ آفیسر بنا دیا گیا۔ اس طرح یکم فروری ۱۹۸۱ء سے سترھویں سکیل کی ملازمت اختیار کر کے ایک دفعہ پھر میں نے اپنے وطن میں معمولی مشاہرے کو غیر ملکی پُرکشش نوکری پر ترجیح دی۔ ایڈمرل منصور الحق کے بڑے بھائی کرنل اِحسان الحق (مرحوم) اُن دنوں ڈائریکٹر اسٹیٹ مینجمنٹ تھے۔ میجر شفیق اور کرنل اِحسان کی فوج کے زمانے سے ہی دوستی تھی۔ چنانچہ کرنل اِحسان نے چھ ماہ کے اندر اندر میجر شفیق کو تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر سے ڈپٹی ڈائریکٹر بنوا کر اٹھارھویں سکیل میں پہنچا دیا اور ہم بطور سیکورٹی آفیسر سترھویں سکیل میں ہی رہے۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے پنشن میں سے الاؤنس منہا ہونے لگا جس سے میری پنشن بھی آدھی رہ گئی۔ کچھ عرصہ بعد میجر ریٹائرڈ حامد مختار بھی گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی سے بطور ڈائریکٹر اپنی تعیناتی کا پروانہ ہاتھ میں لے کر آدھمکا۔ گورنر کا کورس فیلو تھا۔ اُس کی خاطر واسا میں ڈپٹی ڈائریکٹر ایڈمن کی آسامی کو اپ گریڈ کر کے اُسے انیسویں سکیل میں ڈائریکٹر ایڈمن اور سیکورٹی لگا دیا گیا۔ یہ تھا ضیاٗالحق کے اِسلامی نظام کا اِنصاف۔ ایک وقت میں ایک ہی ادارے میں تین سابقہ میجر۔ ایک کا سکیل اُنیس دوسرے کا اٹھارہ اور تیسرے کا سترہ۔ جس کی جتنی بڑی سفارش اُتنا بڑا اسکیل۔

یہ شخص حامد مختار احمدیوں کے خلاف سخت تعصب رکھتا تھا۔ اور میری بدقسمتی یہ ہوئی کہ اب یہ میرا باس تھا۔ تھا تو میری طرح کا سابقہ میجر لیکن جنرل جیلانی کا کورس میٹ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو جرنیل سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ کرنل اِحسان اور بریگیڈیئر سعد اللہ بھی اُس سے کنی کتراتے تھے۔ اُس نے آتے ہی میرے ساتھ ایسا رویّہ اپنایا گویا وہ فوج میں جرنیل ہو اور میں اُس کے ماتحت کوئی لفٹین۔ یہ شخص فوج سے پنشن لیتا تھا۔ ایف ڈی اے سے اُنیسویں سکیل کی تنخواہ وصول کرتا تھا۔ فیصل آباد کے قریب رسالیوالہ فوجی فارم میں فوج کی طرف سے دو مربعہ زمین دس سال کے پٹہ پر الاٹ کرا رکھی تھی جس پر ایف ڈی اے کے بیلدار کام کرتے تھے۔ سرکاری جیپ ادارے کے پٹرول کے خرچے پر چوبیس گھنٹے اُس کے زیر

استعمال تھی مگر کسی کو اُس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ تھی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فیصل آباد ترقیاتی ادارہ بننے سے پہلے اس محکمے کا نام امپرووِمنٹ ٹرسٹ تھا۔ اس کے افسروں اور اہل کاروں کی شہرت عوام میں کچھ اچھی نہ تھی۔ کوئی کام بغیر رشوت کے نہ ہوتا تھا۔ لوگوں کو رشوت خوری اور بے ایمانی کی عادت پڑی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے زیرِ استعمال سرکاری گاڑیوں کا پٹرول تک چرا کر بازار میں فروخت کر کے ناجائز پیسے کمانے کے عادی تھے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے بریگیڈئر سعد اللہ کی ایمانداری کی بہت شہرت تھی۔ وہ شعارِ اسلام اور صوم وصلوٰۃ کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اُن کا سب سے اہم مسئلہ اِس ادارے کو کرپشن سے پاک بنانا تھا جس کیلئے اُنہوں نے اپنے آفیسروں سے قرآن پاک پر ہاتھ رکھوا کر قسمیں بھی لیں لیکن جن کو حرام کھانے کی عادت پڑی ہوئی ہو وہ کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے ہیں۔ بریگیڈئر سعداللہ خود باریش اور پابندِ صوم صلوٰۃ تھے اِسلئے جو اُن کی طرح باریش اور شعارِ اسلام کا پابند ہوا اُسے وہ ایماندار خیال کرتے تھے۔ اُن کی اِس کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر بہت سے ماتحت آفیسرز نے اپنی داڑھیاں بڑھالیں۔

پٹرول کی چوری پر قابو پانے کیلئے بریگیڈئر صاحب نے حکم دیا کہ ایک مقررہ وقت پر ٹرانسپورٹ آفیسر کی موجودگی میں محکمہ کی طرف سے مخصوص کردہ پٹرول پمپ سے گاڑیوں میں پٹرول ڈلوایا جائے۔ پٹرول پمپ والی ڈیوٹی میرے لئے تو گراں تھی ہی لیکن بہت سے عادی پٹرول چوروں کیلئے بھی میری یہ پہرہ داری ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ بعض تو مجھ سے خواہ مخواہ میں اُلجھنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک ڈائریکٹر صاحب پہلے تو اپنی ڈائریکٹری کے رعب میں مجھ سے بداخلاقی پر اُتر آئے اور جب میری طرف سے ردِعمل ہوا تو بریگیڈئر صاحب کو رپورٹ کردی کہ اِسے نوکری سے برخاست کردیا جائے۔ یہ شخص پی ڈبلیو ڈی میں سترھویں سکیل کا اسسٹنٹ انجینئر تھا اور کسی موٹی تازی سفارش کی بنا پر یہاں ڈیپوٹیشن پر آکر سیدھا ڈائریکٹر انجینئرنگ کی کرسی پر براجمان تھا۔ بہر حال میں تو اپنی ڈیوٹی کرتا رہا مگر بریگیڈئر صاحب نے اُسے اُس کے محکمے میں واپس بھیج کر اُسے اُس کی اصلیت بتادی۔

باب ۲۲

ضیاءؔ کی اینٹی احمدیہ تحریک

ملک میں اسلام نافذ کرنے کے بہانے ضیاء الحق نے جن مذہبی جماعتوں کو اپنے ساتھ اقتدار میں حصہ دار بنایا تھا اُن کے نفاذِ اسلام کی ابتدا ہی احمدیوں کے استحصال سے ہوتی تھی۔ اُن کی نظر میں احمدیوں کو صرف قانون اور آئین کی رو سے ''ناٹ مسلم'' قرار دے دینا ہی کافی نہ تھا۔ اب اُنہیں اپنے آپ کو مسلم ظاہر کرنے اور شعارِ اسلام کے اِستعمال سے روکنا بھی بے حد ضروری تھا۔ اندھے کو کیا چاہیئے تھا؟ دو آنکھیں؟ ضیاءؔ نے بھی عوام کی توجہ بھٹو کی موت سے ہٹانے کی خاطر از سرنو اِس مسئلے کو کھڑا کر دیا۔ چنانچہ تین ماہ کی غیر حاضری کے بعد جب میں پاکستان واپس آیا تو حکومت کی شہ پر مولویوں اور میڈیا نے احمدیوں کے خلاف بھر پور پروپیگنڈہ مہم شروع کر رکھی تھی جس کے نتیجے میں آئین کے آرٹیکل ۲۶۰ کو از سرِ نو ترتیب دے کر احمدیوں کو غیر مسلموں کی لسٹ میں شامل کر دیا گیا۔ ازاں بعد ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء کو تعزیرات پاکستان میں دفعہ ۲۹۸ الف کا اضافہ بھی کر دیا گیا۔ اِس قانون کے تحت ہر وہ شخص جو کسی بھی طور سے امہات المومنین، اہلِ بیت، یا خلفائے راشدین میں سے کِسی خلیفہ یا صحابی کی توہین کا مرتکب پایا جائے وہ تین سال قید سخت یا جرمانہ یا دونوں سزاؤں کا سزاوار ہوگا۔ اِس قانون کے تحت بظاہر اہلِ تشعیہ، جو اُمہات المومنین، خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کی شان میں گستاخی کا کھلم کھلا ارتکاب کرتے تھے کو زیرِ تعزیر لانا تھا مگر خمینی کے خوف سے ضیاءؔ کو شیعوں پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ پڑی۔

ایف ڈی اے میں مجھے کوئی ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ لیکن میں ابھی تک سترھویں سکیل

میں ہی تھا۔ اِنہی دِنوں فوجی فاؤنڈیشن نے چنی گوٹھ کے مقام پر فوجی فرٹیلائیزر کے نام سے ایک نئی فیکٹری قائم کی جو سونا یوریا کے نام سے کھاد تیار کرتی تھی۔ اپنے اس نئے یوریا کھاد کی مارکیٹنگ کیلئے اُنہیں سیلز آفیسرز کی ضرورت تھی۔ یہاں پر سابقہ فوجیوں اور اُن کے لواحقین کیلئے ملازمت کا مخصوص کوٹہ تھا۔ تنخواہ، دیگر الاؤنسز اور کمپنی کار کیساتھ بہت اچھے پیکیج کی پیشکش تھی۔ میں نے بھی درخواست دیدی اور کچھ عرصہ بعد مجھے وہاں پر ملازمت مل گئی۔ ۲۷ستمبر ۱۹۸۲ء سے میں نے یہ ملازمت اِختیار کرلی۔ میرا کام کھاد کی ایجنسیاں قائم کر کے سونا یوریا کو مارکیٹ میں متعارف کرانا تھا۔ ملازمت کے پہلے چھ ماہ پروبیشن پیریڈ تھا۔ اسلئے میں نے وہاں پر بہت محنت اور شوق کے ساتھ جان توڑ کر کام کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ہر دکان پر ببر شیر کے ساتھ سونا یوریا کی بوری بھی نظر آنے لگی۔ میں نے اِس سیزن میں ۱۸ملین روپے کی سیل کی۔

۲۶ مارچ ۱۹۸۳ء کو میرا چھ ماہ کا پروبیشن پیریڈ ختم ہوگیا۔ مجھے بڑی بے چینی سے ہیڈ آفس کی طرف سے اپنی نوکری کی کنفرمیشن کے خط کا انتظار تھا۔ ۱۸اپریل کو شام پانچ بجے کے قریب میرے سینئر سیلز آفیسر نے ریجنل آفس فیصل آباد سے ٹیلیفون پر اِطلاع دی کہ اگلے دن صبح لاہور ہیڈ آفس سے مارکیٹنگ مینیجر چوہدری عبدالرحیم ایک ضروری میٹنگ کیلئے فیصل آباد آرہے ہیں جس میں میرا شامل ہونا بھی ضروری ہے۔ اگلے دِن نو بجے کے قریب جب میں دفتر پہنچا تو وہاں پر سینئر سیلز آفیسر اور مارکیٹنگ مینیجر چوہدری عبدالرحیم کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ چوہدری رحیم نے میرے سامنے ایک بند لفافہ رکھتے ہوئے کہا کہ میجر صاحب اِسے کھول کر پڑھ لیں۔ میں نے جلدی سے لفافہ کھول کر خط پڑھا تو اِس میں لکھا تھا: ''آپ کے تعیناتی کے خط کی شق نمبر فلاں کے تحت آپ کو فی الفور نوکری سے فارغ کیا جاتا ہے۔ ایک ماہ کے نوٹس کے بدلے آپ کو ایک ماہ کی تنخواہ دے دی جائے گی۔'' برخاستگی کی کوئی وجہ نہ بتائی گئی تھی۔ خط پڑھ کر چند لمحوں کیلئے میں سکتے میں آگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے آسمان سے اُٹھا کر زمین پر دے مارا ہو!! جیسے کسی نے مجھے بلند و بالا سیڑھی پر چڑھا کر آخرِی زینے سے نیچے لُڑھکا دیا ہو۔ میں نے بے بس ہو کر اپنے آپ کو فضا میں تیزی سے سر کے بل نیچے زمین کی طرف گرتے ہوئے محسوس کیا۔ دفتر میں مکمل سکوت تھا۔ ہم تینوں خاموش بت بنے بیٹھے تھے۔ یکدم میں نے سر کو ایک جھٹکا دے کر اپنے حواس کو قابو میں کیا اور پھر سوالیہ نظروں سے چوہدری

رحیم کی طرف دیکھا تو وہ I am sorry سے آگے کچھ نہ کہہ سکا اور نظریں جھکا لیں۔ اُس میں میری نظروں سے نظریں ملانے کی ہمت نہ تھی۔ اسلئے کہ اُس کے دِل میں چور تھا۔ اگلے دِن سرگودھا پہنچ کر میں نے گودام کے انچارج نائب رسالدار شہاب الدین کا حساب بیباک کر کے اُس سے نو ڈیمانڈ سرٹیفکیٹ لیا اور کمپنی کی طرف سے اپنی جگہ نامزد کردہ سیلز آفیسر کو چارج دے کر واپس گھر آ گیا۔ میں نے اپنی برطرفی کے خلاف فوجی فرٹیلائیزر کے مینیجنگ ڈائریکٹر میجر جنرل ریٹائرڈ فرمان علی کے پاس اپیل کی لیکن اُس نے میری اپیل پر کوئی کارروائی نہ کی۔ مجھے بعد میں علم ہُوا کہ اُسی کے حکم پر تو احمدی ہونے کی بنا پر مجھے برخاست کیا گیا تھا۔ وہ تو خود اینٹی احمدیہ مہم کا سرگرم رکن تھا۔

اِس کے کوئی دو ہفتہ بعد ایک دِن مارکیٹنگ ڈویژن لاہور سے ایڈمن آفیسر کرنل حق نواز کا مجھے پیغام ملا کہ میں فیصل آباد ریجنل آفس میں اُن سے ملوں۔ میں اُن سے ملنے گیا تو اُنہوں نے مجھے بتایا کہ سرگودھا کے گودام کی میرے جانے کے بعد پڑتال کرنے پر پتہ چلا ہے کہ وہاں پر تقریباً ایک ہزار چھ سو بوری کھاد کم ہے جس کی انکوائری کے سلسلے میں وہ یہاں آیا ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ گودام کے اِنچارج رسالدار شہاب الدین کے مطابق دو لاکھ روپے کی رقم آپ کے ذمے ہے۔ میں نے گودام کے اِنچارج کی طرف سے جاری کردہ نو ڈیمانڈ سرٹیفکیٹ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ چنانچہ مجھے بری الذِمہ قرار دے کر کمپنی نے اُس کے خلاف غبن کا مقدمہ درج کرا دیا۔ رسالدار نے پولیس انکوائری میں بھی مجھے اپنے ساتھ ملوث کرنے کی کوشش کی مگر وہاں سے بھی مجھے فارغ کر دیا گیا۔

نوکری چھوٹ جانے کی وجہ سے کچھ دن کیلئے پریشانی رہی۔ لیکن مجھے اپنے خدا پر توکّل تھا۔ اُس نے ہمیشہ ایک در بند ہونے پر میرے لئے دوسرا اُس سے بہتر کھولا تھا۔ میرا ایمان تھا کہ وہ میرے بچوں کے لئے اِس سے بہتر روزی کا انتظام کر دے گا۔ پھر میرے دِل میں خیال آیا کہ نوکریاں ڈھونڈنے کی بجائے جو کھاد میں ایجنٹوں کے ذریعے بکوا کر اُن کو منافع دلواتا تھا کیوں نہ وہ منافع خود کماؤں۔ لہٰذا میں نے اپنے گاؤں کے قریب پینسرہ نامی قصبہ میں کھاد کی ایجنسی کھول لی۔ لوکل بس ہمارے سامنے آ کر رُکتی تھی جس کی وجہ سے مجھے کسی خاص اِشتہار بازی کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ چند ماہ کی محنت کے بعد مجھے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ اب مجھے بعض دفعہ ایک دِن میں اِتنی بچت ہو جاتی جتنی مہینہ بھر کی محنت کے بعد تنخواہ ملتی تھی۔

امتناعِ قادیانیت آرڈیننس - مجریہ ۱۹۸۴ء

ضیاء الحق اپنے زعم میں احمدیوں کے گلے کے گرد پھندا سخت کر رہا تھا۔ پچھلے سات سال سے وہ سیاستدانوں کو انگلیوں پر نچا رہا تھا۔ جب کبھی سیاست کی ہنڈیا میں اُبال آتا وہ اُس پر اسلام کا ڈھکنا رکھ کر اوپر اپنا فوجی بوٹ رکھ دیتا۔ ایم آر ڈی کے غبارے سے ہوا نکالنے کیلئے اُس نے اُنہیں میں سے جاہ طلب اور بقول اُس کے ہڈی کیلئے دُم ہلانے والوں کی مجلسِ شوریٰ بنا کر خواجہ صفدر کو اُس کا سرپنچ بنا دیا۔ اس ربڑ کی مُہر ٹائپ مجلس شوریٰ کی ممبری کی پیشکش کو جماعت احمدیہ کے ممبران نے جب قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اِس فرعون خصلت ڈکٹیٹر نے طیش میں آ کر اُن کے خلاف اپنی پوری طاقت سے اِستحصالی مہم کا آغاز کر دیا۔ ۲۶ اپریل ۱۹۸۴ء کو امتناعِ قادیانیت کا آرڈیننس جاری کر کے اُنہیں اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے، اِسلامی شعائر کے اِستعمال کرنے، اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کہنے، اِن مساجد میں اذان دینے، کلمہ شہادۃ پڑھنے یا لکھنے، السلام علیکم کہنے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کو خلاف قانون قرار دے کر قابل سزا بنا دیا۔ اُس فرعون خصلت ڈکٹیٹر نے اِسی پر اِکتفا نہ کیا۔ بلکہ جماعت احمدیہ کے امام پر ہاتھ ڈالنے کیلئے ایک گھناؤنی سازش تیار کی۔ ایک بازاری مُلّاں اسلم قریشی کو ملک سے باہر روپوش ہونے کیلئے آمادہ کیا گیا۔ اُس کے غائب ہو جانے کے بعد منظور چنیوٹی اور اِس قماش کے دیگر ملانوں کے ذریعے یہ پروپیگنڈہ شروع کروا دیا گیا کہ مُلّاں قریشی کو قادیانیوں کے خلیفہ نے قتل کروا دیا ہے۔ لہٰذا اُسے اسلم قریشی کے قتل کی سازش کے جرم میں گرفتار کیا جائے۔ ضیاءً کا پروگرام تھا کہ جس قاعدہ کلیہ کے تحت اُس نے بھٹو کو نواب محمد احمد خاں کے قتل کی سازش میں ملوث کر کے تختۂ دار پر لٹکایا تھا اُسی فیثا غورث کے فارمولے کے تحت جماعت احمدیہ کے اِمام کو بھی اِس مُلّاں کے قتل کی سازش کا قصوروار ٹھہرا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ اُس کا خیال تھا کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اُس کے زعم میں اپنے خلیفہ کی موت کے بعد قادیانیت کا یہ کینسر خود بخود ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ اُن کی حراست کو یقینی بنانے کیلئے قادیانیوں کے خلیفہ کا نام ایگزیٹ کنٹرول لسٹ میں ڈال دیا گیا۔ لیکن اُن کا بھی ایک علیم و خبیر خدا ہے جو بد طینت دشمن کے منصوبوں کے مقابل پر بہترین منصوبہ ساز ہے۔ اُس نے بھی ایک منصوبہ بنایا۔ حکومتی کارندے آج سے دو سال قبل فوت شدہ

تیسرے خلیفہ مرزا ناصر احمدؒ کو تلاش کرتے رہ گئے مگر اُن کا خلیفۂ وقت مرزا طاہر احمدؒ سمندر پار جا پہنچا۔ قبل اس سے کہ حکومتی مشینری حرکت میں آتی اُن کے خدا نے اپنے غیبی ہاتھ سے اُسے اپنے فرشتوں کے کندھوں پر بٹھا کر اُس مقامِ امین پر پہنچا دیا جو ان بدروحوں کی پہنچ سے بہت دور اور باہر تھا۔ عین اُسی طرح جس طرح خدائے بزرگ و برتر اپنے پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوجہل اور اُس کے ساتھیوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر انہیں مکہ سے یثرب پہنچا دیا تھا۔ مارنے والے سے بچانے والا بہت بڑا ہے۔ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ چنانچہ دشمن کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔

''مرزا طاہر احمد جیت گیا اور جنرل ضیاءُ الحق ہار گیا۔ دن چڑھنے پر ضیاء الحق کو مرزا طاہر احمد کے چلے جانے کی خبر ملی تو صدرِ مملکت کے غصے کی اِنتہا نہ رہی۔ کراچی میں امیگریشن کے اعلیٰ حکام کو معطل کر دیا گیا۔ تحقیقات شروع ہوگئیں۔ جنرل ضیاء الحق نے ضلع جھنگ کے پولیس افسر کو خود ٹیلیفون کیا اور پوچھا: 'مرزا طاہر کہاں ں ں ہے؟ مجھے فوراً مرزا طاہرر ر چاہیئے'

''پولیس آفسر نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ 'جناب مجھے تو اِس بارے میں کچھ معلوم نہیں'

''جنرل ضیاء پھٹ پڑا: 'تم نے کیا کہا کہ تجھے معلوم نہیں؟ تم ذمے دار ہو اُسے فوراً تلاش کرو!!

''حالانکہ جنرل ضیاء کو معلوم ہو چکا تھا کہ مرزا طاہر احمد اب اُس کی پہنچ سے دور ہے۔ اُس کے لندن جانے کی خبریں دنیا بھر کے اخبارات نے شائع کیں۔ بلکہ پاکستان اور ہندوستان کے لوگوں نے تو ریڈیو بی بی سی سے مرزا طاہر احمد سے ساری تفصیلات خود اُس کی زبانی سنیں۔ ۳۰ اپریل کو ۱۲:۳۰ بجے مرزا طاہر احمد لندن پہنچ گیا جہاں سینکڑوں قادیانیوں نے اُن کا اِستقبال کیا اور مرزا طاہر احمد کے ساتھ ظہر کی نماز ادا کی۔'' (۱۵۹)

اِس سفلے کو یہ علم نہ تھا کہ افراد کی موت سے قومیں نہیں مرتیں۔ بھٹو کو مار کر اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ پیپلز پارٹی جو خالصتاً ایک دنیوی جماعت تھی کو ختم کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یہ بات کیسے ممکن تھی کہ وہ جماعت جو خدا کے مسیحؑ اور مہدیؑ کی قائم کردہ ہو اُس کے خلیفہ کو مار کر وہ اُسے ختم کر دیتا۔ خلفاءؓ کی شہادت سے خدائی جماعتیں ختم نہیں ہوتیں بلکہ اور ترقی کرتی ہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو حضرت عمر ابن خطابؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اِسلام دنیا سے نابود ہو جاتا۔

اِس بزدل نے اپنی خفت مٹانے کیلئے طیش میں آ کر بے گناہ اِنسانوں کے خون سے

ہاتھ رنگنے کیلئے جماعت احمدیہ کے افراد کو اپنے ظلم کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔ اسلام کے نام پر اس نے بازاری مُلانوں کو کھلی چھٹی دیدی کہ وہ قانون اور اَخلاق کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اس امن پسند جماعت کے افراد پر عرصہ حیات تنگ کردیں۔ اُنہیں کھلے عام مارا پیٹا جانے لگا۔ اُن کے بچوں کو سکولوں اور کالجوں میں تشدد کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ اُنہیں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ملازمتوں سے برطرف کیا جانے لگا۔ اُن کی املاک پر قبضے کئے گئے اور کئی مقامات پر اُن کے گھروں کو نذرِ آتش کردیا گیا۔ اُن کی مساجد کی بے حرمتی کی گئی۔ نہ صرف یہ کہ اُنہیں اپنی مساجد میں نماز ادا کرنے سے زبردستی روکا گیا بلکہ کئی مقامات پر اُن کی مساجد پر قبضہ کرلیا گیا۔ اور کئی جگہوں پر اُن کی مساجد کو مسمار بھی کیا گیا۔ حکومتی مشینری نے اِن تخریب کاروں کے ہاتھ مزید مضبوط کرنے کیلئے احمدیہ جماعت کے افراد کو نماز پڑھنے، السلام علیکم کہنے، کلمہ طیبہ لکھنے یا پڑھنے، دعوت ناموں پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے کے جرائم میں پکڑ پکڑ کر جیلوں میں بند کرنا شروع کردیا۔

یوں توضیاءً نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے کچھ ہی دن بعد ملانوں کو احمدیوں کے قتل عام کی کھلی چھٹی دے دی تھی لیکن امام جماعت احمدیہ کی لندن روانگی کے بعد تو سارے ملک میں اُن کے سرکردہ افراد کو ملک بھر میں چن چن کر شہید کیا جانے لگا۔ یکم مئی ۱۹۸۴ء کو سکھر میں جماعت احمدیہ کے صدر قریشی عبدالرحمٰن کو شہید کردیا گیا۔ اِس کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد ۱۶ جون کو میں دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کی غرض سے ابھی بستر میں لیٹا ہی تھا کہ صدر جماعت احمدیہ مدینہ ٹاؤن شیخ محمود احمد نے فون پر اطلاع دی کہ ڈاکٹر عبدالقادر صاحب کو کچھ دیر پہلے کسی نے گھر میں آکر شہید کردیا ہے۔ میں جب وہاں پُہنچا تو شیخ صاحب نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالقادر سوشل سیکورٹی کے قریبی ہسپتال میں ملازم تھے۔ دِن بھر کی ڈیوٹی کے بعد وہ دوپہر کا کھانا کھا کے ذرا آرام کیلئے لیٹنے ہی لگے تھے کہ اِتنے میں کسی نے گیٹ پر آکر گھنٹی بجادی۔ ڈاکٹر صاحب نے برآمدے میں آکر آنے والے کا مقصد پوچھا تو اُس شخص نے بتایا کہ کسی مل کا مزدور ہے۔ اُس کے پیٹ میں سخت تکلیف ہے اِسلئے وہ دوائی لینے آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ بہت ہی خداترس اِنسان تھے اِسلئے اُنہوں نے اُسے واپس بھیجنے کی بجائے اپنے گھر کے برآمدے میں ہی بلالیا۔ جونہی ڈاکٹر صاحب نے اُس کے پیٹ کا معائنہ شروع کیا اُس بدبخت نے چھری کے پے درپے وار کرکے اُنہیں شدید زخمی کردیا۔ زخمی ہونے کے باوجود

ڈانٹر صاحب نے اُسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے زخموں کی تاب نہ لاکر ڈاکٹر صاحب دم توڑ چکے تھے۔

ان حالات میں چالیس پچاس کلومیٹر کا سفر کر کے دکان پر جانا میرے لئے بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اسلئے میں نے پھر فیصل آباد میں کسی مناسب ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ کچھ دِنوں بعد مجھے گھی کارپوریشن کے یونٹ یونائیٹڈ انڈسٹریز فیصل آباد میں چیف سیکورٹی آفیسر کی آسامی مل گئی۔ مینیجنگ ڈائریکٹر مقبول احمد رحمانی کی ملانوں کی طرح کوئی گز بھر لمبی داڑھی اور کرخت لہجہ۔ میں تو حیران تھا کہ اس مُلاں نے مجھ جیسے ''مرزائی'' کو قبول کیسے کرلیا۔ امرتسر کی جٹ برادری سے تعلق تھا۔ اسلئے لہجے میں ذرا کرختگی تھی۔ بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ اُن کا لہجہ اگرچہ کرخت تھا مگر وہ متعصب ہرگز نہ تھے۔

نوکری ویسی ہی تھی جیسی کریسنٹ جیوٹ ملز جڑانوالہ میں۔ فرق صرف اِتنا تھا کہ یہ گورنمنٹ کی ملازمت تھی۔ وہی مزدور، وہی یونین، مطالبات منوانے کا وہی پر تشدد طریق۔ مرتا کیا نہ کرتا سابق فوجی کیلئے سیکورٹی یا انتظامی جاب کے سوا پاکستان میں ہے ہی کیا؟ سابقہ تجربہ کی بنا پر اپنے کام سے کام رکھنے کا تہیہ کر کے جون ۱۹۸۴ء کے دوسرے ہفتے سے اللہ کا نام لے کر پھر ملازمت اِختیار کرلی اور یونین کے معاملات میں دخل اندازی سے حتی الامکان اجتناب برتا۔ صبح سویرے کام پر جانے سے پہلے سارے مزدور مل کے گیٹ پر جمع ہوکر ایم ڈی سمیت تمام گھی کارپوریشن کے افسران کی ماں بہن ایک کردیتے۔ گھنٹہ بھر کی اسمبلی کے بعد کام شروع کرتے۔ پروڈکشن کم مراعات زیادہ۔ یہ تھی سرکاری یونٹوں کے خسارے کی وجہ۔

میجر حامد مختار مجھے اپنے اینٹی احمدیہ رانگڑ نیٹ پر راؤ فرمان کے ذریعے فوجی فرٹیلائیزر کمپنی سے تو فارغ کروا چکا تھا۔ جب اُسے پتہ چلا کہ اب مجھے گھی کارپوریشن میں سرکاری ملازمت مِل گئی ہے تو اُس کا اینٹی احمدیہ نیٹ پھر حرکت میں آ گیا۔ گھی کارپوریشن میں ٹوہ لگا کر اُس نے وہاں پر بریگیڈیئر (ر) سعید اختر انصاری کو ڈھونڈ نکالا۔ حامد مختار کی طرح وہ بھی احمدیوں کا سخت مخالف تھا۔ بلکہ اُس سے بھی دو ہاتھ آگے۔ چنانچہ وہ بھی مجھے گھی کارپوریشن سے برطرف کروانے پر تُل گیا۔ لیکن اِس کیلئے اُسے وجہ چاہیئے تھی۔ حامد مختار نے اُسے مشورہ دیا کہ یہ شخص چونکہ ایف ڈی اے کا سابقہ ملازم ہے۔ اِسلئے گھی کارپوریشن اگر اِس کے بارے میں ایف ڈی اے سے رپورٹ طلب کرے تو وہ ڈائریکٹر ایڈمن اور سیکورٹی کی حیثیت سے

جس میں اُسے ملازمت سے فارغ کرنے کا جواز ہوگا۔
ایسی رپورٹ دے گا جس میں اُسے ملازمت سے فارغ کرنے کا جواز ہوگا۔ تعیناتی کا پروانہ جاری کرنے سے قبل بھرتی کرنے والا ادارہ اگر ضروری سمجھے تو اُمیدوار کے متعلق اُس کے سابقہ محکمہ سے اُس کی کارکردگی کے بارے میں رپورٹ طلب کر سکتا ہے۔ لیکن ملازمت کا پروانہ جاری کرنے کے بعد اُس کو فارغ کرنے کا بہانہ بنانے کی خاطر اگر وہ ایسا کرے تو یہ ملازمت کے مسلمہ اصولوں کے علاوہ ضابطۂ اخلاق کے بھی منافی ہے۔ مگر جب چور اور کُتیا آپس میں مل جائیں تو گھر والا بیچارہ کیا کر سکتا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا منصوبے کے تحت ۲۳ ستمبر ۱۹۸۴ء کو بریگیڈئر انصاری نے ڈی جی ایف ڈی اے کو خط لکھ کر میرے بارے میں رپورٹ طلب کرلی۔ اتفاق سے جب یہ چٹھی ایف ڈی اے میں پہنچی اُن دنوں میجر حامد مختار چھٹی پر تھا۔ کرنل محمد ظفر ایم ڈی واسا ایک بھلا مانس انسان تھا۔ اُسے علم تھا کہ حامد مختار محض کرو ہد کی بنا پر میرا پیچھا کر رہا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ بھی حامد مختار کی ایسی حرکتوں سے تنگ تھا۔ چنانچہ اُس نے میرے بارے میں تسلی بخش رپورٹ بھجوا دی۔ اِس طرح میں اُن کے پہلے وار سے بچ گیا۔

ریفرنڈم یا ضیاؑ کا اسلامی جھرلو؟؟

ضیاء حکومت نے آرڈیننس XX کے تحت احمدیوں کو نہ صرف ظلم وستم کا نشانہ بنایا بلکہ اُنہیں حقیقی ''اچھوت'' سمجھتے ہوئے ہر شعبے میں اُن کی حوصلہ شکنی کی۔ احمدیت دشمن عناصر کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی۔ گورنمنٹ آفیسران باقاعدہ اُن لوگوں کی مدد کرتے جو احمدی مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل تھے۔ ایسے عناصر کی حوصلہ افزائی دامے، درمے، قدمے، سخنے خود ضیاء الحق اپنا فرضِ منصبی جانتے۔ چنانچہ احمدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اُنہوں نے ۷ دسمبر ۱۹۸۴ء کو اپنی ایک تقریر میں متنبہ کرتے ہوئے کہا: ''پاکستان میں دین کے منکروں کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر کسی کی عزت پر حملہ کیا جائے تو وہ قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اگر کوئی حضرت محمدؐ کے مقابلے میں آئے گا تو موت اُس کا مقدر ہوگی۔'' (۱۶۰)

پتہ نہیں ان لوگوں نے کہاں سے پڑھ کر یہ مشہور کر رکھا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانیؑ اپنے آپ کو (نعوذُ باللہ) حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کا نبی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ حالانکہ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے متعدد بار بار اِس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ

وہ تو نبی اکرم ﷺ کی خاکِ پا کے بھی برابر نہیں۔ انہوں نے جو مقام پایا وہ محض حضورؐ کے فیض کا نتیجہ ہے۔ اپنے فارسی کلام میں فرماتے ہیں

بعد از خدا بعشق محمد مخمرم — گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم
ایں چشمہ رواں کہ بخلق خدا دہم — یک قطرہ ز بحر کمال محمد است

بہر حال جماعت احمدیہ کے خلاف یہ سب حکومتی اقدامات ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھے جو ضیاءُ الحق اپنی حکومت کی بقا کیلئے ضروری سمجھتا تھا۔ اسلئے کہ ایم آر ڈی کے رہنماؤں نے ضیاء کے ریفرنڈم اور غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر کے اُسے پریشان کر رکھا تھا۔ لہٰذا اپنے اِس ریفرنڈم والے فراڈ کو کامیاب بنانے کیلئے احمدیوں کے خلاف اسلام کے نام پر اس قسم کے اقدامات کر کے عوام کی حمایت حاصل کرنے کی ایک نہایت ہی بھونڈی کوشش تھی۔ نفاذِ اسلام کے علمبرداروں کی مزید خوشنودی کی خاطر ضیاء نے اگست ۱۹۸۴ء کو لندن میں اُن کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس کے موقع پر یہ پیغام بھیجا:

''آخری سالوں سے حکومت پاکستان نے کئی سماجی اور قانونی اقدامات اُٹھائے ہیں جن کے تحت احمدیوں کو عام مسلمانوں کی طرح عبادت کرنے اور اعمال بجالانے سے روکنا سرفہرست ہے۔ ہم اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ 'احمدیت کے کینسر' کو ہمیشہ کیلئے جڑ سے اُکھاڑ پھینکا جائے۔'' (۱۶۱)

اِسی طرح ۱۹ دسمبر ۸۴ء کو ہونے والے ریفرنڈم میں جو سوال رکھا گیا وہ بھی کچھ یوں تھا:

''کیا آپ صدر ضیاءُ الحق کی طرف سے اِسلام نافذ کرنے کی کوششوں کی تائید کرتے ہیں؟''

'ہاں' کی صورت میں جواب کا مطلب یہ تھا کہ میں آئندہ پانچ سالوں کیلئے جنرل ضیاء کو پاکستان کا صدر مانتا ہوں۔ کون مسلمان تھا جو اِس سوال کا نہ میں جواب دیتا۔ لوگوں نے مناسب سمجھا کہ ووٹ ہی نہ ڈالا جائے۔ پولنگ سٹیشن خالی پا کر ضیاءُ حمایت پارٹی نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کارروائی ڈالنے کیلئے خود ہی ٹھپے لگا لگا کر بیلٹ بکس بھر دئے۔ ۱۹ دسمبر کو منعقد ہونے والا یہ ریفرنڈم بھی ایک عجیب تماشا تھا۔ ایم آر ڈی کی جماعتوں نے اِس کے بائیکاٹ کی اپیل کر رکھی تھی۔ ملک کے پولنگ سٹیشنوں پر ووٹروں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ مگر جب نتیجے کا اعلان ہُوا تو صدر ضیاءُ الحق جیت چکے تھے۔

ضیاء کے سیکریٹری داخلہ روئیداد خان کے مطابق:

''۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو حسبِ اعلان کہنے کو تو ریفرنڈم ہُوا لیکن اِس میں حصہ اتنے کم لوگوں نے لیا کہ ہمیں

شرم آنے لگی۔ ریفرنڈم والے دن میں نے اُس وقت کے ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس بیورو کے ساتھ اسلام آباد، راولپنڈی اور اُس کے مضافات میں واقع کچھ پولنگ سٹیشنوں کا دورہ کیا وہ سب سنسان و ویران پڑے ہوئے تھے۔ میں راولپنڈی کی لالہ زار کالونی میں ایک ایسے پولنگ سٹیشن پر گیا جو خواتین کیلئے مخصوص تھا۔ میں نے دیکھا کارندے موجود ہیں، ووٹر ندارد۔ میں نے کارندوں کو مبارکباد دی کہ آپ نے نہایت مستعدی سے اتنا بڑا کام اتنی جلدی نپٹایا۔ اِس پر وہاں کی پولنگ آفیسر اور اُن کا سارا عملہ ایک ساتھ بہ آواز بلند بولا: ”ہمیں تو صبح سے ایک ووٹر کی شکل تک نظر نہیں آئی، ابھی تک تو کوئی آیا ہی نہیں ہم تو بیکار بیٹھے مکھیاں مار رہے ہیں۔“ (۱۶۲)

جمہوریت اور آئین کیلئے ضیا کے دِل میں سوائے تحقیر اور تضحیک کے اور کچھ نہ تھا۔ عالمی رائے کی اُسے پرواہ نہ تھی۔ تہران میں ایک اخباری کانفرنس کے دوران کیہان انٹرنیشنل کے نمائندوں کے سوالوں سے چڑ کر اُس نے جو اُنہیں جواب دیا تھا وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے:

”آئین! آئین! آئین!...... آئین ہے کیا؟؟ دس بارہ صفحوں کا کاغذی پرزہ! جسے میں جب چاہوں پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دوں۔“

البتہ اب اُس پر اپنے فوجی اور غیر فوجی ساتھیوں کی طرف سے دباؤ بڑھ گیا تھا کہ وہ اِنتخاب کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیں۔ اُسے یہ بھی اِحساس ہو گیا تھا کہ حکومت چلانے کیلئے عوامی تائید ضروری ہے لیکن وہ عملی طور پر اِقتدار سے علیحدہ ہونے کیلئے تیار نہ تھا۔ چنانچہ ریفرنڈم کے ذریعے اپنی صدارت پکی کرنے کے بعد ۱۲ جنوری ۱۹۸۵ء کو اُسے بادلِ نخواستہ اعلان کرنا پڑا کہ ۲۵ فروری کو قومی اور ۲۸ فروری کو صوبائی اسمبلی کے غیر سیاسی بنیادوں پر اِنتخابات ہوں گے۔

مذہب کے نام پر تشدد

مجھے یونائیٹڈ انڈسٹریز میں چھ ماہ ہو گئے تھے۔ مل کی انتظامیہ میرے کام سے مطمئن تھی۔ انہی دنوں گھی کارپوریشن کے ایک دوسرے یونٹ کاکا خیل انڈسٹریز میں ڈپٹی مینیجر کی آسامی خالی ہوئی تو مجھے ترقی دے کر وہاں بھیج دیا گیا۔ یکم فروری ۱۹۸۵ء سے میں نے یہاں پر ڈیوٹی سنبھالی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہاں کا ماحول پسند نہ آیا۔ دراصل ہمارے علاقے میں رہنے والا علی احمد نامی ایک شخص احمدیوں کے سخت خلاف تھا۔ اُس نے اور اُسی کی برادری کے ایک

دوسرے شخص امیر علی نے مل کر محلے کے لوگوں کو میرے خلاف بھڑکانے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ اتفاق سے ان دونوں کا بھی ضیأ الحق کی برادری سے تعلق تھا۔ علی احمد کا کا خیل انڈسٹریز کے ہیڈ آفس میں کلرک تھا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ میری یہاں پر بطور ڈپٹی مینیجر تقرری ہوگئی ہے تو اُس نے میرے خلاف یہاں پر بھی لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہاں کی لیبر یونین پر فیصل آباد کی مجلس تحفظ ختم نبوت والوں کا قبضہ تھا۔

ضیأ کا بدنام زمانہ اینٹی احمدیہ آرڈیننس چونکہ احمدیوں کے بنیادی حقوق کے خلاف تھا اور اس کے ذریعے اُن کے مذہبی عقائد پر زد پڑتی تھی اسلئے اُن کے امام نے اُنہیں ہدایت کی کہ وہ اس کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے سینوں پر کلمہ شہادۃ کے بیج سجائیں۔ اور اس طرح حکومت پر واضح کر دیں کہ چاہے جتنا بھی ظلم روا رکھے جماعت احمدیہ کو وہ کلمہ شہادۃ سے جدا نہیں کرسکتی۔ اسلئے کہ یہی اُن کے عقیدہ کی اصل بنیاد ہے۔ احمدیوں نے جب کلمہ کے بیج لگانے شروع کئے تو مخالفین نے اسے اشتعال انگیزی اور حکومت نے اپنے خلاف بغاوت قرار دیا۔ ادھر ختم نبوت والے احمدیوں پر تشدد کرنے لگے اُدھر پولیس اور حکومتی کارندے انہیں پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ٹھونسنے لگے۔

انہیں دنوں میری بھاوج کا انتقال ہوگیا۔ تعزیت پر آئے ہوئے ایک دوست نے میری جرسی پر بھی کلمہ کا بیج لگا دیا۔ اگلے دن وہی جرسی پہن کر میں دفتر چلا گیا۔ چنانچہ میرے سینے پر کلمہ کے بیج کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ساری مل میں پھیل گئی۔ اس سے اگلے دن جب میں دفتر آیا تو ایک نوجوان نے جس کے سینے پر کلمہ طیبہ کا بیج سجایا ہؤا تھا آ کر اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ بھی احمدی ہے۔ میرے کہنے پر وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں دو تین مزدور وہاں آ دھمکے۔ اُنہوں نے آتے ہی اُس لڑکے سے اُلجھنا شروع کر دیا کہ اُس نے اپنے سینے پر کلمہ کا بیج کیوں لگایا ہُوا ہے۔ میں نے اُنہیں بھی بیٹھنے کیلئے کہا لیکن وہ غصے کی حالت میں کھڑے اُس سے کلمہ اُتارنے کیلئے تکرار کرتے رہے۔ میں نے اُنہیں سمجھاتے ہوئے کہا کہ اِس نے کلمہ اپنے سینے پر لگا کر اس سے محبت کا اظہار ہی تو کیا ہے کوئی بُری بات تو نہیں کی! اُن میں سے ایک بولا کہ ہم اپنے پاک کلمے کو لیٹرین جیسی گندی جگہ پر لگا ہُوا دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا کہ اُس نے تو یہ کلمہ اپنے سینے پر سجا رکھا ہے۔ وہ بولا یہ مرزائی ہے۔ اور مرزائی کا سینہ لیٹرین سے بھی زیادہ پلید ہوتا ہے۔ میں نے پھر پوچھا اگر

یہی کلمہ عیسائی اپنے سینے پر لگا لیں تو؟ وہ بولا کہ عیسائی مرزائیوں سے ہزار درجہ اچھے ہیں۔ بات کو بڑھتا دیکھ کر میں نے اُس لڑکے سے کہا کہ وہ بیج اُتار دے۔ بیج اُتار کر اُس نے مجھے پکڑا دیا۔ میں نے وہ بیج اُس سرکاری مسلمان کو دیتے ہوئے کہا کہ چلو تم تو مسلمان ہو یہ بیج تم لگا لو۔ اس پر وہ بدک کر وہاں سے یوں بھاگا جیسے کوئی سانپ کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔

۲۵ فروری ۱۹۸۵ء کو ملک بھر میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ ایم آر ڈی کی جماعتوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اُدھر مولویوں نے شور مچا رکھا تھا کہ قادیانیوں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹاؤ۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے ایک دِن پہلے یعنی ۲۷ فروری کو میں حسب دستور اپنے دفتر پہنچا تو میرے دفتر کے دروازے پر نام نہاد مولانا اللہ وسایا کی یاوہ گوئیوں پر مشتمل احمدیوں کے خلاف سخت توہین آمیز مغلظات سے بھرپور پوسٹر چسپاں تھا۔ میں نے اُسے اُتارنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے چپڑاسی سے پوچھا کہ یہ کاغذ کس نے لگایا ہے۔ اُس نے سر ہلا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ لیکن اُن لوگوں نے اِسے اِس طرح چسپاں کیا تھا کہ پھاڑے بغیر اُتارا نہ جاسکے۔ میں نے اپنے چپڑاسی سے کہا کہ وہ یہ پوسٹر اُتارے۔ پوسٹر اُتارنے کی بجائے اُس نے جا کر اُن لوگوں کو اطلاع کر دی جنھوں نے یہ چسپاں کیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہی لوگ آ کر مجھ سے جھگڑنے لگے جو ایک دن قبل اپنے ساتھی احمدی کے سینے سے کلمے کا بیج اُتروانے کیلئے آئے تھے اور پھر دھمکی آمیز لہجے میں یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلے گئے کہ اگر آپ نے اِس پوسٹر کو اُتروانے کی کوشش کی تو اِس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔ ایک بجے کے قریب میں اِس واقعہ کی ٹیلیفون پر اطلاع دینے کی غرض سے پروڈکشن منیجر کے دفتر میں گیا تو وہی لوگ لیبر یونین کے صدر کو ساتھ لے کر میرے پیچھے آ گئے۔ میں ایک طرف صوفے پر بیٹھا تھا۔ انہوں نے آ کر مجھے گھیر لیا۔ لیبر یونین کے صدر نے آتے ہی مجھے گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ دفتر سے باہر اُس نے ساری مل کے مزدوروں کو اکٹھا کر رکھا تھا جو میرے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ پہلے تو لیبر یونین کے صدر نے مجھ پر وہاں پر ہی تشدد شروع کر دیا اور پھر غصے سے پاگل پن کی اِس حد تک گر گیا کہ بھری مجلس میں اپنی شلوار کھول کر ننگا ہو گیا اور میرے سامنے کھڑا ہو کر فحش حرکات کرنے لگا۔ اُس جنونی شخص نے اِسلام کے نام پر ہماری بزرگ ہستیوں کی شان میں جو جو مغلظات بکیں، اُنہیں ضبطِ تحریر میں لانا میرے بس کی بات نہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اِس سارے واقعہ کے دوران پروڈکشن منیجر اور سیکورٹی آفیسر بھی موجود تھے لیکن کسی نے بھی مداخلت کر کے اُنہیں روکنے زحمت گوارا نہ کی۔

اس کے بعد وہ مجھے وہاں سے گھسیٹ کر دفتر سے باہر لے آئے۔ صدر لیبر یونین اور اُس کے ساتھیوں نے مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر بے بس کیا ہُوا تھا۔ باقی مجمع گھونسوں، ٹھڈوں اور جو کسی سے بن پڑا اُس سے مجھ پر اپنا غصہ ٹھنڈا کر کے اسلام کی خدمت کرتا رہا۔ مارتے مارتے وہ مجھے لے کر مل کے گیٹ کی طرف چل پڑے راستے میں وہ اچھل اچھل کر یوں میرے سر پر کہنیاں مارتے جیسے فری سٹائل کشتیوں میں پہلوان اپنے مخالف کے سر پر مارتے ہیں۔ سنا ہے کہ وہ تو محض اداکاری ہوتی ہے لیکن یہ لوگ تو باری باری اپنی پوری طاقت سے میرے سر پر وار کرتے اور ساتھ ہی یا علی کا نعرہ بھی لگاتے۔ عجیب اتفاق ہے کہ کوئی دو ڈھائی سو کا مجمع بھڑوں کی طرح مجھے ڈنگ مار رہا تھا لیکن مجھ پر اُس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ہر کوئی اس جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی خاطر میری دُھلائی میں مصروف تھا لیکن مجھے اُن کی حالت پر غصے کی بجائے رحم آ رہا تھا۔ تھک ہار کر انہوں نے مجھے مل کے گیٹ سے باہر پھینکتے ہوئے دھمکی دی کہ آج کے بعد اگر مل میں داخل ہونے کی کوشش کی تو جان سے مار دیں گے۔

اُن دِنوں شیخ محمد احمد مظہرؓ صاحب مرحوم جماعت ہائے احمدیہ فیصل آباد کے امیر تھے۔ اُن کی عمر اُس وقت نوے سال کے قریب تھی لیکن وہ اِس پیرانہ سالی میں بھی وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ میں سیدھا کچہری میں اُن کے چیمبر پہنچا۔ وہاں پر خود شیخ صاحب تو موجود نہ تھے مگر اُن کے صاحبزادے شیخ مظفر احمد صاحب ظفر ایڈووکیٹ اور چوہدری غلام دستگیر صاحب مرحوم ایڈووکیٹ نائب امیر فیصل آباد حاضر تھے۔ وہ دونوں میری حالت دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے۔ دریافت کرنے پر میں نے اپنے ساتھ ہونے والا مندرجہ بالا حادثہ بیان کر دیا۔ اُنہوں نے مجھے تسلی دی اور اُسی وقت مجھے ساتھ لے کر امیر صاحب کی خدمت میں مشورے کیلئے اُن کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ آپ نے مشورہ دیا کہ اِس واقعہ کی پولیس میں رپورٹ درج کرانا ضروری ہے۔ اُنہوں نے کمال شفقت سے پولیس میں رپورٹ درج کرانے کیلئے درخواست اِملا کرائی اور فرمایا کہ ڈسٹرکٹ ہسپتال سے اپنا طبی معائنہ کروا کر متعلقہ تھانہ میں رپورٹ درج کروا دی جائے۔

جب میں شام ۴ بجے کے قریب تھانہ نشاط آباد پہنچا تو وہاں کا ایس ایچ او عملہ سمیت جائے واردات پر گیا ہُوا تھا۔ دراصل لیبر یونین کے صدر نے میری طرف سے ممکنہ قانونی چارہ جوئی کے پیش نظر فیصل آباد کے سیکریٹری مجلس تحفظِ ختم نبوت مولوی فقیر محمد کو اِطلاع کر دی تھی۔ جس نے وہاں پہنچ کر ڈپٹی کمشنر اور ایس ایس پی پولیس کو فون کر کے مطالبہ کیا کہ مل کے

قادیانی آفیسر میجر عبدالوحید ظفر نے ختم نبوت کا پوسٹر پھاڑ کر چونکہ توہین رسالت کا ارتکاب کیا ہے اسلئے اُس کے خلاف پرچہ درج کر کے اُسے فوری طور پر گرفتار کیا جائے۔ اور اُسے فوری طور پر نوکری سے بھی برخاست کیا جائے۔ انتظامیہ پر دباؤ ڈالنے کیلئے مل کے مزدوروں کو اکٹھا کر کے اُنہوں نے میرے خلاف اِشتعال انگیز تقریریں شروع کر دیں۔ ایس ایس پی نے متعلقہ تھانہ انچارج کو موقع پر پہنچ کر حالات کا جائزہ لینے کا حکم دیا۔ ایس ایچ او نے موقع پر پہنچ کر مِل انتظامیہ، لیبر یونین کے صدر اور مولوی فقیر محمد کی بتائی ہوئی کہانی تو سنی لیکن میں چونکہ موقع پر نہ تھا اسلئے مجھ سے بات کرنے کا اُسے موقع نہ ملا تھا۔ جب وہ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد واپس آیا تو مجھے تھانے میں پا کر ہکا بکا رہ گیا۔ اُس نے چونکہ یکطرفہ کہانی سن رکھی تھی اسلئے پولیس والوں کا حربہ اِستعمال کرتے ہوئے چھوٹتے ہی اُس نے مجھ پر چڑھائی کر دی:

''الیکشنوں کے دوران آپ نے یہ کیا ہمارے لئے نظم وضبط کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے؟''

میں نے اپنی درخواست اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: ''میں نے مسئلہ کھڑا کیا ہے.....؟ آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں.....؟؟''

''ہم نے موقع پر جا کر تفتیش کی ہے۔ سب لوگ آپ کے خلاف ہیں۔ میرے لئے تو اوپر سے حکم ہے کہ آپ کو فوری طور پر گرفتار کیا جائے!'' انسپکٹر غصے سے مجھ پر چڑھائی کرتے ہوئے بولا۔

میں نے اُس کی دھمکی کو نظرانداز کرتے ہوئے بے دھڑک ہو کر کہا: ''میں کوئی نارزن نہیں ہوں جو ساری مل کے مزدوروں سے ٹکر لیتا پھروں۔ حقیقت یہ ہے کہ مل کا ایک مخصوص طبقہ مجھے میرے عقیدہ کی وجہ سے نوکری سے برطرف کروانا چاہتا ہے۔ اِسی لئے اُنہوں نے مذہب کا بہانہ بنا کر مجھے تشدد کا نشانہ بنوایا ہے۔ میری حالت آپ کے سامنے ہے اور میں آپ کے پاس خود ہی آ گیا ہوں۔ مجھے گرفتار کرنے کیلئے آپ کو کہیں جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے بیشک گرفتار کریں لیکن میری درخواست کو پڑھیں اور اُس پر بھی کارروائی کریں!!''

انسپکٹر بھلا آدمی تھا۔ میری حالت دیکھ کر اور میری باتیں سن کر وہ دھیما پڑ گیا۔ اُس نے مجھے ساتھ والے کمرے میں اِنتظار کرنے کیلئے کہا اور خود افسرانِ بالا کو ٹیلیفون کر کے اصل واقعات سے مطلع کرنے لگا۔ اُس نے اُنہیں بتایا کہ میجر وحید یہاں تھانے میں آ کر بیٹھا ہے۔ میڈیکل رپورٹ اُس کے پاس ہے اور اُس کا اِصرار ہے کہ مل کی لیبر یونین کے ممبران نے اُسے مارا پیٹا ہے۔ لہٰذا اُن کے خلاف پرچہ درج کیا جائے۔ کچھ دیر کے بعد انسپکٹر مجھے بلا کر کہنے لگا: ''میجر صاحب ہماری طرف سے آپ فارغ ہیں!! کل گیارہ بجے آپ ڈی ایس پی صاحب سے کوتوالی روڈ پر اُن کے دفتر میں مل لیں!''

میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا:'' تھانیدار صاحب میں آپ کے بلانے پر یہاں نہیں آیا جو آپ مجھے جانے کی اجازت دے رہے ہیں!...... میں یہاں پر اپنے خلاف ہونے والے تشدد کے جرم میں ملزمان کے خلاف پرچہ درج کرانے آیا ہوں!!''

'' آپ گورنمنٹ کے ملازم ہیں۔اور یہ وقوعہ ڈیوٹی کے دوران پیش آیا ہے۔ اِسلئے اگر آپ نے پرچہ درج کروانا ہے تو اپنے افسران بالا کی وساطت سے درخواست بھجوائیں!'' اُس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔لیکن میں بضد تھا کہ میں بطور ایک شہری کے اُس کے پاس اپنی شکایت لے کر آیا ہوں کہ فلاں فلاں شخص نے مجھ پر تشدد کیا ہے جس کے ثبوت کے طور پر میڈیکل رپورٹ موجود ہے۔ وہ ملزمان کے خلاف میری طرف سے پرچہ درج کرے لیکن وہ اِنکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا:

'' میجر صاحب مجھے حکم ملا ہے کہ نہ تو آپ کا پرچہ درج کیا جائے اور نہ ہی گرفتار! اسلئے آپ بلا وجہ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔مزید کوئی بات کرنی ہو تو کل ڈی ایس پی صاحب سے کر لیں!!''

اگلے دن جب میں ڈی ایس پی کے دفتر پہنچا تو مولوی فقیر محمد اپنے پورے لاؤلشکر کے ساتھ مجھ سے پہلے ہی وہاں پر موجود تھا۔ڈی ایس پی کوئی بھلا مانس آدمی لگتا تھا۔مجھ سے بڑی عزت سے پیش آیا۔گزشتہ روز والے واقع کے بارے میں چند ایک سوال پوچھے اور مجھے اپنی طرف سے مناسب کارروائی کرنے کی جھوٹی تسلی دے کر گھر واپس بھیج دیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس سارے عرصے کے دوران مولوی فقیر محمد اور اُس کے ساتھیوں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ وہ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ضرور رہے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے آنے سے اُن سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔محترم امیر صاحب جماعت احمدیہ سے مشورہ کے بعد میں نے اپنی درخواست بذریعہ ڈاک ایس ایس پی فیصل آباد کو ارسال کر دی۔ لیکن اُس نے بھی اِس پر کوئی کارروائی نہ کی۔ مارشل لاءَ حکام سے رابطہ کیا گیا تو اُن کی طرف سے جواب ملا کہ وہ سول اِنتظامیہ کے معاملات میں مداخلت کرنے کے مجاز نہیں۔

مذہب کے نام پر برطرفی

یونین کے ممبران کے خلاف کوئی تادیبی کارروئی کرنے کی بجائے مل اِنتظامیہ نے نامناسب ماحول کا بہانہ بنا کر اگلے چند دِن کیلئے مجھے مل میں جانے سے روک دیا اور ۲ مارچ کو مندجہَ ذیل خط کے ذریعے مجھے تین دن کی جبری چھٹی پر بھیج دیا:

'' مل کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی ناخوشگوار واقعہ سے بچنے کیلئے انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ

آپ کو ۳ مارچ سے ۵ مارچ تک تین دِن کی چھٹی پر بھیج دیا جائے۔ آپ سے درخواست ہے کہ جب بھی انکوائری شروع ہو اُس سے تعاون کریں۔''

میں نے اِس کے خلاف چیئر مین گھی کارپوریشن، وفاقی محتسب اور صدر پاکستان کے پاس اپیلیں کیں۔ چیئر مین گھی کارپوریشن اور صدر کی طرف سے تو کوئی جواب نہ مِلا البتہ وفاقی محتسب کی طرف سے میرے خط کا جواب تو آیا مگر معذرت کی صورت میں۔ صدر کی طرف سے کسی جواب کا نہ ملنا سمجھ میں آتا تھا اِسلئے کہ یہ سب کچھ اُسی کی وجہ سے تو ہو رہا تھا مگر چیئر مین گھی کارپوریشن نے بھی چپ سادھ رکھی تھی۔ اُس سے میں نے انٹرویو لیا تو اُس نے بغیر کِسی لگی لپٹی کے مجھے بتا دیا کہ اُس کے پاس مولویوں کے وفود تا حال آ رہے ہیں۔ اُن کا مطالبہ ہے کہ میرے خلاف توہین رسالت کا مقدمہ درج کرایا جائے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ میری یہی مدد کر سکتے ہیں کہ وہ مولویوں کی بات پر دھیان نہ دیں۔

مندرجہَ بالا واقعہ کی اطلاع جب میں نے اپنے امام حضرت مرزا طاہر احمد کو لندن میں دی تو آپ نے دریافت فرمایا کہ قبل ازیں آپ کو نائیجیریا چلے جانے کا مشورہ دیا گیا تھا اُس کا کیا بنا؟ میں حضور کو کیا لکھتا کہ وہاں سے تو میں واپس آ گیا ہوں۔ اور اب وہاں پر دوبارہ جانے کا کوئی مزید چانس بھی نہیں ہے۔ میرے لئے پاکستان میں باعزت روزگار کا حصول اگرچہ ناممکن ہو چکا تھا لیکن میں نے ابھی تک اِسے خیر باد کہنے کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ اور سوچتا بھی کیسے اب تو میرے پانچ بچے بھی مختلف سکولوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ اُنہیں کی خاطر تو میں نے قبل ازیں نائیجیریا کی اچھی بھلی ملازمت کو لات ماردی تھی۔ لیکن اب میں پھر اُسی دوراہے پر کھڑا تھا۔ اگر اِنسان کا عقیدہ پختہ ہو اور خدا پر توکل ہو اور بزرگوں کی دُعائیں اُس کے ساتھ ہوں تو خدا کا غیبی ہاتھ اُس کے راستے کی ساری مشکلیں دور کرتا چلا جاتا ہے اور اُسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ اُس کا وہ خدا جِس کی خاطر وہ تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتا رہا ہے کِس طرح اُس کیلئے آسانیاں پیدا کرتا جاتا ہے۔ یہ کفرانِ نعمت ہوگا اگر اِس بات کا اعتراف نہ کروں کہ اِس آزمائش کے عرصہ میں بھی خدائے بزرگ و برتر نے ہمیں مالی تنگی سے دوچار نہ ہونے دیا۔ میرے بچے فیصل آباد کے اعلیٰ سکولوں میں زیرِ تعلیم تھے۔ ذاتی مکان کے علاوہ کچھ منقولہ و غیر منقولہ جائداد بھی تھی۔ وقت عزت سے کٹ رہا تھا۔ البتہ مذہب کی بنا پر اِستحصال کا شکار تھے۔

وارنٹ گرفتاری

اس کے کچھ عرصہ بعد ایک دن شام کے وقت پولیس کا ایک سب انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ میری رہائش گاہ پر آیا۔ سلام دُعا کے بعد اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے پاس میری گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔ دراصل سرگودھا کے ایک مجسٹریٹ راؤ تجمل حسین کی عدالت میں حاضری کے سمنوں کی عدم تعمیل کی بنا پر مفرور قرار دے کر میرے وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے تھے۔ اُس نے کہا کہ وہ چونکہ مجھے پہلے سے جانتا ہے اسلئے وہ میرے پاس سول کپڑوں میں آیا ہے تاکہ محلّہ میں میری رسوائی نہ ہو۔ اُس نے مجھے گرفتار کرنے کی بجائے فوری طور پر ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کا مشورہ دیا۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جاچکا ہے فوجی فرٹیلائیزر کمپنی نے سرگودھا کے گودام کے سپروائیزر نائب رسالدار شہاب الدین کے خلاف کھاد کے غبن کا کیس دائر کر رکھا تھا۔ اپنے قبیلے کا رانگڑ ہونے کے ناطے دراصل اِس شخص کو راؤ فرمان علی نے بھرتی کیا تھا۔ راؤ فرمان علی کے مان پر اِس شخص نے لاکھوں کا غبن کیا اور جب پکڑا گیا تو مجھے بھی اپنے ساتھ اِس میں ملوث کرنے کی کوشش کی لیکن پولیس نے ابتدائی تفتیش کے بعد مجھے بے قصور قرار دے کر فارغ کر دیا۔ اِتفاق سے انہی دِنوں ملک میں انتخابات کی مہم بھی چل رہی تھی۔ راؤ فرمان علی بھی اپنے حلقے سے قومی اسمبلی کا اُمیدوار تھا۔ گمان غالب ہے کہ شہاب الدین کے رشتہ داروں نے راؤ فرمان کی حمایت کیلئے شرط لگائی کہ وہ شہاب الدین کو غبن کے کیس سے فارغ کروائے۔ راؤ فرمان علی نے اپنے اثر و رسوخ سے اِس کیس کی سماعت سرگودھا میں اپنی برادری کے مجسٹریٹ راؤ تجمل کی عدالت میں منتقل کروا کر شہاب الدین کے جرم کو میرے سر تھوپنے کا منصوبہ بنایا۔ یعنی 'طویلے کی بلا بندر کے سر'!! راؤ تجمل ملزم شہاب الدین کے بیان پر پہلے تو غلط نام اور پتہ پر میرے عدالتی سمن بھجواتا رہا اور پھر عدم تعمیل کی بنا پر مجھے اشتہاری قرار دے کر وارنٹ گرفتاری جاری کر دئے۔ بہر حال اگلے دن ضمانت کی غرض سے میں سیدھا اُسی کی عدالت میں جاپہنچا۔ میں نے جب اُس سے اپنا تعاف کرایا تو وہ پہلے تو ہکا بکا رہ گیا اور پھر مسکرا کر مجھے حیرت سے تکنے لگا۔ اور پھر ذرا توقف کے بعد بولا:

''میجر صاحب آپ بڑے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے تو آپ کے وارنٹ گرفتاری جاری

کر رکھے ہیں۔ میں آپ کی ضمانت کیسے لے سکتا ہوں؟''

اور پھر برآمدہ میں کھڑے پولیس کے سپاہی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ''اس پولیس والے کو دیکھتے ہیں آپ؟ اگر میں چاہوں تو اس کو حکم دے کر آپ کو جیل بھجوا سکتا ہوں کہ کل اسے میری عدالت میں ہتھکڑی لگا کر پیش کریں۔ یہ سمجھیں کہ آپ مجھ ملے ہی نہیں! جائیں جا کر سیشن جج کی عدالت سے ضمانت قبل از گرفتاری کرائیں!''

ممکن ہے میرے اُس کی عدالت میں اِس طرح بے دھڑک پہنچ جانے کی وجہ سے اُس کو میری بے گناہی کا یقین ہوگیا ہو اور میرے خلاف کارروائی وہ کسی دباؤ کے تحت کر رہا ہو۔ ورنہ اگر وہ اِس سازش کا حصہ ہوتا تو مجھے بے عزت کرنے کی خاطر جیل ضرور بھجوا دیتا۔ میں نے اُس بھلے مانس آدمی کا شکریہ ادا کیا اور ملک محمد اشرف ایڈووکیٹ کے ذریعے سیشن کورٹ سے ضمانت قبل از گرفتاری کروا لی۔ اگلی پیشی پر میرے وکیل نے اپنی بحث کے دوران استدلال پیش کیا کہ ملزم کے محض اِس بیان پر کہ فلاں شخص بھی اُس کے ساتھ جرم میں شامل تھا عدالت اُسے شریک جرم بنا کر طلب کرنے کی مجاز نہ ہے۔ بلکہ جب ملزم نے اِس بات کا اقرار کرلیا کہ اُس نے جرم کیا ہے مگر اُس کے ساتھ فلاں فلاں شخص بھی شامل تھا تو اُس کے اقبال جرم پر عدالت کو اُسی وقت اُسے مجرم قرار دے کر سزا سنا دینی چاہیئے تھی۔ میرے وکیل کے دلائل سے اِتفاق کرتے ہوئے ملک لطف علی ایڈیشنل سیشن جج نے مجھے اِس کیس سے نہ صرف یہ کہ باعزت بری کردیا بلکہ راؤ تجمل کو سرزنش کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا کہ اپیل کنندہ میجر عبدالوحید ظفر کو اِس کیس میں بلا کر اُس نے ایک ایسی احمقانہ حرکت کی ہے جو قانون کے بارے میں اُس کے علم کو مشکوک کرنے کیلئے کافی ہے۔ اُس نے یہ مقدمہ ایک دوسرے مجسٹریٹ کی عدالت میں منتقل کرتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا کہ اپیل کنندہ کو اِس کیس کے سلسلے میں آئندہ طلب نہیں کیا جائے گا۔ اِس طرح کوئی تین چار ماہ تک عدالتوں کے چکر کاٹ کر میری اِس کیس سے جان چھوٹ گئی۔ مجھے تو میرے خدا نے سرخرو کردیا لیکن راؤ فرمان علی کو الیکشن میں ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اِس دفعہ مجھے میرے خدا نے فتح نصیب کی اور دشمن کے حصے میں ذلت اور شرمناک ہزیمت آئی۔

باب۲۳

احمدیت کے خاتمے کا عزم

ملک میں دن بدن بڑھتی ہوئی مہنگائی، سیاسی بے چینی، قتل و غارت، چوری چکاری اور پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں کی ڈکیتی کی بڑھتی ہوئی وارداتوں سے عوام کی توجہ کا رُخ پھیرنے کیلئے ضیاٗ الحق نے قاتلانِ نبوت کو بے ضرر احمدیوں پر ظلم ڈھانے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ جب سے مرزا طاہر احمد ضیاٗ الحق کے بچھائے ہوئے جال سے بچ کر لندن منتقل ہوئے تھے؛ جب سے اپنے زعم میں سرزمین پاکستان کا یہ مختارِ کل اور وقت کا فرعون اپنے تمام تر دنیاوی وسائل کے باوجود اُسے حراست میں لینے میں ناکام رہا تھا اُس وقت سے وہ زخمی سانپ کی طرح جماعت احمدیہ کے ہر فرد کو ایذا پُہنچا کر تسکین محسوس کرتا تھا۔ اپنی اناٗ کی تسکین کی خاطر پہلے تو اُس نے احمدیہ جماعت کے خلاف محض مفروضوں پر مبنی حکومت کی طرف سے ایک وائٹ پیپر شائع کر کے بیرون ملک پاکستان کے تمام سفارت خانوں کو بھجوایا۔ اور پھر اگست ۱۹۸۴ء میں غنڈہ خصلت مولویوں کو حکومتی خرچے پر ختم نبوت کانفرنس کے نام پر لندن بھیج کر احمدیوں کے خلاف زہر اگلنے کا موقع فراہم کرتے ہوئے بڑے فخر سے اس بات کا اعتراف کیا کہ اُس کی حکومت نے پچھلے چند سالوں میں قادیانیوں کو مسلمانوں کا بہروپ دھارنے اور شعارِ اسلام کو اپنانے سے روکنے کیلئے سخت ترین اقدامات کئے ہیں۔ اُس نے اپنے اِس عزم کا بھی اعادہ کیا کہ وہ ''قادیانیت کے کینسر'' کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کو یقینی بنانے کیلئے اپنی کوششیں جاری رکھے گا۔ قادیانیت کا کینسر تو دِن بدن اپنی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر کرتا جا رہا ہے۔ اور دنیا کے دوسو کے قریب ممالک میں پھیل چکا ہے لیکن اس کینسر کو جڑ سے اُکھاڑنے والوں کا جو عبرتناک انجام ہُوا وہ رہتی دنیا تک یاد رہے گا۔ آنکھوں والو

دیکھو اور عبرت حاصل کرو!!

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے احمدیوں کے خلاف پچھلے دو ڈھائی سال سے ضیاء الحق نے استحصالی مہم تیز تر کر رکھی تھی۔ نہ صرف یہ کہ احمدیوں کو حیلے بہانے سے اُن کی نوکریوں سے فارغ کیا جا رہا تھا بلکہ نئی نسل کے لئے ترقی کے سارے راستے بند تھے۔ اعلیٰ ملازمتوں کے حصول اور پروفیشنل اداروں اور کالجوں میں داخلہ کے سلسلے میں اُن سے امتیازی سلوک روا رکھا جا رہا تھا۔ ہر وہ آسامی جس پر احمدیہ جماعت کا فرد کام کرتا تھا قاتلانِ نبوت کے نزدیک وہ کلیدی آسامی تھی۔ اسلئے اُسے اُس سے ہٹایا جانا ضروری تھا۔ پروفیشنل کالجوں اور اداروں میں پہلے سے زیرِ تعلیم احمدی طلباً کو ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

ان تمام مشکلات کے باوجود ملک چھوڑنے کے بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں نے ہمیشہ اپنے وطن میں کم تنخواہ کے روزگار کو غیر ملکی نوکری پر ترجیح دی۔ جیسا کہ شروع میں بیان کیا جا چکا ہے اپنے کیریئر کی ابتدا میں نے برطانیہ کا ورک پرمٹ ملنے کے باوجود اپنے ملک میں فوج کی نوکری سے کی۔ اور فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد لیبیا اور نائیجیریا میں اچھی بھلی ملازمتوں کو چھوڑ کر وطن واپس آ گیا۔ لیکن اس کے بعد یکے بعد دیگرے چند ایک ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے ہمیں اس بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ دیگر فوجی آفیسروں کے بچوں کی طرح میرے بیٹوں کی بھی شدید خواہش تھی کہ فوج میں کمیشنڈ آفیسر بنیں۔ چنانچہ میٹرک پاس کرنے کے بعد میرے بڑے بیٹے نے بھی پاکستان ائرفورس میں جی ڈی پائلٹ بننے کیلئے درخواست دے دی۔ ابتدائی ٹیسٹوں کے بعد جب وہ انٹرویو کیلئے پیش ہُوا تو انٹرویو کرنے والے آفیسر نے یہ جان کر کہ وہ احمدی ہے اُس سے جان بوجھ کر یہ سوال کیا کہ پائلٹ بننے کے بعد اگر اُسے ''قادیانیوں کے مرکز ربوہ'' پر بمباری کرنے کا حکم دیا جائے تو کیا وہ اِس پر عمل کرے گا؟ اُس نے حیران ہو کر جواب دیا کہ ''سر ربوہ تو پاکستان کا حصہ ہے! ایسا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے؟''

لیکن انٹرویو کرنے والے آفیسر نے اِصرار کیا کہ اُسے ہاں یا نہ میں جواب چاہیئے۔ بچہ سمجھ گیا کہ یہ شخص اُسے فیل کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے بھی بے دھڑک ہو کر جواب دیا: کہ اگر یہ بات ہے تو "I say no!!" بہر حال بچے کو فیل کر دیا گیا۔ اِسی قسم کا معاملہ میرے دوسرے بیٹے کے ساتھ بھی پیش آیا۔ بددل ہو کر اِس کے بعد اُنہوں نے افواجِ پاکستان میں شامل ہونے کی کوشش ہی چھوڑ دی۔

ہجرت ثانی

ویسے تو ہمارے امام کو پاکستان میں احمدیوں کے حالات سے بخوبی آگاہی تھی لیکن اپنے ساتھ اور اپنے بچوں کے ساتھ پیش آنے والے مخصوص واقعات کا حوالہ دے کر میں نے آپ کی خدمت میں دُعا اور مشورہ کی غرض سے خط لکھا تو آپ نے آسٹریلیا چلے جانے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ اس سلسلے میں چوہدری حمید اللہ صاحب وکیل الاعلیٰ تحریک جدید سے رہنمائی حاصل کروں۔ حضورؒ انور کی ہدایت کے مطابق میں آپ کا خط لیکر چوہدری حمید اللہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ چوہدری صاحب میرے ٹی آئی کالج میں ریاضی کے اُستاد تھے۔ اُس وقت سے اُن سے شناسائی تھی۔ اُنہوں نے مجھے مزید رہنمائی کیلئے اپنے وکیل التبشیر منصور احمد خان کے سپرد کر دیا۔ اُن کے مشورے سے آسٹریلیا میں امیگریشن کیلئے کوشش کی گئی لیکن اُن کی پیش کردہ شرائط پر ہم پورے نہ اُترے۔ بہر حال بزرگوں کی دُعائیں اور نیک تمنائیں جن کے ساتھ ہوں اُن کیلئے اگر ایک در بند ہو جائے تو دوسرا خود بخود کھل جاتا ہے۔

اِتفاق سے کچھ عرصہ پہلے میری شناسائی چند ایسے دوستوں سے ہوگئی تھی جو روٹری انٹرنیشنل کے ممبر تھے۔ اُن کے ایماء پر میں بھی روٹری کلب کا ممبر بن گیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ روٹری انٹرنیشنل بلا امتیاز مذہب، رنگ و نسل کے دنیا بھر میں سماجی کاموں میں سرگرم عمل ہے۔ یہ نہ تو کوئی سیاسی ادارہ ہے اور نہ ہی مذہبی۔ اِس لئے اِس کے ممبران عمومی طور پر مذہبی تعصب سے بالا ہوتے ہیں۔ سب ممبران خدمت خلق کے کاموں میں مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔ روٹری کلب میں شمولیت کے وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ادارہ آڑے وقت میں میرا مددگار ثابت ہوگا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی خاص حکمت کے تحت اِس میں شامل ہونے پر آمادہ کیا تھا۔ روٹری انٹرنیشنل کے ممبران کی سالانہ کنونشن باری باری دنیا کے مختلف ممالک میں ہوتی ہے جس میں دنیا بھر کے روٹیرین اور اُن کے اہل خانہ کو شمولیت کی دعوت عام ہوتی ہے۔ حسن اِتفاق سے اِس دفعہ یہ کنونشن جرمنی کے شہر میونخ میں ہو رہی تھی۔ روٹری کلب کا عہدہ دار ہونے کی حیثیت سے مجھے اور میرے بیوی بچوں کو آسانی سے جرمنی کا ویزہ مل گیا۔

چنانچہ ۱۴ جون ۱۹۸۷ء کو ہم مغربی جرمنی کے شہر کولون میں پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر ہم نے اپنے محسن حضرت مرزا طاہر احمدؒ کی خدمت میں اطلاع دی تو آپؒ نے ڈھیر ساری دعاؤں کے

ساتھ جرمنی میں ہی سیٹ ہونے کا مشورہ دیا۔ اِس طرح ہم جرمنی میں ہی ٹھہر گئے۔

کولون شہر کے وسط میں ہمیں تین کمرے کا ایک فلیٹ مل گیا۔ ستمبر تک سکولوں میں چھٹیاں تھیں۔ اس عرصے کے دوران میں نے بچوں کیلئے جرمن زبان سیکھنے کیلئے پرائیویٹ ٹیچر کا انتظام کر دیا۔ چھٹیوں کے بعد چھوٹے بچوں کو تو سکولوں میں داخلہ مل گیا لیکن ہمارا بڑا بیٹا عامر عزیز جو پاکستان میں بارہ سال تک پڑھ کر آئی کام پاس کر کے آیا تھا اُس کی سند کو یہاں پر میٹرک کے برابر تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ اُسے دوبارہ گیارھویں جماعت میں داخلہ لینا پڑا۔ پاکستان کے بی اے، بی ایس سی کو جرمنی میں اُن کی تیرہ سالہ پڑھائی کے بعد حاصل کردہ آبی ٹوئر کے سرٹیفکیٹ کے برابر مانا جاتا ہے۔ لیکن یونیورسٹی میں پڑھائی چونکہ جرمن زبان میں ہے اسلئے یہاں یونیورسٹی میں داخلہ کیلئے جرمن زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ اس طرح مزید سال ڈیڑھ سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔

جرمن قانون کے مطابق ریذیڈنٹ پرمٹ ملنے تک غیر ملکیوں کو نہ تو کسی نوکری کی اجازت تھی اور نہ ہی کسی بھی نوع کی تجارت کی۔ اس تمام عرصہ میں حکومت کی طرف سے ہمیں گزارہ الاؤنس ملتا تھا۔ میں چونکہ فارغ تھا اس لئے گھر پر وقت ضائع کرنے کی بجائے کولون یونیورسٹی میں داخلہ لے کر جرمن زبان پڑھنے لگا۔ ہم سب نے مل کر خوب محنت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری محنت میں برکت ڈالی اور ہمارے بچے جرمنی کے بہترین سکولوں یعنی جمنازیم میں پہنچ گئے۔ ڈیڑھ سال کی محنت کے بعد جرمن زبان کا یونیورسٹی لیول کا امتحان پاس کر کے میں نے جرمن قانون پڑھنا شروع کر دیا۔ اس طرح ہم سب مل کر حصولِ تعلیم کے راستے پر چل پڑے۔

ہمارے آنے کیساتھ ہی ضیاء کے ستائے ہوئے دیگر احمدی بھی پاکستان سے جرمنی پہنچنے شروع ہو گئے۔ ایک تو جرمن آئین میں ہر اُس شخص کو سیاسی پناہ حاصل کرنے کا حق حاصل تھا جسے اُس کے ملک میں سیاسی، مذہبی یا نسلی بنیادوں پر استحصال، قید و بند یا جان کا خطرہ ہو۔ دوسرے یہاں کا ویزہ لگوانا دیگر یورپی ملکوں کی نسبت آسان تھا۔ تیسرے سولہ سال سے کم عمر کے بچوں کو جرمنی کے ویزے کی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح پاکستان سے احمدیوں کے خاندانوں کے خاندان جرمنی پہنچنے لگے۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی خاطر بہت سوں نے تو اچھے بھلے محفوظ کاروباروں اور ملازمتوں کو لات ماری، گھر بار اونے پونے بیچا اور یہاں پہنچ گئے۔

چونکہ ملکی قانون کے مطابق اِن لوگوں کو چار سال تک یا سیاسی پناہ کی درخواست کی منظوری تک نہ تو ملازمت اور محنت مزدوری کی اجازت تھی اور نہ ہی کسی بھی قسم کے کاروبار کی اِسلئے اکثر

کے پاس کوئی مصروفیت نہ تھی۔ چنانچہ مشن ہاؤسز اور نماز سینٹروں کی رونقیں دوبالا ہوگئیں۔ ہفتے کے سات دن میں سے آخری تین دنوں میں تو یہاں عید اور میلے کا سا سماں ہوتا۔ کبھی تبلیغی سیمینار منعقد ہو رہا تھا تو کبھی تربیتی کلاس۔ مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے احمدیوں کے گروپ بنا کر اُنہیں جماعتوں میں منظم کیا جانے لگا۔ ایک ایک جماعت کئی کئی دیہاتوں اور قصبوں پر محیط تھی۔ جوں جوں نفری بڑھتی گئی توں توں جماعت کے مبلغین کی تعداد میں بھی اضافہ کیساتھ اُن کی ذمہ داری کی نوعیت بھی بدل گئی تھی۔ اب اُن کا اکثر وقت پاکستان سے آئے ہوئے احمدیوں کی تربیت میں صرف ہونے لگا۔ ہمیں جرمن زبان تو آتی نہ تھی البتہ بازاروں اور عوامی جگہوں پر سٹال لگا کر جرمن اور دیگر غیر ملکی زبانوں میں جماعت کا لٹریچر تقسیم کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ ٹوٹی پھوٹی جرمن میں اُن کے سوالوں کے جوابات بھی دینے لگے۔ ہم جب بتاتے کہ ہم میں اور دوسرے مسلمانوں میں یہ فرق ہے کہ ہم خمینی یا صدام والے جہاد کے خلاف ہیں۔ ہم دین میں جبر کے قائل نہیں بلکہ قلم اور دلیل سے دلوں کو قائل کرنے پر یقین رکھتے ہیں تو وہ حیران ہو جاتے۔ اور جب ہم اُنہیں بتاتے کہ بنیادی طور پر اسی فرق کی بنا پر پاکستان کی حکومت نے پہلے ہمیں آئین اور قانون کی رو سے نان مسلم قرار دیا اور پھر جنرل ضیا کی سرپرستی میں تشدد پسند ملانوں نے ہمارے فرقے کے لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اِس لئے ہمارے لوگ اسلامی ملکوں کو چھوڑ کر یورپ کے ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہیں تو ایسا لگتا تھا جیسے ہماری باتوں سے اُن کی دلی طور پر تسلی نہیں ہوئی۔ اِس کے علاوہ دیگر تیسری دنیا سے آئے ہوئے غریب ملکوں کے ہم جیسے پناہ گزینوں کی بھی کوئی مصروفیت نہ تھی۔ وہ بھی ہماری مہمان نوازی کا لطف اُٹھانے لگے۔ بہرحال اِس طرح ہمیں دعوت الی اللہ کا موقع خوب ملا۔

ہماری جماعت نے سب سے زیادہ خدمت اپنے بوزنیا کے مظلوم مسلمان بھائیوں کی کی۔ مگر کچھ عرصہ بعد رابطۂ عالم اسلامی کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ ان لوگوں نے بھی ہمارے جلسوں میں آنا کم کر دیا۔ مگر اس تبلیغ کے ہمیں دو فائدے ہوئے۔ اول ہماری جماعت بہت سے ایسے ملکوں میں متعارف ہوگئی جہاں ابھی تک ہمارے مبلغین نہیں پہنچ سکے تھے۔ دوسرے بوزنیا، بلغاریہ، البانیہ اور چیک ریپبلک میں جماعت احمدیہ کے مشن قائم ہوگئے جو جماعتی نظام کے تحت تبلیغ کے کاموں مصروف ہیں۔ **الحمد للہ علیٰ ذالکَ!**

خدا کی گرفت

مذہب کے نام پر ضیاء نے اپنی حکومتی مشینری اور تشدد پسند ملانوں کو کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ بے گناہ احمدیوں کی جان، مال اور عزت سے کھیلیں۔ ہائی کورٹ کے ایک جج نے تو ایک مقدمے کا فیصلہ سناتے ہوئے یہاں تک گنجائش پیدا کر دی کہ اگر کوئی غیر احمدی مسلمان مذہبی جوش میں آ کر کسی احمدی (مسلمان) کا خون کر دے تو اُس کیلئے یہ جائز ہوگا۔ یورپی ممالک میں پہنچ کر جب اُنہوں نے ضیاء کے ظلم کی تشہیر شروع کی تو وہ زخمی سانپ کی طرح اور بھی سیخ پا ہو گیا۔ اب اُس نے پاکستان کے سفارت خانوں کی وساطت سے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ احمدی اسلام دشمن ہیں اسلئے ملک سے بھاگے ہوئے ہیں۔ ورنہ انہیں وہاں پر کوئی خاص مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ لیکن اب ضیاء کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ مکافات عمل کی چکی کا پہیہ گردش میں آ چکا تھا۔ ضیاء اور اُس کے لگے بندھے اب خدا کی گرفت میں آ چکے تھے۔

چنانچہ ۱۹۸۸ء کی ابتدا میں ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے نشان دکھلانے شروع کر دئے۔ ۱۰ اپریل کو پونے دس بجے دن کے قریب راولپنڈی اور اسلام آباد کے جڑواں شہر اچانک دھماکوں سے لرز اُٹھے۔ ہر طرف میزائلوں اور راکٹوں کی بارش ہونے لگی۔ خوف اور افراتفری سے ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ جسموں کے اعضا اور گوشت کے لوتھڑے بجلی کے تاروں سے لٹک رہے تھے۔ لوگ دیوانہ وار پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ آگ اور دھوئیں کے بادل موت کا سایہ بن کر لوگوں کے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ ہر طرف قیامت کا سا سماں تھا۔ مختلف قسم کی قیاس آرائیوں کی بنا پر طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ کئی گھنٹوں بعد پتہ چلا کہ اسلام آباد اور راولپنڈی کے وسط میں فیض آباد کے قریب واقع اوجڑی کیمپ کے اسلحہ ڈپو میں اچانک آگ لگنے سے یہ سانحہ پیش آیا تھا۔ اس المیے کے نتیجے میں سینکڑوں بے گناہ انسان لقمۂ اجل بنے۔ عوام کی طرف سے فوج پر تنقید شروع ہوگئی۔ لوگوں نے طیش میں آ کر ایک فوجی گاڑی کو نظر آتش کر دیا۔ ضیاء کے مقرر کردہ وزیر اعظم اور اُس کے جرنیلوں میں اس معاملے پر ٹھن گئی۔ فرعون خصلت ڈکٹیٹر نے اپنے فوجی بوٹ کی ایک ہی ٹھوکر سے جنیجو صاحب کو اپنے اصلی مقام پر پہنچا کر اُسے اپنی اوقات یاد دلا دی۔ یاد رہے کہ جنیجو صاحب نے بھی وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ہز ماسٹرز وائس کے انداز میں سب سے پہلے قادیانیت کے کینسر کو جڑ سے اُکھیڑ پھینکنے کا عہد کیا تھا۔ وہی جی حضوری جنہوں نے جنیجو صاحب کو بیجا پھوک دے کر ضیاء کے سامنے لا کھڑا کیا تھا اُس کے

منہ پر ملاحیاں سنانے لگے جن کی تاب نہ لاتے ہوئے کچھ ہی عرصہ بعد وہ گمنامی کی موت مر گئے۔ آج اُس کا کوئی نام بھی نہیں لیتا لیکن جماعت احمدیہ کا پودا اُسی طرح پھل پھول رہا ہے۔

مباہلہ

۲۹ مئی کو جنیجو حکومت کی برطرفی کے بعد ضیاؑ کے اقتدار کا سورج ڈھلنے لگا۔ اس کے انجام کا لمحہ اب قریب سے قریب تر آرہا تھا۔ ضیاء الحق کی طرف سے جھوٹ اور کذب کی بنا پر قائم کردہ مقدمات کے نتیجے میں جماعت احمدیہ کے سربراہ حضرت مرزا طاہر احمدؒ وطن عزیز سے ہجرت کر کے پچھلے چار سال سے دیارِ غیر میں پناہ گزین تھے۔ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اب وقت تھا کہ اللہ تعالیٰ جھوٹے اور سچے میں فیصلہ کرے۔ خدا کی طرف سے اِذن پا کر مرزا طاہر احمدؒ نے ضیاء الحق اور اُس کے لاؤ لشکر کو للکارا اور کھلم کھلا چیلنج دیتے ہوئے اعلان کیا مرزا غلام احمدؑ اور اُس کے پیروکاروں کو کافر قرار دینے والو آؤ اس بارے میں خدائے بزرگ و برتر سے فیصلہ طلب کریں۔ اُنہوں نے ۱۰ جون ۱۹۸۸ء کو اپنے خطبہ جمعہ میں اُنہیں مباہلے کی دعوت دی۔ اور کہا کہ آئیں مل کر دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اُسے خدا لعنت کی موت سے دوچار کرے۔ اُنہوں نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں مباہلے کی شرائط مرتب کروا کر اُن پر دستخط کئے اور ضیاء اور اُس کے حمایتی علما کو ارسال کرتے ہوئے پیشکش کی کہ اگر وہ اپنے آپ کو سچا اور مرزا غلام احمدؑ قادیانی اور اُس کے پیروکاروں کو جھوٹا جانتے ہیں تو اِن شرائط کو قبول کر کے تصدیقی دستخط کریں اور پھر خدا کے فیصلے کا انتظار کریں لیکن ضیاء سمیت کسی نے بھی اِس مباہلے کو قبول نہ کیا۔ مرزا طاہر احمدؒ نے یکم جولائی کو ضیاالحق کو ایک دفعہ پھر متنبہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر وہ پاکستان میں احمدیوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنانے سے باز آجائے تو بھی وہ اِس مباہلے کی گرفت سے بچ سکتا ہے۔

اِس چیلنج کے بعد اللہ تعالیٰ نے احمدیت کی سچائی کے حق میں بہت سے کھلے کھلے نشانات دکھائے۔ اس اعلان کے ایک ماہ کے اندر اندر مولوی اسلم قریشی جسے ضیاء نے روپوش کروا کر مرزا طاہر احمدؒ کے خلاف قتل کا کیس درج کر وا رکھا تھا اچانک کہیں سے ٹپک پڑا جسے ۱۰ جولائی کو کوئٹہ سے پولیس نے اپنی حراست میں لے لیا۔ ۱۲ جولائی کو اُسے ایک ڈرامائی انداز میں لاہور میں ٹیلیویژن پر پیش کیا گیا۔ جہاں اُس نے مسٹر نثار احمد چیمہ آئی جی پولیس کی موجودگی میں سارے پاکستانیوں کے سامنے اعتراف کیا کہ اُسے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا۔ مالی مشکلات سے تنگ آ کر وہ اپنی مرضی سے ایران چلا گیا تھا۔ وہاں جا کر وہ ایرانی فوج میں بھرتی ہو گیا اور پانچ سال تک عراق کے

خلاف جنگ میں مصروف رہا۔ مولانا قریشی کے اس انٹرویو کی رپورٹنگ پاکستان کے تمام اہم اخباروں نے کی۔ لندن کے ایک انگریزی اخبار میں چھپنے والی خبر ملاحظہ ہو:

Lahore, July 12: Maulana Muhammad Aslam Qureshi of the Tehrik Khatme Nabuwwat, who was alleged to have been kidnapped and murdered by a minority of Pakistan over five years ago was produced on Tuesday before newsmen at a hurriedly called press conference addressed by Inspector General Police Punjab, Nisar Ahmad Cheema. Maulana Qureshi told newsmen that he served the Iranian Army for about five years and fought at various fronts during this period. He said that he had left his home town Sialkot due to frustration caused by financial and other domestic problems (Daily Muslim, 13th July, 1988)

اس طرح مولوی اسلم قریشی نے بیچ بازار کے ضیاء الحق کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ ندامت کی بجائے فرعون اور بھی چڑ گیا۔ اور جماعت احمدیہ کے افراد پر مزید ظلم ڈھانے لگا۔ ۱۲ اگست ۱۹۸۸ء کے خطبہ جمعہ میں امام جماعت احمدیہ نے اُس کیلئے مباہلہ کی شرائط کو قبول کرنے کی شرط بھی ختم کردی اوراعلان کیا کہ اب ضیا مباہلہ کی شرائط قبول کرے یا نہ کرے اُس کی تقدیر پر مہر لگ چکی ہے۔ اب اُس پر خدا کا غضب نازل ہو کر ہی رہے گا۔

اور وہ جل مرا

امام جماعت احمدیہ کے اعلان کے صرف پانچ دن بعد ضیاء الحق کا مضبوط ترین ہرکولیس طیارہ بظاہر کسی فنی خرابی اور تخریبی کارروائی کے بغیر پرواز کے صرف پانچ منٹ بعد ہوا میں پھٹ کر تباہ ہو گیا۔ اور یوں اس زمانے کا فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت آگ کے سمندر میں ایسا غرق ہوا کہ اُس کی لاش کا نشان تک نہ ملا۔ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو سہ پہر چار بجے کے قریب کولون کے اُس وقت کے مشنری انچارج مولانا عبدالباسط طارق کو اطلاع ملی کہ جنرل ضیاؑ الحق کا طیارہ بہاولپور کے قریب گر کے تباہ ہو گیا ہے۔ مصنف نے بھی خبر پا کر لاہور میں اپنے ایک رشتہ دار کو فون کیا تو اُس نے بھی جنرل ضیاؑ کے طیارے کی تباہی کی تصدیق کر دی۔ بعد کی خبروں سے پتہ چلا کہ عملہ سمیت طیارے میں ۳۱ مسافر تھے جو سب کے سب جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ اِن میں ضیاؑ کے علاوہ پاک فوج کے آٹھ جرنیل، ایک امریکی سینئر فوجی آفیسر اور یہودی النسل امریکی سفیر بھی شامل تھا۔ ملبے

میں سے کسی کی لاش نہ ملی۔ سنا ہے کہ ضیاء الحق کی بتیسی کی شناخت کر کے اُس کے تابوت میں ڈال کر دفن کیا گیا تھا۔ بعض کو اُس پر بھی شک ہے کہ یہ اُس کی تھی یا کسی جانور کی؟؟

خاکسار کو جماعت احمدیہ جرمنی کے مارچ ۱۹۸۸ء کے جلسہ سالانہ کے موقع پر برکات خلافت کے موضوع پر تقریر کرنے کا موقع ملا۔ ساری تقریر کا یہاں پر درج کرنا تو مناسب نہیں البتہ چند ایک فقرے قارئین کی نذر کرتا ہوں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھٹو صاحب نے بھی ترنگ میں آکر بڑ ہانکی تھی کہ ''میں انہیں (یعنی احمدیوں کو) گلیوں میں بھیک مانگنے پر مجبور کر دوں گا۔'' اِس موقع پر بھٹو کے انجام کے حوالے سے ضیاء الحق کو متنبہ کرتے ہوئے میری زبان سے بے اختیار جو جملے نکلے وہ کچھ یوں تھے:

''کہاں ہیں وہ جو ہمارے ہاتھوں میں کشکول پکڑوانے کا دعویٰ کرتے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں کشکول پکڑوانے والوں کے ہاتھوں میں ہمارے خدا نے کشکول تھمایا اور وہ دنیا کی تمام بڑی بڑی طاقتوں سے اُمید لگائے بیٹھا رہا کہ کوئی آئے اور آکر اُس کے کشکول میں اُس کی زندگی کی بھیک ڈالے۔۔۔ لیکن کوئی بھی اُس کی مدد کیلئے نہ آیا! اور وہ حسرت و یاس کے عالم میں خالی ہاتھ تختہ دار پر لٹک گیا!!''

''اے جماعت احمدیہ کو کینسر سے تشبیہ دینے والے! اے معصوموں کے خون سے ہولی کھیلنے والے! اے سچے اور کلمہ گو مسلمانوں کے قبلے سیدھے کرنے والے! اے مجاہدین احمدیت کو اسلام کے نام پر موت کی کوٹھڑیوں میں بند کرنے والے! اے خلافتِ احمدیہ پر ہاتھ ڈالنے والے! کان کھول کے سن! تو بھی انشاء اللہ ناکام و نامراد مرے گا اور جماعت احمدیہ کی خلافت، خدائی تائید اور نصرت سے قائم و دائم رہے گی!''

کچھ عرصہ قبل اِسی سلسلہ میں خاکسار نے چند اشعار کہے تھے جن میں سے ایک پیشِ خدمت ہے:

کلبُ یموتُ علیٰ کلب ہے امر برحق
یہ ذوالفقار ہے مرتضیٰ کی ضیاءؔ کیلئے

ضیاء کے ہرکولیس طیارے کے ہوا میں اچانک پھٹنے کا معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔ کیا یہ محض ایک حادثہ تھا یا تخریب کاری!!! اور اگر تخریب کاری تھی تو کس کی؟ یہ صرف اللہ جانتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اذن الٰہی سے اُس پر واقعی مرتضائی ذوالفقار آسمانی شعلہ بن کر پڑی جس کا سراغ لگانے میں دنیا آج تک ناکام رہی۔ بے نظیر کے مطابق ''اِس دھماکے کے پیچھے خدا کا ہاتھ تھا۔'' روئیداد خان اپنی کتاب ''پاکستان انقلاب کے دہانے پر'' کے صفحہ ۲۰۲ پر اِس حادثہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کیا یہ سانحہ محض حادثہ تھا؟ ہمیں معلوم نہیں۔ کیا اِس حادثہ کے پیچھے کوئی مجرمانہ سازش تھی؟ ہمیں معلوم نہیں۔ کیا یہ حادثہ تخریبی کارروائی کا نتیجہ تھا؟ ہمیں معلوم نہیں اور شاید کبھی معلوم ہو بھی نہ سکے۔''

باب ۲۴

جمہوریت کے گیارہ سال

ضیاء کے بعد پھر جمہوریت آئی۔ بے نظیر بھٹو ملانوں اور ضیاؑ کے ہاتھوں اپنے والد کا انجام دیکھ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ نہ صرف ضیاؑ بلکہ اُس کے باپ کی غیر طبعی موت کے پیچھے بھی خدا کا ہاتھ تھا۔ اسلئے کہ اُس نے بھی اپنی کرسی کی مضبوطی کیلئے مذہب اور سیاست کے نام پر سینکڑوں معصوم انسانوں کا خون اپنے سر لیا تھا۔ چنانچہ اُس نے مذہبی تشدد پسندوں کو کنٹرول کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ لیکن پچھلے گیارہ سال میں اُنہوں نے نفاذ نظام مصطفےٰ ﷺ کے نام پر سادہ لوح عوام میں اپنی جڑیں کافی حد تک مضبوط کر لی تھیں۔ علاوہ ازیں مرکز کے علاوہ صوبوں میں سوائے سندھ کے ابھی تک ضیاؑ حمایتی قابض تھے۔ آبادی کے لحاظ سے ملک کے سب سے بڑے صوبے یعنی پنجاب میں تو عملاً اُس مسلم لیگ کی حکومت تھی جس کا سربراہ ضیاؑ الحق کا پروردہ تھا۔ بطور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف نے عملاً بے نظیر کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ جب کبھی وزیر اعظم پنجاب کا دورہ کرنے آتیں تو ضیاؑ کا پروردہ میاں ائر پورٹ پر اُن کے اِستقبال کیلئے آنا بھی گوارا نہ کرتا۔ اُس نے سب سے پہلے صوبائی خود مختاری کے نام پر پنجاب بینک کا قیام کیا۔ بی بی جب کبھی ملکی اقلیتوں میں سے کسی ٹیکنوکریٹ کو ملک کی خدمت کیلئے کوئی ذمہ داری سونپتی تشدد پسند مذہبی طاقتیں فوراً حرکت میں آجاتیں اور سارے ملک میں توڑ پھوڑ اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اُس کے دورِ حکومت میں بھی ملک میں اقلیتوں پر مظالم کا سلسلہ جاری رہا۔ ضیاء کی باقیات احمدیوں کے سرکردہ لوگوں کو چن چن کر موت کا نشانہ بناتی رہیں۔ ۱۶ جولائی ۱۹۸۹ء کو چک سکندر ضلع گجرات کے پُرامن احمدیوں کے پورے محلے کو نظرِ آتش کر کے تاخت و تاراج کر دیا گیا۔ کوئی

ایک سو کے قریب گھر جل کر راکھ ہو گئے۔ جماعت احمدیہ کے تین افراد جن میں ایک دس سال کی بچی بھی شامل تھی نے جام شہادت نوش کیا۔ بینظیر کی حکومت پنجاب میں بے بس تھی۔ لہذا نواز شریف نے مزمان کو کیفر کردار تک پہنچانے کی بجائے ختم نبوت کے کارکنان کے مطالبے پر اندیشہ نقص امن کے تحت جماعت احمدیہ کے ۱۱۳ افراد کو زیر حراست لے کر جیل بھجوا دیا۔ بچے کھچے افراد جماعت ختم نبوت کے غنڈوں کی مسلسل شرانگیز کارروائیوں کی وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر ربوہ میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

بینظیر کے پہلے دور حکومت کا تجزیہ کیا جائے تو سوائے اقتدار کی رسہ کشی کے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ملک اپنی سابقہ حالت سے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھا۔ آخر کار ۶ اگست ۱۹۹۰ء کو کرسی صدارت پر براجمان سدا بہار بیوروکریٹ نے آئین کی دفعہ ۵۸ کی شق (۲) کے تحت اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے بے نظیر کی چھٹی کرا دی۔ غلام مصطفے جتوئی کی نگران وزارت عظمیٰ کے تحت نومبر میں عام انتخابات ہوئے۔ اسٹیبلشمنٹ کی اشیر باد سے بینظیر کی جگہ نواز شریف جو پیشہ کے لحاظ سے ایک صنعتکار تھا ملک کا وزیر اعظم بن بیٹھا۔

میاں نواز شریف اور غلام اسحٰق خان کا ہنی مون بھی کچھ عرصہ بعد ختم ہو گیا اور صرف ایک سال کے اندر اندر ہی دونوں کے درمیان اِختیارات کے استعمال کی جنگ شروع ہو گئی۔ آئے دن اسمبلی کے باہر اور اندر ''جا بابا جا'' کے نعرے گونجنے لگے۔ جنوری ۱۹۹۳ء کو آرمی چیف جنرل آصف نواز جنجوعہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ بیگم جنجوعہ کو شبہ تھا کہ اُن کے شوہر کے چونکہ میاں نواز شریف سے تعلقات کشیدہ تھے اِسلئے اُنہیں سوچی سمجھی سازش کے تحت راستے سے ہٹایا گیا ہے۔ ایک طرف یہ معاملہ ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں زیر بحث تھا دوسری طرف نئے چیف کے تقرر کے سلسلے میں صدر اور وزیر اعظم میں ٹھن گئی۔ صدر فوج کے سب سے سینئر جرنیل جنرل فرخ کو آرمی چیف بنانا چاہتے تھے مگر وزیر اعظم کو بعض وجوہ کی بنا پر یہ تقرری منظور نہ تھی۔ صدر نے بعض خیر خواہوں کے مشورہ سے مصلحت کا راستہ اِختیار کرتے ہوئے عبد الوحید کاکڑ کو آرمی چیف بنا دیا لیکن میاں صاحب کو یہ بھی منظور نہ تھا وہ تو ہر صورت میں اپنا نامزد کردہ آرمی چیف بنوا کر اپنے آپ کو ایک مضبوط وزیر اعظم ثابت کرنا چاہتے تھے۔ جب یہ نہ ہو سکا تو اُنہوں نے آئین میں آٹھویں ترمیم جس کی رو سے صدر کو آرمی چیف کی تقرری کا صوابدیدی حق حاصل تھا کی تنسیخ کی مہم شروع کروا دی۔ بے نظیر نے صدر اور وزیر اعظم کے اختلافات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دونوں کو آمنے

سامنے لا کھڑا کیا۔ ایک طرف وہ نواز شریف کو یقین دلاتی رہیں کہ آٹھویں ترمیم کے سلسلے میں اُس کی جماعت اسمبلی میں اُس کا ساتھ دے گی دوسری طرف اُس کی پارٹی کے ممبران صدر کو نواز شریف کی حکومت کی برطرفی کی صورت میں اُس کی حمایت کا یقین دلاتے رہے۔

میاں نواز شریف جس نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے اسی غلام اسحٰق کی شہ پر بے نظیر کو وزیر اعظم کے طور پر قبول نہ کرتے ہوئے اُسے روایتی پروٹوکول سے محروم رکھا تھا اُس نے اب وزیر اعظم کی حیثیت سے صدر مملکت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہوئے من مانی کرنی شروع کردی۔ میاں صاحب کو سیاسی اسلوب تو آتے نہ تھے اِسلئے کہ وہ مارشل لاء کی پیداوار تھے۔ اُنہوں نے تو غیر سیاسی اور سماجی مجالس میں بھی اِخلاقیات کی دھجیاں بکھیرنا شروع کردیں اور کھلے عام صدر سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے لگے۔ اول تو وہ ہر اُس سرکاری اور غیر سرکاری تقریب میں جانے سے گریز کرتے جہاں صدر مملکت موجود ہوں اور اگر کبھی ایسا موقع آ بھی جاتا تو وہ صدر مملکت کو سلام تک کرنا بھی گوارا نہ کرتے۔

کہتے ہیں ہاتھیوں کی لڑائی میں بیچاری گھاس یونہی مسلی جاتی ہے۔ یہی حال کچھ پاکستانی عوام کا تھا۔ جہاں ملک کا وزیر اعظم اور صدر باہم دست و گریباں ہوں وہاں ملک نے خاک ترقی کرنی ہے۔ اُنہیں ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ اور سازشوں سے فرصت ملے تو غریب عوام کی فلاح اور بہبود کے بارے میں کچھ سوچیں۔ اپنی جھوٹی انا کی خاطر کوئی بھی اپنے موقف سے سرِ مُو ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ میاں صاحب ڈکٹیشن لینے سے انکاری تھے۔ صدر صاحب میاں صاحب کو من مانی نہیں کرنے دینا چاہتے تھے۔ صدر نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے قومی اسمبلی توڑ دی اور نواز شریف کی حکومت کو برطرف کردیا۔ سپریم کورٹ نے صدر کے اقدام کو غیر ضروری قرار دے کر صدارتی کارروائی کو رد کردیا۔ لیکن پھر وہی کھینچا تانی شروع ہوگئی۔ اب صدر نئے انتخاب کروا کر میاں صاحب کو چلتا کرنا چاہتے تھے لیکن نواز شریف غلام اسحٰق خان کی صدارت کے تحت وقت سے پہلے انتخابات پر اسلئے رضامند نہ تھے کہ اُن کے خیال میں یہ انتخابات غیر جانبدارانہ ہونا ممکن نہ تھے۔ بالآخر دونوں کو اپنے اپنے موقف سے ہٹنا پڑا۔ غلام اسحٰق خان بے نظیر کی اِس یقین دہانی پر کہ وہ اُنہیں نئے سرے سے اپنا صدارتی اُمیدوار نامزد کردیں گی استعفیٰ دینے پر رضامند ہوگئے۔ روئیداد خان اِس سارے ڈرامے کے ڈراپ سین کا آنکھوں دیکھا حال کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''۱۸جولائی ۱۹۹۳ء ہمارے ملک کی پر آشوب سیاسی تاریخ میں ایک اندوہناک اور المناک دن کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ اس دن اقتدار کی شطرنج کا وہ کھیل جس نے پوری قوم کو ہراساں کر رکھا تھا اور قومی مستقبل پر اپنے سیاہ سائے ڈالنے شروع کر دئے تھے، آخر کار انجام کو پہنچا۔ میں نے اِس گھناؤنے ڈرامے کا ڈراپ سین دیکھا۔ ملک تباہی کے کنارے پر تھا۔ اس المناک ڈرامے کے دو بڑے کردار یعنی صدر اور وزیر اعظم جو سال رواں کے آغاز سے ہی بر سر پیکار تھے، رخصت ہونے والے تھے۔ میں اِس روز جب صدر کے دفتر میں داخل ہوا تو مجھے ایسا لگا کہ دو دشمن ملکوں کے سربراہ حد درجہ کشیدہ فضا میں ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ اس سے بدتر یہ کہ اس وقت ان دونوں کے ماتحت جنرل عبدالوحید کاکڑ (آرمی چیف)، لیفٹیننٹ جنرل غلام محمد (کور کمانڈر) اور لیفٹیننٹ جنرل اشرف قاضی (ڈائریکٹر جنرل انٹر سروسز انٹیلی جنس) بھی وہاں موجود تھے۔ صدر پاکستان مسلح افواج کے سپریم کمانڈر تھے، وزیر اعظم سربراہ حکومت تھے۔ دونوں مملکت کے دو اہم ترین دستون تھے اور دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ یہ ایک کریہہ منظر تھا جسے دیکھ کر میں حد درجہ دلبرداشتہ اور آزردہ خاطر ہوا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں جو پہلے ایک دوسرے کے حلیف تھے، جنہیں تقدیر نے ایک ہی راستے پر لا کھڑا کیا تھا کیسے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے؟ یہ کیسے ہوا کہ محمد نواز شریف اپنے ہی دانشمند محسن و رہبر کے جانی دشمن بن گئے۔ کونسی طاقتور قوتوں نے دونوں کو ایک ایسے گڑھے میں دھکیل دیا جہاں فائدہ کسی کا نہ ہوا نقصان دونوں کا بلکہ پورے ملک کا بے حد وحساب ہوا۔(۱۶۳)

بہر حال صدر نے قومی اسمبلی تحلیل کر دی اور خود استعفیٰ دے کر منصب صدارت سینٹ کے چیرمین وسیم سجاد کے حوالے کر دیا۔ نگران حکومت کے تحت اکتوبر میں نئے انتخابات کروائے گئے جس کے نتیجے میں دونوں کی چھٹی ہوگئی۔ پیپلز پارٹی کے فاروق لغاری صدر اور بے نظیر وزیر اعظم بنے۔ میاں صاحب سے پنجاب کی وزارت علیہ بھی جاتی رہی۔ یہ منصب جنجوعہ لیگ کے منظور وٹو جو کبھی پی پی پی میں ہوا کرتے تھے لے گئے۔

''بے نظیر وہ خوش نصیب تھیں جنہیں وزیر اعظم بننے کا موقع دو مرتبہ ملا۔ تاریخ اُنہیں کبھی معاف نہیں کرے گی کہ اُنہوں نے ایسا منفرد عطیہ یوں ضائع کر دیا۔ بے نظیر نے اپنے پہلے تباہ کن وزارت عظمیٰ کے دور سے کوئی سبق نہ سیکھا اور اُن کا دوسرا دور تو پہلے دور سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوا، ہماری تاریخ کا سب سے تباہ کن دور۔ دنیا بھر میں اُن کی خودنما سیر وسیاحت سے اگر اُنہوں نے پاکستان کیلئے کوئی بین الاقوامی کارنامہ سرانجام دیا تو وہ صرف یہ تھا کہ پاکستان کو ایشیا کا سب سے کرپٹ ملک تسلیم کرالیا۔''

اپنی حکومت کے پہلے دور میں بے نظیر کچھ سہمی سہمی اور بے اعتماد دکھائی دیتی تھیں۔ صدر غلام اسحٰق دونوں سے خائف دکھائی دیتی تھیں۔ اسی لئے جب صدر نے اُسے برطرف کیا تو اُس نے کوئی مزاحمت نہ کیا اور خاموشی سے اس فیصلے کو پی گئیں۔ دوسرے دور میں اُس کے سامنے میدان صاف تھا۔ وہ نواز شریف اور غلام اسحٰق خان کو اپنے راستے سے ہٹا کر اور اپنی مرضی کا صدر بنا کر ایک لحاظ سے پاکستان کی مطلق العنان حکمران بن چکی تھیں اور متکبرانہ انداز میں حکومت کرنے لگیں۔ صدر فاروق لغاری کو ڈھال بنا کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ پاکستانی عوام سے اپنے باپ کی ہتک آمیز موت کا بدلہ لینے پر اُتر آئی ہوں۔ بھوکی ننگی عوام نے اُس کی سوشلزم سے اُمیدیں وابستہ کر کے پھر سے اُسے وزارت عظمیٰ کی گدی تک پہنچا دیا تھا تاکہ وہ اُنہیں مکان اور کپڑا نہ سہی دو وقت کی روٹی مہیا کرنے کی سعی کرے لیکن اُس نے تو اُن کے مصائب کو پس پردہ ڈال کر اپنی تجوریاں بھرنی شروع کر دیں۔ سرکاری خزانے کو اپنے خانگی بہی کھاتے میں بدل ڈالا۔ وزارت عظمیٰ کے علاوہ خزانہ کی وزارت کا قلمدان بھی خود سنبھال لیا۔ اپنے شوہر نامدار کو ملک کے صنعتکاروں سے بھتہ وصول کرنے کی غرض سے سرمایہ کاری کا وزیر بنا کر محاسب کے اختیارات بھی موصوف کو تفویض کر دئے۔ اپنی والدہ محترمہ نصرت بھٹو کو اپنی کابینہ میں کسی کام کاج کے بغیر سینئر وزیر بنا دیا۔ اپنے سسر حاکم علی زرداری صاحب کو بھی ممبران اسمبلی کو بلیک میل کرنے والی کمیٹی کا سربراہ بنا دیا۔ بی بی نے لوٹ مار کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اُن کی دیکھا دیکھی جس کے ہاتھ جو لگا وہ اُڑا لے گیا۔ سیاستدانوں کی شہہ پر قبضہ گروپوں نے شرفاءؑ کی جائدادوں پر ناجائز قبضے جما کر اُن سے اونے پونے ہتھیانا شروع کر دیا۔ اِن سب کا سرغنہ بے نظیر کا شوہرِ نامدار تھا۔ اُس نے بڑے بڑے مگر مچھوں کو جیلوں میں ڈال کر یا پھر مروا کر اُن کی غیر ملکی جائدادوں کے پروانے بھی اپنے نام لکھوا لئے۔ سننے میں تو یہاں تک آیا ہے کہ پنجابی فلموں کے ''گنڈاسہ باز'' سلطان راہی جو اپنی بڑ کبازی کی وجہ سے عوام میں بڑا مقبول تھا کو بھی ''آصف رسہ گیر'' کے بندوں نے ٹھکانے لگایا تھا۔ اسی چھینا جھپٹی میں ٢٠ ستمبر ١٩٩٦ء کو بے نظیر کا بھائی میر مرتضیٰ بھٹو جو خود کو اپنے والد کی پی پی پی کا بلا شرکتِ غیرے جانشین تصور کرتا تھا بے نظیر کے زیرِ کنٹرول سندھ پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ عام شبہ یہی تھا کہ اُسے بے نظیر کے شوہر آصف زرداری کے اِشارے اور ایما پر قتل کیا گیا ہے۔ جس کی بنا پر لوگ بے نظیر سے بدظن ہو گئے اور اُنہوں نے اُسے اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین میں بھی شامل نہ ہونے دیا۔

ایشیائی وال سٹریٹ جرنل نے اپنے ۲۳ ستمبر ۱۹۹۶ء کے شمارہ کے اداریہ میں بے نظیر کے طرز حکومت کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''فرعونی رعونت اُسے سیاسی تباہی کی طرف لئے جا رہی ہے۔ اگرچہ یہ اتحاد عارضی ہے لیکن اُسے متحدہ مخالف پارٹیوں کا سامنا ہے۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اُنہیں قرضے دینے میں پس وپیش کر رہے ہیں۔ بیرون ملک پاکستان کو دنیا کے رشوت خور ملکوں کی فہرست میں اول نمبر پر گنا جا رہا ہے۔ بے نظیر کی بجائے اگر کوئی دوسرا سربراہ ہوتا تو وہ اپنے رویّے اور روش کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتا لیکن اصلاح کی بجائے وہ سوائے اپنی ذات کے باقی سب کو پاکستان کے مصائب کیلیے موردالزام گردان رہی ہیں۔ حال ہی میں اُنہوں نے اپنے شوہر کو سرمایہ کاری کا وفاقی وزیر مقرر کیا ہے۔ پاکستان کے عوام نے اُن کے شوہر کو "Mr.Ten Per Cent" کا خطاب دے رکھا ہے۔ عوام اُن کے شوہر کو بدعنوانی اور رشوت کی علامت تصور کرتی ہے...... آج جبکہ بے نظیر اُس بھائی کی موت کا سوگ منا رہی ہے جو اُس سے ناراض تھا، پاکستان کے عوام اپنے آپ سے کروڑویں مرتبہ یہ سوال کر رہے ہیں کہ آخر اُن کے ادھ موئے ملک کو اور کتنی چوٹیں اور کتنے صدمے برداشت کرنے ہوں گے......''

بدقسمتی سے پاکستان میں شرافت گونگی ہے، صاحب بصیرت اصحاب خاموش تماشائی ہیں۔ دانا بینا لوگ ورطہ حیرت میں چپ سادھے بیٹھے ہیں اور فضلہ ابھر کر اعلیٰ عہدوں پر قابض ہے اور ٹھاٹھ سے حکمرانی کر رہا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ''بدی کے غلبہ کیلئے نیک لوگوں کی خاموشی کافی ہے۔'' سیاست کے کاروبار میں اب معاشرہ کا فضلہ آتا ہے۔ اور بے شمار بدقماش افراد، جمہوریت کے نام پر ناگفتہ بہ گناہ کئے جاتے ہیں۔ دن دہاڑے چوری کرنے، ڈاکہ ڈالنے، رہزنی کرنے کے فن کے پیشہ ور ماہر، انہیں احتساب کا کوئی ڈر نہیں۔ کوئی خوف نہیں، انہیں دیکھ کر ہندوستان کے اُنیسویں صدی کے اوائل کے وہ رہزن پیشہ ور ڈکیت، خفیہ قاتل اور ٹھگ یاد آتے ہیں جو گروہ در گروہ پورے ہندوستان میں گھومتے پھرتے تھے۔ جب بھی موقع ملتا وہ بھولے بھالے مسافروں کی گردن میں اچانک رومال ڈال کر اُن کا گلا گھونٹ دیتے، اُن کو لوٹ لیتے اور پھر اُنہیں دفنا دیتے۔ پاکستان میں بھی اِن دنوں کچھ اسی قسم کے حالات تھے۔ آئے دن ڈاکے پڑتے تھے۔ نہ دن کا سفر محفوظ تھا نہ رات کا۔ دن دہاڑے بسوں اور ویگنوں کو روک کر مسافروں کو لوٹا جا رہا تھا۔ پولیس ڈاکوؤں کی سرپرست بن گئی تھی۔ خالی جیب مسافروں کی ڈاکو اسلئے پٹائی کرتے کہ وہ گھر سے پیسے لے کر کیوں نہیں چلے۔ وزیراعظم ہاؤس کو اُن کے خاوند نے اپنے ذاتی سٹڈ فارم میں تبدیل کر رکھا تھا۔ ایک طرف عوام خوراک کی کمی اور آٹے کی قلت اور مہنگائی کی وجہ

ے بھوک اور افلاس کا شکار تھی دوسری طرف وزیر اعظم ہاؤس میں اُن کے شوہر نامدار کے گھوڑے سیب کے مربّے سے صبح کا ناشتہ کرتے تھے۔ یاد رہے کہ ۱۹۶۸ء میں جب بے نظیر کے پاپا نے ایوب خان کے خلاف مہم چلائی تھی تو اُس نے اُن پر صرف اس بنا پر اقربا پروری کا الزام دھرا تھا کہ اُس کے بیٹوں نے ملک میں گندھارا انڈسٹری لگائی تھی۔

بے نظیر کی حکومت کے دور میں بدعنوانی اور چاپلوسی کی لعنتیں ملک میں اس قدر عام ہو گئی تھیں کہ اس سے پہلے کبھی ایسی صورت دیکھی نہ گئی تھی، اسی وجہ سے بے نظیر کی حکومت تاریخ پاکستان کی سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور غیر مقبول بن گئی۔ اس ناپسندیدگی اور غیر مقبولیت کو بعض خارجی عوامل سے بھی تقویت ملی جنھوں نے پاکستان کو ایشیا کا سب سے زیادہ کرپٹ ملک قرار دیدیا تھا۔ اِس کی حکومت سے عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ نے بھی اسی وجہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ جب ملک کا وزیر اعظم اور اُس کا خاوند ہی کھلے عام ملکی خزانے کی لوٹ مار اور رشوت ستانی کا مرتکب ہو تو عام کارندوں نے تو عوام کے تن سے کپڑے اُتارنے ہی تھے۔ چنانچہ وہ بھی دیدہ دلیری سے اِسی کام میں لگ گئے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رشوت خور اور بدعنوان حاکم بزدل اور کمزور ہوتے ہیں۔ ماتحتوں کو بھی اُن کی کمزوریوں کا علم ہوتا ہے اور وہ من مانی کرتے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ نام نہاد محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان جسے محترمہ کے والد نے ہالینڈ سے واپس بلوا کر ایٹمی پروگرام کا انچارج بنایا تھا نے اپنی اِس خان لیبارٹریز نامی سٹیٹ میں بے نظیر کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ اور لیبیا اور ایران کو سینٹری فیوج ٹیکنالوجی کی سپلائی کے سکینڈل کی جڑیں بھی معلوم ہوتا ہے بی بی کی حکومت میں ہی مضبوط ہوئی تھیں۔ اور بی بی کی پیروی میں خان صاحب نے پاکستان کو ایک دو ایٹم بم دے کر خود بھی قارون کی پیروی میں سونے چاندی کے خزانے جمع کرنے کی خاطر ایٹمی ٹیکنالوجی کو گاجر مولی کی طرح سمگلروں کے ذریعے انتہا پسند تخریب کاروں اور دہشت گردوں کے ہاتھوں بیچنا شروع کر دیا۔

بہر حال ایسے حالات میں ہاتھیوں کا ٹاکرہ ہونا لازمی تھا۔ بے نظیر کے شوہرِ نامدار اب ہر سوراخ میں انگلی ڈال کر مال بنا رہے تھے۔ آخر اُنہوں نے انکل لغاری سے بھی پنگا لے لیا۔ اُنہوں نے بہتیرا سمجھایا کہ ''دیکھو بیٹا اپنی کھال میں رہو تم! بھی مزے لوٹو اور ہم کو بھی لوٹنے دو!!'' مگر زرداری کو اُن کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ چچا لغاری نے اپنے ایڈمیرل سروہی سے بات کی تو اُس نے بھی اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن دولت اور اقتدار کے نشے میں زرداری اُن سے بھی اُلجھ پڑا۔

ایڈمرل سروہی نے اپنا فوجی طریقہ استعمال کرتے ہوئے صرف ایک ہی چپت لگا کر اُنہیں اُن کے بوٹوں میں ڈال دیا۔ بے نظیر نے پر پرزے نکالنے شروع کئے تو اُس کے اپنے بنائے ہوئے مٹی کے باوے نے اپنی ۵۸(۲) والی تلوار کے ایک ہی وار سے بے نظیر کی بدعنوان ڈانواں ڈول قسم کی حکومت کا سر کاٹ کے رکھ دیا۔ ۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو بے نظیر دوسری دفعہ بدعنوانی کے الزام میں اقتدار سے برطرف کردی گئیں۔ اِس دفعہ اُنہوں نے صدر کے جاری کردہ برطرفی کے فرمان کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا۔

سپریم کورٹ نے بے نظیر پر عائد کردہ نو الزامات میں سے سات الزامات کی توثیق کردی۔ توثیق شدہ الزامات میں بدعنوانی کا الزام، بغیر مقدمہ چلائے کراچی کے لوگوں کو مارنے کا الزام اور آئین کی مختلف دفعات کی خلاف ورزی کرنے کے الزامات تھے۔ ۲۸ جنوری ۱۹۹۷ء کو سپریم کورٹ نے اُس کی درخواست مسترد کر کے صدارتی فرمان کی توثیق کردی۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کے ایک ہفتہ کے اندر اندر ہی بے نظیر کو ایک اور ذلت آمیز ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ ۳ فروری ۱۹۹۷ء کے عام اِنتخابات میں اُس کی پارٹی کو شکست فاش ہوئی۔ نواز شریف اور اُس کی مسلم لیگ کو ایسی زبردست کامیابی ہوئی جس کی اُسے خود بھی توقع نہ تھی۔ دو تہائی اکثریت کی صورت میں اُسے زبردست عوامی مینڈیٹ حاصل ہو گیا۔ اب وہ آسانی سے اپنی ظالمانہ اکثریت کے بل بوتے پر آئین کے ساتھ من مانی کرسکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ پہلے فاروق لغاری کی جگہ اپنے سابقہ تنخواہ دار قانونی مشیر کو صدارت کی کرسی پر بٹھایا اور پھر آئین کی دفعہ ۵۸(۲) کی ذیلی شق (ب) کو منسوخ کروا کر صدر کے خصوصی اختیارات یعنی قومی اسمبلی کی تحلیل اور مسلح افواج کے سربراہان کی تقرری وغیرہ خود سنبھال کر صدر کو پھر سے کٹھ پتلی بنا دیا۔ بھاری مینڈیٹ کے نشے میں چور نواز شریف نے اپنی دوسری ٹرم کا آغاز ہی احتساب کے نام پر انتقامی سیاست سے کیا۔

''حسب سابق اپنی پارٹی کو ملک کو لوٹنے کی کھلی چھٹی دے کر اپوزیشن پر قومی دولت کے بے دریغ ضیاع اور بیرون ملک ذاتی کھاتوں میں منتقل کرنے کے الزام میں مقدمے چلا کر جیلوں میں بند کردیا گیا۔ یکطرفہ احتساب سے مقدمات کے جائز ہونے کے باوجود حکمرانوں کی کارروائیاں مشکوک ہوگئیں۔ بے نظیر کو عدالت عظمیٰ کی طرف سے پانچ سال کی قید کی سزا سنائی گئی لیکن قبل اس کے کہ اس پر عمل درآمد ہوتا وہ ملک سے باہر جا بیٹھیں۔ مگر مسٹر ten per cent کو عدالت نے بروقت پکڑ کر جیل میں بٹھا دیا۔ بی بی نے ملک سے باہر بیٹھ کر حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کردیا۔ اور ساری دنیا میں یہ دہائی مچانی شروع

[illegible] سے اور اُس کے خاوند کو ظلم اور اِنتقامی سیاست کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اپوزیشن کو زیر کرنے کے بعد میاں صاحب نے ایک ایک کر کے ملکی اداروں کو غیر مؤثر بنانا شروع کر دیا۔ بیورو کریسی پر اپنی پارٹی کے مہران کو مسلط کر کے انتظامیہ کو سیاست کے مطیع کر دیا گیا۔ پولیس اور عدالتوں کو دھونس اور دھاندلی سے وزیر اعظم کی داسی بنا دیا گیا۔ ملکی خزانے کی بے دریغ لوٹ مار شروع ہو گئی۔ مئی ۱۹۹۸ء میں ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی، بے روزگاری اور غربت جیسے مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کیلئے ایٹم بم کا دھماکہ داغ دیا جس کے نتیجے میں امریکہ اور دیگر عالمی مالیاتی اداروں نے پاکستان کی امداد بند کر دی۔ ۲۸ مئی کو راتوں رات اپنے زرمبادلہ کے اثاثے بیرون ملک منتقل کر کے سمندر پار محنت مزدوری کر کے ملکی بنکوں میں زرمبادلہ جمع کرانے والوں کے کھاتوں کو منجمند کر کے انہیں اپنے خون پسینے کی کمائی سے محروم کر دیا گیا اور ملک بچاؤ مہم کی دہائی مچا کر اُن سے مزید زرمبادلہ کا مطالبہ شروع کر دیا گیا۔ ایک طرف ہندوستان سے دشمنی کے عوامی جذبے کو اُبھار کر بم دھماکوں کا دفاع کیا گیا دوسری طرف اُس وقت کے بھارتی وزیر اعظم سے ہاٹ لائین پر براہ راست گپ شپ لگا کر خاندانی مراسم استوار کئے گئے۔ ہندوستان میں ذاتی کارخانے لگانے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔ دوستی بسیں چلیں۔ مینار پاکستان کے سائے میں بھارتی وزیر اعظم کا سواگت کیا گیا۔ برعکس اس کے بھارتی وزیر اعظم کا رویہ دن بدن جارحانہ ہوتا گیا۔ وہ اب کشمیر کو اپنے جسم کا حصہ قرار دیتے ہوئے اُس کے پاکستان کے زیر کنٹرول حصے کو آزاد کرا کے بھارت کے شریر (بدن) کو مکمل کرنے کی باتیں کرنے لگے تھے۔ بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کی اس قسم کی گفتگو کا فوج نے سخت نوٹس لیا۔ قبل ازیں کارگل کے معاملے میں بھارتی حکومت کی بہتر میڈیا مہم اور نواز شریف کی کمزور خارجہ پالیسی نے پاک فوج کی جیتی ہوئی جنگ کو شکست میں بدل دیا تھا۔ امریکی صدر کی ڈانٹ سے گھبرا کر انہوں نے کارگل کے معاملے سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے اسے جنرل پرویز مشرف کی ذاتی مہم جوئی قرار دے کر سارا الزام فوج کے سر تھوپ دیا۔ ظاہر ہے فوج نے اُن کے اِس اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ مزید برآں وزیر اعظم صاحب امریکی صدر کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کیلئے اچانک امریکہ پہنچ گئے اور اُس کی ڈکٹیٹ کردہ درج ذیل شرائط کے حامل اعلان واشنگٹن پر بلاچوں چراں مہر تصدیق ثبت کر آئے۔

☆ پاکستان کارگل سے فوجیں واپس بلائے گا۔

☆ پاکستان اقتصادی مشکلات پر قابو پانے کیلئے فوج میں کمی کرے گا۔

☆ بھارت سے آزادانہ تجارت شروع ہوگی۔

☆ CTBT پر دستخط کئے جائیں گے۔

☆ مسئلہ کشمیر حل کرنے کیلئے ٹریک ٹو ڈپلومیسی اپنائی جائے گی۔

''نواز شریف امریکہ کا دورہ ختم کرنے کے بعد پاکستان پہنچے اور قوم سے خطاب کے دوران انہوں نے

مجاہدین سے اپیل کی کہ وہ کارگل سے واپس آجائیں۔ گویا ایک لحاظ سے یہ اعتراف شکست تھا۔ جنرل پرویز مشرف اپنے مزاج کے برعکس نواز شریف کے فیصلوں کو برداشت کرتے رہے۔'' (۱۶۴)

اعلان واشنگٹن کو عملی جامہ پہنانے کے راستے میں نواز شریف آرمی چیف پرویز مشرف کو سب سے بڑی رکاوٹ خیال کرتے تھے۔ قبل ازیں اگر چہ وہ آرمی چیف جنرل کرامت حسین، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ اور صدر فاروق لغاری کو کھڈے لائین لگانے میں کامیاب ہو چکے تھے لیکن پرویز مشرف پر ہاتھ ڈالنے میں ایک انجانا سا خوف محسوس کرتے تھے۔ اسلئے کہ اپوزیشن اُن کی حکومت کو گرانے کے درپے تھی، کھلی کچہریوں میں مغلیہ خاندان کے شہنشاہوں کے انداز میں انتظامیہ کے ذمہ دار افسران سے ذلت آمیز رویّے کی وجہ سے بیورو کریسی اُن سے نالاں تھی اور اُن کی حکومت کو بدنام کرنے کیلئے موقع کی تلاش میں رہتی تھی۔ عدلیہ کو تو وہ پہلے ہی اپنے خلاف کر چکے تھے۔ اِس لئے یہ ادارہ بھی میاں صاحب سے حساب چکانے کیلئے مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔

گیارہ سال بعد پھر فوج آگئی

مثل مشہور ہے کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف رُخ کرتا ہے۔ چنانچہ اسی قسم کا معاملہ کچھ میاں نواز شریف کے ساتھ ہُوا۔ امریکہ کو خوش کرنے کیلئے اعلان واشنگٹن پر عمل درآمد ضروری تھا۔ واشنگٹن اعلان پر عمل درآمد کیلئے پرویز مشرف کی جگہ اُن کی مرضی کے آرمی چیف کا ہونا لازمی تھا۔ اباجی کی نظر انتخاب اپنے مرید آئی ایس آئی کے ڈی جی لیفٹیننٹ جنرل ضیاالدین عرف مقبول بٹ پر پڑی۔ چنانچہ نہایت ہی عجلت اور بھونڈے انداز میں پرویز مشرف کو بیرون ملک دورہ پر بھیج کر انہیں برطرف کر دیا گیا اور اُن کی جگہ بٹ صاحب کو زبردستی آرمی چیف کی کرسی پر بٹھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جنرل کرامت حسین کی برطرفی اور قبل ازیں جنرل فرخ کی تقرری کے قضیئے کی وجہ سے فوج کی ہائی کمان بھی نواز شریف سے ناخوش تھی۔ اُن کے خیال میں سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر فوج کی قیادت کی اکھاڑ پچھاڑ سے اس ادارے کی یکجہتی متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنے چیف کی اِس انداز میں برطرفی کو فوجی قیادت نے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے جنرل بٹ کو آرمی چیف کے طور پر جی ایچ کیو میں داخل ہونے سے روک دیا۔ وزیراعظم کے حکم پر پولیس اور سول ایوی ایشن نے جنرل مشرف کے جہاز کو پاکستان میں لینڈ کرنے سے روک کر

جنرل بٹ کو زبردستی آرمی چیف کی کرسی پر بٹھانے کی کوشش کی مگر اس بھونڈی حرکت سے نہ صرف یہ کہ اُنہیں اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑے بلکہ اپنی جان کے بھی لالے پڑ گئے۔

بہرحال ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے فوجی انقلاب کے بعد حادثاتی طور پر اور بعض کے نزدیک ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اقتدار جنرل مشرف کے ہاتھ آ گیا اور لوگوں نے حسب سابق اُسے مسیحا جان کر سکھ کا سانس لیا۔ مگر جسے وہ مسیحا سمجھ رہے تھے اُسے تو اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ مالیاتی خسارہ، جی ڈی پی یا ادائیگیوں کا توازن کس چڑیا کا نام ہے۔ ۱۲ اکتوبر کو قوم سے خطاب میں اُنہوں نے تو یہ بھی نہ بتایا کہ ملک میں مارشل لاء لگایا گیا ہے یا نہیں۔ جنرل مشرف کے جہاز کے اغوا کے کیس میں اُن کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ اِس کے علاوہ بدعنوانی اور کرپشن کے الزامات میں بھی مجرم پایا گیا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ سیاست کے میدان میں تخت یا تختہ۔ اِس میدان میں اقتدار کے ساتھ ساتھ جیل بھی جانا پڑتا ہے۔ مہاتما گاندھی، نیلسن منڈیلا، شیخ مجیب الرحمٰن، زیڈ اے بھٹو جیسے عظیم سیاست دانوں نے سالوں سال جیلوں کی عصوبتیں جھیل کر یہ مقام پایا تھا۔ اور نواز شریف کے قائم مقام جاوید ہاشمی بھی ایک سال قبل چار سال کی جیل کاٹ کر رہا ہوئے ہیں۔ سنا ہے کہ قبل ازیں وہ کوئی بیس دفعہ جیل یاترا کر چکے ہیں لیکن جیل سے باہر آ کر پھر بھڑکیں مار رہے ہیں۔ لیکن میاں صاحب تو صرف ایک سال ہی جیل کی کوٹھڑی کا مزہ چکھ کر بلبلا اُٹھے۔ ابا جی سے اپنے لاڈلے کی چیخ و پکار برداشت نہ ہو سکی۔ سعودی حکومت سے پرانے تعلقات کی بنا پر مداخلت کی استدعا کی گئی۔ چنانچہ اُن کی ضمانت پر دسمبر ۲۰۰۰ء میں سارے شریف خاندان کو اس شرط پر جدہ میں ملک بدری کی زندگی گزارنے کی اجازت ملی کہ دس سال تک ملکی سیاست میں نہ تو حصہ لیں گے اور نہ ہی دخل دیں گے۔ سات سال تک بیرون ملک آرام و آسائش کی زندگی گزار کر ملکی سیاست کی بدلتی ہوئی فضا کا رخ دیکھ کر میاں برادران کے دل میں بھی وطن کی محبت نے جوش مارا ہے۔ اب وہ دس سال کی جیل کے بدلے ملک بدری کے معاہدے سے منحرف ہیں۔ بڑے میاں اپنے دستخطوں سے انکاری ہیں جبکہ چھوٹے میاں کا کہنا ہے کہ دستخط بندوق کی نوک پر کروائے گئے تھے۔ ۲۳ اگست ۲۰۰۷ء کو اگرچہ سپریم کورٹ نے اُنہیں ملک میں واپس آ کر سیاست میں حصہ لینے کی اجازت دے دی ہے مگر اُسی دن کے صبح کے جنگ اخبار میں میاں برادران کی وطن واپسی کی درخواست پر ایک سیاستدان نے کیا خوب تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"یہ فیصلہ تو عدالت عظمیٰ کرے گی کہ نواز شریف کو فوری طور پر وطن واپسی کا حق ہے۔ یا حکومتی موقف کے

مطابق اُنہیں جلاوطنی کے دس سال مکمل کرنے ہوں گے۔ تاہم عدالت میں جو دستاویز پیش کی گئی ہے اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُنہوں نے پاکستان میں قید و بند کی صعوبتوں پر بیرون ملک آسائشوں کو ترجیح دی۔ اور اس طرح وہ پاکستان کے بڑے رہنماؤں کی فہرست میں نام شامل کرانے سے قاصر رہے۔''

۱۹۹۷ء کے انتخابات جیتنے کیلئے اس 'عظیم لیڈر' نے عوام کو جو سبز باغ دکھائے تھے اُن پر تبصرہ کرتے ہوئے روئیداد خان رقمطراز ہیں:

'' ۱۷ فروری ۱۹۹۷ء کو نواز شریف نے وزیراعظم کے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ اِدھر اُنہوں نے حلف اُٹھایا اُدھر لوگوں نے اُن سے معجزات کی مبالغہ آمیز غیر حقیقت پسندانہ اُمیدیں وابستہ کر لیں۔ جس قسم کے سبز باغ لوگوں کو عام انتخابات کے دوران دکھائے گئے تھے، ان کے پیش نظر لوگوں کا جنت ارضی کے خواب دیکھنا کچھ عجب بھی نہ تھا۔ لوگ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ نواز شریف اپنے وعدے پورے کریں گے بلکہ اُن کی ساری اُمیدیں نواز شریف کی ذات پر مرکوز ہوگئی ہیں اور اس طرح وہ اپنے ہی کیئے ہوئے وعدوں کے بیچ گھِر کر یرغمال بن گئے ہیں۔ اب خدانخواستہ وہ مہیب مسائل جن سے ملک دوچار ہے، حل نہیں ہوتے یا ان سے بہتری یا اصلاح کی نمایاں صورت پیدا نہیں ہوتی یا وہ سیاہ بادل جو پاکستان کی سیاسی و معاشی فضا میں منڈلا رہے ہیں، نہیں چھٹتے تو نواز شریف کا اللہ ہی حافظ ہے۔... مستقبل میں تو جو ہو سو ہو آئندہ حالات چاہے جو رُخ اختیار کریں، موجودہ صورت حال تو یہ ہے کہ پاکستان یاس کی تاریکی میں ڈوبا، اُمید کی قندیل روشن کرنے والے کسی ایسے ہادی کا منتظر ہے جو اپنے دل میں روشن حب الوطنی کی شمع سے پورا ملک منور کردے۔ جو مایوسوں کو مایوسی سے نکالے، جو ہماری قومی امنگوں، آرزوؤں کی تکمیل کا ضامن ہو، جو ملک کو صاف ستھری سیاست کا ایجنڈا پیش کرے، جو ہمیں اکیسویں صدی میں نئے جوش و جذبے، نئی اُمید و امنگ کے ساتھ لے جانے کا سچا وعدہ کرے، جو ملک میں چار سو پھیلی ہوئی منافرتوں اور فاصلوں کو محبتوں اور قربتوں میں بدل دے، جس کا دل نیک ہو اور نیک رہے، جس کے ہاتھ صاف ہوں اور صاف رہیں، جو قانون کی بالادستی پر صدقِ دل سے ایمان رکھے اور اُسے قائم کرے، جو شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کر سکے، جو ملک کو بدعنوان سیاستدانوں اور بددیانت سول اور عسکری افسروں سے پاک کردے، جو پاکستان کے سچے خواب کو حقیقت نہ بننے دینے والوں کو قرار واقعی سزائیں دلوائے، جو ملک میں شرافت اور شائستگی کو دوبارہ زندہ و رائج کرے، جو لوگوں کو ایسی زندہ تمنا دے جو قلب کو تڑپا دے، روح کو گرما دے، جو لوگوں کا اعتماد اپنے آپ میں، اپنے لیڈروں میں، اور سب سے بڑھ کر اپنے وطن میں بحال کردے۔'' (۱۶۵)

نواز شریف اور بی بی کی حکومتوں نے یکے بعد دیگرے ملکی خزانے کی پائی پائی پر ہاتھ صاف کیا۔ اپنی اپنی پارٹی کے سرکردہ لیڈروں کو جن میں اکثریت سرمایہ داروں اور فیوڈل لارڈوں کی

تھی، ان کی حیثیت سے زیادہ صنعتی اور زرعی قرضوں سے نواز رکھا تھا۔ اور پھر دسیوں سالوں کے بازہندگان سے وصولی کو پس پشت ڈال کر انہیں قرضوں پر قرضے عنایت ہوتے رہے تھے۔ نسب خدا کا یہ اپنے زرعی فارموں میں اربوں روپوں کی بجلی استعمال کرتے اور سالوں سال تک خرچ شدہ بجلی کے بل ادا نہ کرتے اور وزیر اعظم صاحب انہیں خوش کرنے کیلئے یہ تمام قرضے بیک جنبش قلم معاف فرما دیتے۔ گویا بھوکی ننگی عوام کے خون پسینہ سے پائی پائی جمع کرکے حاصل کردہ دولت وڈیروں اور سرمایہ کاروں کے زرعی فارموں، کارخانوں اور عشرتکدوں کی رونقیں دوبالا کرنے کے کام آتی رہی اور بھوکی ننگی عوام اپنے بچوں کو دو وقت کی روٹی مہیا نہ کر سکنے کی وجہ سے خودکشیاں کرتی رہی۔ اغوا برائے تاوان کی وارداتیں آئے دن ہونے لگیں۔ ملکی خزانہ خالی ہوتا گیا سرمایہ دار کی تجوریاں بھرتی گئیں۔ رشوت ستانی اور بدعنوانی دن بدن زور پکڑتی گئی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ہمارے ''شریف'' خاندان نے ملک سے لوٹی ہوئی دولت دشمن ملک بھارت میں سرمایہ کاری کی صورت میں منتقل کرنا شروع کر دی۔ اِن حالات میں ملک غیر ملکی قرضوں تلے دن بدن دبتا گیا۔ درآمدات اور برآمدات کا تناسب درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ زرمبادلہ کی حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان قرضوں کا سود تک ادا کرنا ملک کے لئے مشکل ہو گیا۔ اور ایوب خان کے مارشل لاء سے قبل کی طرح پاکستان ایک دفعہ پھر دیوالیہ پن کے دہانے پر آ کھڑا ہوا۔

قصہ مختصر جمہوریت کے اِن گیارہ سالوں کے آخر پر ملک یاس اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ عوام مایوسی کا شکار تھے۔ ملک میں صاف ستھری سیاست اور قانون کی بالادستی کا فقدان تھا۔ چارسو منافرتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ملک کے شہریوں کے جان و مال غیر محفوظ تھے۔ ملک پر بدعنوان سیاستدانوں اور بددیانت بیوروکریٹس کا قبضہ تھا۔ شرافت اور شائستگی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ لوگوں کا اعتماد نہ صرف اپنے لیڈروں بلکہ ملک پر سے بھی اُٹھ چکا تھا۔ روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجا رہا تھا۔ نواز شریف مجرم کیوں کے مصنف کے مطابق:

''وہ نسل جس نے پاکستان بنانے کیلئے قربانیاں دی تھیں آج تقریباً تقریباً مٹی کا حصہ بن چکی ہے اور جو موجود ہیں وہ بے بسی سے ملک کو تباہی کے دہانے کی طرف جاتا دیکھ رہے ہیں۔ کبھی ایسا بھی دور تھا کہ لوگ رشوت لیتے تھے لیکن چوری چھپے اور کیا مجال کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ کی خبر بھی ہو اور رشوت دینے اور لینے والے کو کئی طرح کے منصوبے بنانے پڑتے تھے۔ لیکن آج رشوت کو ایک سچائی کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ آج جھوٹ بولنا معمول بن کر رہ گیا ہے۔ آج کم تولنا بزنس کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ آج ملاوٹ کرنا معیوب نہیں رہا اور انسدادِ رشوت ستانی کے اِدارے بدعنوانوں کو تحفظ فراہم کرنے کے اڈے بن

چکے ہیں۔ آج پکڑ دھکڑ اُس کی ہو رہی ہے جو متعلقہ ادارے کو اُس کا حصہ نہیں پہنچاتا۔ نیچے سے اوپر تک اب حصہ جاتا ہے۔ نیچے والا یہ سوچ کر بے فکر رہتا ہے کہ اگر کوئی اُس کی شکایت بھی کردے گا تو اُس سے حصہ لینے والے اُسے بچا لیں گے۔ اور کوئی غلطی سے ایمانداری کا پرچم تھام کر نکل آئے تو وہ پاگل کہلاتا ہے۔ اُسے ہر آنے والے دن میں انتقامی کارروائی کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور اُسے اتنا مارا جاتا ہے کہ یا تو وہ نوکری چھوڑ جاتا ہے یا پھر سسٹم کا حصہ بن جاتا ہے۔(۱۶۶)

آج پاکستان کی تیسری نسل جوان ہو کر میدان کارزار میں سرگرم عمل ہے۔ پہلی دو نسلوں کی تمام تر گارگزاریوں کے باوجود اگر ہم پاکستانی عوام کی زندگی کے موجودہ معیار کا موازنہ پہلی دو نسلوں کے معیار زندگی سے کریں تو ہمیں ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ بظاہر ملک نے ہر سمت میں ترقی کی ہے۔ شہروں میں بوسیدہ عمارتوں کی جگہ عالیشان بنگلوں اور لاجز نے لے لی ہے۔ بازار یورپ کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ایسے ایسے ملٹی سٹور قائم ہیں جہاں ضروریات زندگی کی ہر شئے دستیاب ہے۔ ٹوٹی پھوٹی سنگل روڈز کی جگہ دورویہ شاہراہوں نے لے لی ہے۔ دقیانوسی قسم کے ریڈیو ٹرانسمٹروں کی جگہ دیوقامت کیبل سسٹم نظر آتے ہیں جن کے ذریعے دنیا بھر کی لمحہ لمحہ کی خبریں اور ثقافتی سرگرمیاں ہر کس و ناکس تک پہنچ رہی ہیں۔ شیر شاہ کے زمانے کی جرنیلی سڑک کی جگہ جدید ترین جی ٹی روڈ کے علاوہ موٹروے پر اب ایرکنڈیشنڈ بسیں اور موٹریں ہوا سے باتیں کرتی ہیں۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی کھٹارہ نما بسوں کی بجائے لوگ اب ہینو اور ڈیوو میں سفر کرتے ہیں۔ گدھا ریڑھیوں والے سیل ٹیلیفون لئے پھرتے ہیں۔ دال ساگ کھانے والے اب ولیج اور فوڈ سٹریٹ میں مزے اُڑاتے ہیں۔ جن کے لئے بائی سائیکل اور ٹانگے کی سواری ایک عیاشی تھی وہ اب پیجارو سے نیچے بات نہیں کرتے۔

ملک بھر میں سڑکوں کا جال بچھ چکا ہے جس کی بدولت دیہات اور شہروں میں اب بہت کم فرق نظر آتا ہے۔ وہ دیہات جہاں لوگ دیئے کیلئے تیل کو ترستے تھے وہاں بجلی اور ٹیلیفون لائنوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ جگہ جگہ پبلک کال آفس لوگوں کا استقبال کرنے کیلئے موجود ہیں جہاں سے آپ اپنے امریکہ، یورپ، سعودیہ، دُبئی غرضیکہ دنیا کے کونے کونے میں بسنے والے عزیزوں سے جتنی لمبی چاہے بات کرسکتے ہیں۔ جہاں دو وقت کا کھانا پکانے کیلئے اُپلے سلگاتے سلگاتے دیہاتی عورتوں کی آنکھیں سوج جاتی تھیں وہاں اب اُن کی بہوئیں اور بیٹیاں ایک بٹن دبا کر گیس کے چولہوں پر صاف ستھرے باورچی خانوں میں طرح طرح کے کھانے تیار کرکے چند گھنٹوں کے اندر ہی دسترخوان سجا دیتی ہیں۔ وہ زمانے لد گئے جب چند میلوں پر واقع شہر سے بھیجا ہوا تار کئی کئی

ہلوں کے بعد دیہاتوں میں پہنچتا تھا۔ اب تو گاؤں گاؤں میں رنگین ٹیلیویژن پر سیٹلائٹ کے ذریعے نشر کردہ ہندوستانی فلمیں، سی این این اور بی بی سی کے علاوہ دنیا بھر کی خبریں دیکھی اور سنی جاسکتی ہیں۔ غرضیکہ وہ تمام سہولیات جو شہروں میں موجود ہیں کم وبیش دیہات میں بھی میسر ہیں۔ اس کے باوجود ہر روز بھوک سے تنگ لوگوں کی خودکشیوں کی خبریں ملتی ہیں۔ آخر کیوں؟ اِسلئے کہ لوگوں کی ضروریات زندگی بڑھ گئی ہیں۔ غضب خدا کا ایک عورت نے دو بچیوں سمیت ریل گاڑی کے آگے لیٹ کر محض اِس لئے اجتماعی خودکشی کرلی کہ اُس کے پاس اِن بچیوں کو آئیس کریم کھلانے کیلئے پیسے نہ تھے۔ اپنے میاں کی محنت مزدوری کی حلال کمائی سے اُس کا گزر بسر مشکل تھا۔ کہاں گئی وہ قناعت جو ہمارے رسول ﷺ اور بزرگوں میں تھی؟ یہ سب دین سے دوری کا نتیجہ ہے۔

آج شیعہ سنی کا اور سنی شیعہ کا گلہ کاٹ رہا ہے۔ آج مہاجر غیر مہاجر کے اور غیر مہاجر مہاجر کے خون کا پیاسا ہے۔ آج ملک میں بسنے والی غیر مسلم اقلیتوں کی دل آزاری کو دین اسلام کی خدمت سمجھا جاتا ہے۔ ملک سے اُن کی محبت اور وفاداری کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اُن پر بلا کسی ثبوت کے غیر ملکی جاسوسی کے بے بنیاد الزامات لگائے جاتے ہیں۔ قومی یکجہتی کا فقدان ہے۔ آج ملک میں پاکستانی کی بجائے سندھی، بلوچی، پنجابی اور پٹھان جیسی علاقائی قومیتوں کے طور پر شناخت کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ آج ہر پاکستانی ملک سے فرار ہونے کی کوشش میں ہے۔ نفسا نفسی کی اِنتہا ہے۔ کیا اِن حالات میں کوئی بھی ملک ترقی کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں!!! ایسے حالات سے مملکت خداداد پاکستان کو دوچار کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟ غور کیجئے اور اور خوب غور کیجئے!!......

اِن حالات میں قوم کسی ہادی یا مسیحا کا اِنتظار نہ کرے تو کیا کرے؟؟

باب ۲۵

مشرف کا دورِ حکومت

جنرل پرویز مشرف کے دور کے دو مراحل ہیں۔۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے اکتوبر ۲۰۰۲ء تک کا عرصہ خالصۃً فوجی حکومت کا دور تھا۔ یہ تین سال کا عرصہ اُنہوں نے نواز شریف اور اُن کے پیشرو ملکی رہنماؤں کی لگائی ہوئی گانٹھیں دانتوں سے کھولنے میں گزارا۔ اُن کے مطابق ۱۹۹۰ء کی دہائی میں کمزور اقتصادی ڈسپلن، کرپشن کی بڑھتی ہوئی شرح، پیلی ٹیکسی سکیم، موٹر وے، سینڈوک پراجیکٹ اور بھاری لاگت سے تعمیر کردہ ہوائی اڈوں جیسے اقتصادی شعبہ میں کئے گئے یکطرفہ اور ناعاقبت اندیشانہ اقدامات نے ملک کو غیر ملکی قرضوں کے بھاری بوجھ تلے دبا رکھا تھا۔ حکومت کے زیرِ انتظام چلنے والے بینکوں، مالیاتی اداروں، سٹیل مل، پی آئی اے اور کے ایس ای جیسی سرکاری شعبہ کی کارپوریشنوں نے بھی ملکی خسارے میں کئی گنا اضافہ کر رکھا تھا۔ محاصل کی وصولی میں ناکامی، حکومتی اور انتظامی اخراجات میں روز افزوں اضافہ، برآمدات میں جمود، باہر سے آنے والے سرمایہ میں زبردست کمی سے اقتصادی عدم توازن سنگین صورت اختیار کر چکا تھا۔ ملک کی اقتصادی ترقی جمود کا شکار تھی۔ معاشی حالت بری طرح متاثر تھی۔ سرمایہ کاری کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ غیر ملکی زرِ مبادلہ کے ذخائر برائے نام رہ گئے۔ غیر ملکی قرضوں کی عدم ادائیگی کی وجہ سے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے نواز شریف کی برطرفی کے وقت ملکی عدالتوں سے سزا یافتہ ہونے کی وجہ سے بے نظیر فرار ہو کر بیرون ملک جا بیٹھی تھیں۔ جنرل مشرف کے اقتدار سنبھالنے کے بعد انہوں نے واپس وطن آ کر اُن سے تعاون کی پیشکش کی۔ ظاہر ہے اِسکے بدلے

میں اپنے خلاف تمام مقدموں کی واپسی اور آصف علی زرداری کی رہائی اُن کی اولین شرائط تھیں۔ جنرل پرویز نے بے نظیر کی پیشکش کو نظر انداز کرتے ہوئے بیان دیا کہ ملک کی خاطر اگر کسی نے تعاون کرنا ہے تو واپس آ کر مقدمات کا سامنا کریں اور ملک سے لوٹا ہوا سرمایہ واپس کریں۔ مثبت جواب نہ ملنے پر بے نظیر نے فوجی حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی۔ عوام کی بھاری اکثریت نے نواز شریف کی حکومت کی برطرفی پر ایک طرح سے سکھ کا سانس لیا۔ حکومتی پارٹی کے وہ کل پرزے جنہوں نے ملک میں لوٹ مچا رکھی تھی اپنے کیئے کے نتائج سے پریشان چھپتے پھرتے تھے۔ دیگر ساری کی ساری سیاسی پارٹیوں نے فوجی حکومت کو خوش دلی سے قبول کیا۔ پرویز مشرف نے جب ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو اُس کی مثال ڈوبتے جہاز کی سی تھی۔ اُن کے مطابق:

''پاکستان آج اپنی قسمت کے چوراہے پر کھڑا ہے۔ ہم نے اُمید کے ایک دیئے سے آغاز کیا تھا اور آج وہ دیا موجود نہیں۔ ہم اس سطح پر پہنچ چکے ہیں کہ ہماری معیشت جکڑی ہوئی ہے، ہمارا اعتماد کھو چکا ہے، ریاستی ادارے تباہ ہو چکے ہیں، صوبائی اِمتیاز نے وفاق کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ہم نے قوموں کی برابری میں اپنے وقار، اعزاز اور عزت کو کھو دیا ہے۔'' (۱۶۷)

فوجی حکومت کا قیام

عالمی حالات کے تناظر میں دو دن کی سوچ بچار اور قانونی مشیروں کے مشورے کے بعد ۱۴ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو مارشل کی بجائے ملک میں پہلے سے نافذ ایمرجنسی کے تحت عبوری آئینی حکنامے کے ذریعے آئین کو التوا میں ڈال کر قومی وصوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ کو معطل کر دیا گیا۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں ختم کر دی گئیں۔ جنرل پرویز مشرف نے صدر محمد رفیق تارڑ کی موجودگی میں خود بطور چیف ایگزیکٹو حکومتی انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حکومتی امور کی نگرانی کیلئے اعلیٰ ترین حکومتی ادارے کے طور پر فوجی اور سویلین نمائندوں پر مشتمل سات رکنی قومی سلامتی کونسل قائم کر دی گئی۔ اِس کے علاوہ دس رکنی کابینہ کا بھی اعلان کیا گیا۔ مالیاتی امور کے ماہر شوکت عزیز کو خاص طور پر امریکہ سے بلا کر وزارت خزانہ اُن کے حوالے کی گئی۔ کابینہ کے ممبران کا انتخاب فوج کی ایک ایسی پالیسی ساز ٹیم کے مشورہ سے کیا گیا تھا جس کے ممبران اِنٹیلی جینس کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ چنانچہ وفاقی کابینہ کے سب ٹیکنو کریٹس اپنے اپنے فیلڈ میں یکتا تھے۔ اپنے آئندہ کے لائحۂ عمل سے آگاہ کرنے کیلئے اُنہوں نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو قوم سے دوسری دفعہ خطاب کیا۔ جس

کے اہم نقاط یہ تھے یوں ہیں ۔:

''وطن عزیز آج دوراہے پر کھڑا ہے۔ایک راستہ تباہی کی طرف جا رہا ہے اور دوسرا تعمیر اور ترقی کی طرف۔ اور فیصلہ ہم نے کرنا ہے کہ کونسا راستہ اختیار کرنا ہے۔ملک میں انتشار، مایوسی، کرپشن اور نفرت روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔ یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ایسے عناصر کی سرپرستی کی گئی جو ملک سے بیزاری، اداروں کی توڑ پھوڑ اور علاقائی تعصب کو مزید پروان چڑھانے میں پیش پیش تھے۔ملکی معیشت تباہی کے کنارے پہنچ چکی ہے۔ہم اپنا اعتبار کھو چکے ہیں، قومی ادارے تباہ ہو گئے ہیں اور بڑھتے ہوئے علاقائی تعصب سے وفاق کے وجود کو نقصان پہنچا ہے اور بھائیوں کی طرح ایک ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں۔ایسے حالات میں بھی ہمیں نااُمید نہیں ہونا چاہیئے۔میں ایک پُراُمید انسان ہوں۔ روشن اور تابناک مستقبل ہمارا منتظر ہے۔ میں اِس مفروضے کی تائید نہیں کرسکتا کہ پاکستان ایک غریب ملک ہے۔میں نے انتہائی غیر معمولی حالات میں موجودہ ذمہ داری سنبھالی ہے۔............

وعدے

''یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک نے گزشتہ برسوں میں صرف نام کی جمہوریت دیکھی ہے جو جمہوری اقدار سے خالی تھی اور عوام استحصال کا شکار رہے۔ میں عوام کو دوبارہ جعلی اور پُرفریب جمہوری تماشے کے سپرد نہیں ہونے دونگا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ انشاءُ اللہ ایک ایسا حقیقی جمہوری نظام قائم کروں گا جس میں عوام کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو جمہوریت کی روح ہیں۔ ...... آئین ملک کا حصہ ہے، اِس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک کی خاطر آئین کو عارضی طور پر التوا میں رکھ کر ملک کو بچایا جائے۔ یہ مارشل نہیں ہے بلکہ جمہوریت کی طرف ایک نیا قدم ہے۔ مسلح افواج کو اقتدار میں رہنے کی کوئی خواہش نہیں۔ہم کم سے کم مدت میں ایک حقیقی جمہوری نظام کو پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے صلاح مشورے اور غور و فکر کے بعد مستقبل کیلئے ایک لائحہ عمل تشکیل دیا ہے جس سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے مقاصد اور اہداف میں (۱) قومی اعتماد اور مورال کی ازسرِنو بحالی (۲) فیڈریشن کی مضبوطی اور صوبوں کے مابین رابطوں کی مضبوطی (۳) قومی یکجہتی اور معیشت کی بحالی (۴) امن عامہ اور فوری انصاف کے قیام کیلئے قانون کی حاکمیت (۵) قومی اداروں کو سیاست سے پاک کرنا (۶) عوام کی شرکت کیلئے اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی (۷) اور فوری اور غیر جانبدار احتساب شامل ہے۔بہتر حکومتی نظام اِن اعلیٰ مقاصد کے حصول کیلئے بنیادی شرط ہے۔ اب تک عوام محکوم رہے ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ حکومت عوام کی خدمت کرے۔اِس مقصد کیلئے قومی سلامتی کونسل فوری طور پر قائم کی جا رہی ہے۔---معیشت کی بحالی اشد ضروری بلکہ ایک حد تک ہماری بقا کا مسئلہ ہے۔

سرمایہ کاروں اور عوام کے اعتماد کو دھوکا دیا گیا اور اُنہیں رسوا کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی گئی۔ اُن کے اکاؤنٹ تک منجمد کر دیے گئے۔ ہمیں اُن کا اعتماد بحال کرنا ہے۔ معیشت کی بحالی کیلئے بنیادی اقدامات کرنے ہوں گے۔ اس کے علاوہ لوٹی ہوئی دولت کی واپسی بھی اہم ترین ضرورت ہے جسے سخت ترین اقدامات کے ذریعے پورا کیا جائے گا۔ احتساب کی عدم موجودگی کے باعث وطن عزیز میں لوٹ مار اور ناجائز دولت کو فروغ حاصل ہوا، جس نے معاشرے کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ احتساب کا عمل ذاتی اور سیاسی خواہشات کو پورا کرنے کیلئے اس انداز میں استعمال کیا گیا کہ اس لفظ کے معنی ہی بدل گئے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ احتساب کا سارا عمل شفاف ہو تاکہ اس پر عوام کا اعتماد بحال ہو۔ بالخصوص ایسے افراد کی نشاندہی کی جائیگی جو قومی دولت لوٹنے اور ٹیکس چوری میں ملوث ہیں۔ ان کے علاوہ قرض دہندگان سمیت ایسے افراد جنہوں نے قرض معاف کرا لئے یا اُن کی واپسی مؤخر کرائی ہے یہ بھی قانون سے بچ نہیں سکیں گے۔ میڈیا کیلئے میرے دل میں بے حد عزت ہے۔ میں آزادی صحافت کا بھرپور حامی ہوں۔ مجھے اعتماد ہے کہ یہ مثبت اور تعمیری کردار ادا کرے گا۔ پرائیویٹ چینلز کو مزید سہولیات زیر غور ہیں۔ میں علمائے کرام سے اُمید کرتا ہوں کہ وہ اسلام کی سچی روح عوام تک پہنچائیں گے۔ اور اُن عناصر کی حوصلہ شکنی کریں گے جو ذاتی مفاد کی خاطر مذہبی منافرت پھیلا کر ہمارے دین کو بدنام کرتے ہیں۔''

انہوں نے اِس بات پر زور دے کر کہا کہ وہ کشمیریوں کے حق خود ارادیت کیلئے موجودہ جدو جہد کی بھرپور اخلاقی، سیاسی اور سفارتی مدد جاری رکھیں گے۔ پاکستان بھارت کے ساتھ برابری کی بنیاد پر غیر مشروط مذاکرات کا خواہشمند ہے۔ جنرل پرویز نے قومی سلامتی کونسل تشکیل دے کر فوج کو باقاعدہ طور پر اقتدار میں حصہ دار بنا دیا۔ وہ خود بلحاظ عہدہ اِس کے سربراہ تھے۔ کور کمانڈروں اور پرنسپل سٹاف آفیسرز کی مجلس کو قومی مشاورتی ادارے کی حیثیت دے کر قومی اہمیت کا ہر فیصلہ اُس کے مشورہ سے کیا جانے لگا۔ ملکی اور حکومتی اداروں کو جو اُنہوں نے سب سے پہلا حکمنامہ جاری کیا اُس میں اِس امر پر بالخصوص زور دیا گیا کہ اُنہوں نے اقربا پروری اور سفارشی کلچر کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اُنہوں نے ہدایت کی اِس معاملے میں اُن کے قریبی عزیزوں اور دوستوں سے بھی کسی قسم کوئی رعایت نہ برتی جائے۔ ایک سینئر صحافی کو اُنہوں نے بتایا کہ جب وہ ذاتی طور پر غور کیلئے کوئی کیس بھیجتے ہیں تو اُن کی ہدایت ہے کہ میرٹ کا سختی سے لحاظ رکھا جائے۔ اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنی ذات کے بارے میں اُنہوں نے جو سب سے پہلا کام کیا وہ اپنے اثاثوں کا اعلان تھا۔ آج تک کسی بھی سابقہ حکمران نے اقتدار سنبھالتے وقت اِس قسم کا اعلان نہیں کیا تھا۔ خود کو احتساب کیلئے پیش کرنے کی یہ ایک عمدہ مثال تھی۔ اِس کا واحد مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے

آپ کو ''جنرل کلین'' کے طور پر ثابت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کوئلوں کی دلالی میں منہ تو کالا ہو ہی جاتا ہے۔ یار لوگوں نے اُن کے ان اثاثوں کو بھی ہدف تنقید بنا کر سادہ لوح عوام کو اُن کے خلاف ورغلانہ شروع کر دیا۔ حال ہی میں جماعت اسلامی کے ننگے سر والے مولوی لیاقت بلوچ نے بیان دیا ہے کہ جنرل مشرف نے استنبول میں گھر خرید رکھا ہے جس کی صدر اور حکومتی وزرا نے سختی سے تردید کی ہے۔ دروغ برگردن راوی۔ لیکن لیاقت بلوچ صاحب کیلئے فکر کی کوئی بات نہیں۔ اسلئے کہ اُن کے پیر و مرشد مولانا مودودی مرحوم اپنی جماعت کے صالحین کیلئے مصلحت آمیز دروغ کو جائز قرار دے گئے ہیں۔ بہر حال جنرل پرویز کی دیکھا دیکھی اُن کی حکومتی ٹیم کو بھی اپنے اثاثوں کے گوشوارے داخل کرنے پڑے۔

اقتدار اور اختیارات کی تقسیم

جنرل مشرف کو اقتدار سنبھالنے کے بعد بیوروکریسی کے سرخ فیتے کی طرف سے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ قومی تعمیر نو بیورو کی سفارشات کے تحت بیوروکریسی کے اختیارات کو کم کر کے اُن کی نچلی سطح کے عوامی نمائندوں تک تقسیم کا منصوبہ بنایا گیا۔ اِس میں ضلعی سطح تک ناظم اور نائب ناظم کے انتخابات شامل تھے۔ اِس نظام کے نفاذ سے بیوروکریسی کے علاوہ صوبائی اور قومی اسمبلی کے ممبران کے اختیارات پر بھی سخت زد پڑتی تھی۔ لہٰذا اِن کی طرف سے سخت ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ لیکن قومی تعمیر نو بیورو کے سربراہ کی ہٹ دھرمی کے آگے جنرل پرویز بھی بے بس ہو گئے۔ عوام اور سیاست دانوں کی بھاری اکثریت کی مخالفت کے باوجود یہ نظام نافذ کر دیا گیا۔ آہستہ آہستہ اِس نظام کی خامیاں بھی منظر عام پر آنے لگی ہیں۔ اور بی بی نے تو مشرف کے ۲۰۰۷ء کے صدارتی انتخاب میں تعاون کے بدلے میں اُن سے اِس نظام کے خاتمے کا مطالبہ بھی کیا تھا۔

فوری اِحتساب

اول تو وہ کام یعنی فوری احتساب، جس کا جنرل مشرف نے بڑے زور شور سے چرچا کیا تھا، ترجیحات بناتے وقت اُس کو آخری نمبر پر رکھا۔ اور جب شروع ہوا تو یہ عمل غیر جانبداری اور عدم مداخلت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود مستقبل کی سوچ اور سیاسی مصلحتوں کا شکار ہو گیا۔ ابتدا میں تو لوٹی ہوئی قومی دولت کی بازیابی کیلئے قومی احتساب بیورو کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل امجد

حسین کو وسیع اختیارات دے کرنادہندگان کے خلاف آئی ایس آئی، رینجرز اور فوج کے ذریعے کارروائی کی اجازت دے دی۔ احتساب آرڈیننس کے تحت گرفتار ہونے والے نادہندگان نہ تو کسی عدالت میں اپنی ضمانت کرا سکتے تھے اور نہ اپنی گرفتاری کو چیلنج کر سکتے تھے۔ گرفتار شدگان کو لاہور اور کراچی کی چھاؤنیوں میں رکھا گیا۔ اس کی لپیٹ میں آنے والے قابل ذکر ارب پتی سرمایہ کاروں میں شریف خاندان اور سہگل خاندان اور سیاستدانوں میں سرفہرست فیصل صالح حیات، منظور وٹو، نواز کھوکھر، اسلام الدین شیخ، نادر مگسی، اور انور سیف اللہ بھی شامل تھے۔ شریف خاندان کے بانی میاں محمد شریف کی رہائی کیلئے شریف خاندان نے فوری طور پر ۲۷ کروڑ روپے ادا کر دیئے۔ فیصل صالح حیات اور چودھری شجاعت حسین نے ہوا کا رکھ دیکھ کر شمولیت اقتدار کے لئے اپنے ذمے ملکی قرضوں میں سے بالترتیب ۶۲ اور ۳۲ کروڑ روپے متعلقہ بینکوں میں جمع کرا دئے۔ اور سابقہ احتساب بیورو کے سربراہ سیف الرحمٰن نے جیل سے رہائی کیلئے ۲۵ کروڑ ادا کئے۔ چند ایک سابقہ فوجی جرنیلوں سے بھی واجبات وصول کئے گئے۔ ان میں سرفہرست ایڈمرل منصور الحق ہیں، جنہیں انٹرپول کے ذریعے امریکہ سے واپس لا کر جیل میں بند کیا گیا اور پھر اُن سے وصولی کی گئی۔ لیکن جب قومی خزانے کو اربوں روپوں کا نقصان پہنچانے والے چند حاضر سروس اعلیٰ فوجی افسروں کی باری آئی تو جنرل امجد کو تبدیل کر کے ملتان کور کا کمانڈر لگا دیا گیا۔ اس طرح قومی خزانے سے لوٹی ہوئی دولت کی بازیابی کا عمل قدرے دھیما پڑ گیا۔

نواز شریف دور میں کارگل کے مسئلے کی وجہ سے بین الاقوامی میڈیا پر پاک فوج کو بدنام کرنے کی ایک منظم مہم شروع کی گئی تھی جس کی پشت پناہی بھارت اور بعض مغربی ممالک کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ کور کمانڈروں کو کروڑ کمانڈر اور پاک فوج کو (Rogue Army) یعنی ''بدمعاش فوج'' کے القاب سے یاد کیا گیا۔ کارگل کے شہیدوں کو نظر انداز کرتے ہوئے حکومتی نمائندوں نے اُن کے جنازوں میں شمولیت تک گوارا نہ کی۔ چند ایک محب وطن پاکستانیوں نے جب اِس مہم کی جوابی کارروائی کیلئے فنڈز مہیا کرنے کی پیشکش کی تو حکومتی سطح پر بے اعتنائی برتی گئی۔ لہٰذا فوج کی ہائی کمان کی طرف سے اس ساری بدنامی کے ذمہ دار سابقہ حکومتی نمائندوں کے خلاف کارروائی کیلئے جنرل مشرف پر اچھا خاصا دباؤ تھا۔ لیکن اُنہوں نے ملکی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس معاملے کو مزید طول دینے سے یہ کہہ کر گریز کیا کہ ملک اور فوج دونوں کیلئے بہتر ہے کہ ایسے اسباب کا کھوج نہ لگایا جائے جس سے عوام اور فوج میں انتشار اور بے چینی کے نتیجے میں

محاذ آرائی کا اندیشہ ہو۔ اِس طرح اُنہوں نے اِس سارے معاملے کو فراموش کرتے ہوئے کارگل سے پسپائی کے حکومتی اعلان سے شدید طور پر مضطرب اور زخم خوردہ فوج کو انتشار کا شکار ہونے سے بچالیا۔ ملکی اور غیر ملکی دفاعی تجزیہ نگاروں کی نظر میں جنرل مشرف کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔

۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء کو کھٹمنڈو سے نئی دہلی آنے والے بھارتی ائیر لائن کے ایک طیارے کو چند پاکستانی ہائی جیکر اغوا کر کے کابل لے گئے اور وہاں کوئی ہفتہ بھر طیارے کے مسافروں کو یرغمال بنائے رکھا۔ ہائی جیکروں کا مطالبہ تھا کہ اُن تین درجن کے قریب جہادیوں کو رہا کیا جائے جو بھارتی جیلوں میں قید تھے۔ مذکرات کے بعد بھارتی حکومت مولانا اظہر مسعود، احمد عمر شیخ اور اُن کے ایک اور ساتھی کو رہا کرنے پر رضامند ہوگئی۔ بھارت نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دنیا بھر میں اس واقعہ کو اُچھال کر پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دینے کا پرزور مطالبہ شروع کر دیا۔ جہادی تنظیموں کی اس قسم کی کارروائیوں سے پاکستان کے اِس مؤقف کو سخت دھچکا لگا کہ کشمیر کی آزادی کی جنگ وہاں کے مجاہدین لڑ رہے ہیں۔ ان جہادی تنظیمیں کے لیڈر تمام اخلاقی اور قانونی ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر حسب عادت اپنی اوقات سے بڑھ چڑھ کر بڑے ہی مضحکہ خیز دعووں سے سادہ لوح عوام میں یہ تأثر دینے کی کوشش کرتے کہ وہ امریکہ کو سبق سکھانے اور بھارت کو پارہ پارہ کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی اِس قسم کی بے ربط کارروائیوں سے پاکستان کے متعلق ایک ایسی ریاست کا تصور سامنے آتا تھا جہاں کسی کی جان و مال محفوظ نہ ہو۔

چنانچہ اسی تأثر کے پیشِ نظر فروری ۲۰۰۰ء میں جب امریکی صدر بل کلنٹن کے جنوبی ایشیا کے دورے کا اعلان کیا گیا تو اُس میں پاکستان شامل نہ تھا مگر جنرل مشرف کی مساعی کے نتیجے میں پاکستان نواز لابی بل کلنٹن کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئی کہ بھارت کے معاندانہ پروپیگنڈہ کے زیرِ اثر امریکہ کو اپنے آزمودہ حلیفوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا امریکی حکومت اِس بات پر متفق ہوگئی کہ اپنے دورے کے آخر پر امریکی صدر چند گھنٹے کیلئے پاکستان میں بھی قیام کریں گے۔ بھارتی لابی نے امریکی صدر کی پاکستان میں آمد کو رکوانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ ثابت کرنے کیلئے کہ پاکستان میں امریکی صدر کی جان کو خطرہ ہے اُنہوں نے اپنے زیرِ کنٹرول جموں کے ایک گاؤں میں اپنے ہی فوجیوں سے دو درجن کے قریب سکھ دھرم کے لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتروا کر واویلا مچانا شروع کر دیا کہ یہ پاکستانی دہشت گردوں کی کارروائی ہے۔ بل کلنٹن نے اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب میں اِس قتلِ عام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُنہیں

بے حد افسوس ہے کہ اُن کے دورۂ پاکستان کو رکوانے کیلئے بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔

تاہم ۲۵ مارچ ۲۰۰۰ء کو سخت حفاظتی انتظامات کے تحت امریکی صدر بل کلنٹن نے چند گھنٹوں کیلئے پاکستان میں 'سٹاپ' کیا۔ اِن چند گھنٹوں کے دوران اُنہوں نے دو گھنٹے تک جنرل مشرف سے دو بدو ملاقات کی اور ٹیلیویژن اور ریڈیو پر پاکستانی قوم سے خطاب کیا۔ اپنی تقریر کا آغاز اُنہوں نے مسلمانوں کی روایات کے مطابق السلام علیکم سے کیا۔ قرآن شریف، علامہ اقبال اور قائداعظم کے اقوال کے حوالہ جات کی مدد سے ایک مخلص، ہمدرد اور مضطرب دوست کے روپ میں انہوں نے پاکستانی قوم کو یہ بات باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اُن کے محفوظ اور خوشحال مستقبل میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں جس کیلئے سیاسی اور معاشی استحکام اور علاقائی کشیدگی کے سدباب کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے ملک کا سربراہ جس کے پیشروؤں اور جانشین نے امن عالم کی دھجیاں بکھیرتے ہوئی کوریائی، ویٹنامی، عراقی اور افغان قوم کے خون کی ندیاں بہادیں، ہنستے بستے خوبصورت شہروں کو کھنڈرات اور راکھ کے ڈھیروں میں بدل دیا، سرسبز وشاداب لہلہاتے کھیتوں اور مرغزاروں کو بیابان اور ریگستان بنا کر رکھ دیا آج کتنی ڈھٹائی سے پاکستانی قوم کو یہ سبق پڑھا رہا تھا کہ یہ دور خون سے سرحدوں کی لکیریں کھینچنے کا نہیں۔ یہ دور مل جل کر تجارت اور معیشت کیلئے شعور کے ساتھ کام کرنے والوں کا ہے۔ جمہوریت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ قائداعظم اندر اور باہر سے مضبوط پاکستان چاہتے تھے مگر یہ کام صرف جمہوریت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ پاکستان کی سابقہ جمہوری حکومتوں کی نااہلی کے اقرار میں اُن کا کہنا تھا:

''میں پاکستانی قوم کی اِس مایوسی سے اچھی طرح آگاہ ہوں کہ سابقہ جمہوری حکومتوں نے اپنی عوام کی بہتری کیلئے کچھ نہیں کیا۔ لیکن بہتر کارکردگی نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جمہوریت ہی ختم کردی جائے۔''

اُنہوں نے پاکستان کیلئے جوہری ہتھیاروں کے حصول کو نقصان دہ قرار دیتے ہوئے اِن میں کمی کی تلقین کی۔ بھارت کے ساتھ محاذ آرائی ختم کر کے مذکرات کے ذریعے اپنے مسائل کا حل نکالنے پر زور دیا۔ اُن کے دورے کے مقاصد میں سب سے اہم جمہوریت کی بحالی تھا۔ بل کلنٹن کی روانگی کے فوراً بعد جنرل پرویز نے امریکی صدر کی طرف سے اُن پر جمہوریت کی بحالی کیلئے ڈالے جانے والے دباؤ کی صورت حال سے اپنے کور کمانڈروں اور پرنسپل سٹاف آفیسروں کو آگاہ کیا تو سب نے متفقہ طور پر اُس وقت تک بحالیٔ جمہوریت کا شیڈول دینے کی مخالفت کی جب تک کہ ملکی معیشت اور گڈ گورننس بحال نہ ہو جائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر جنرل مشرف اُس

وقت بحالیٔ جمہوریت کا شیڈول دے دیتے تو ایک فوجی ڈکٹیٹر ہونے کے باوجود دنیا میں اُن کا امیج بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ فوائد بھی حاصل ہوتے۔ مغربی ممالک اور دولت مشترکہ نے پاکستان کی فوجی حکومت کو اُس وقت تک تسلیم کرنے سے انکار کر رکھا تھا جب تک ملک میں جمہوریت بحال نہیں ہو جاتی۔ اُدھر ملک کے اندر شدت پسند جہادی تنظیمیں جہاد کے نام پر لوگوں سے نہ صرف جبری چندہ وصول کر رہی تھیں بلکہ سادہ لوح عوام کو جن میں اکثریت غریب اور بے روزگار دیہاتی نوجوانوں کی تھی سرحدی علاقوں میں قائم کردہ ٹریننگ کیمپوں میں بھجوا رہی تھیں جہاں پاک فوج کے سابقہ فوجی اِنہیں تربیت دیکر مقبوضہ کشمیر میں انڈین فوج اور افغانستان میں شمالی اتحادیوں کے خلاف جہاد کیلئے بھیجتے۔ مجاہدین کی اِن کارروائیوں سے تنگ آکر بھارت پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلوا کر اِس کے خلاف جنگ کیلئے تیار کھڑا تھا۔

اِسلامی جمہوریہ پاکستان میں گزشتہ ساٹھ سال سے بالعموم اور پچھلے تیس سال سے بالخصوص جماعت احمدیہ کے افراد کو اِسلام کے نام پر ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ حکومت پاکستان نے اُنہیں تمام انسانی بنیادی حقوق سے محروم کر رکھا ہے لیکن اِس بھری دنیا میں کوئی اُن کے حقوق کی بحالی کیلئے آواز نہیں اُٹھاتا۔ اِن محمد عربی ﷺ کے جانثاروں اور شمعِ رسالت کے پروانوں کے خلاف توہین رسالت کے بے بنیاد اور مبنی بر دروغ مقدمات درج کرا کر جیلوں میں سڑنے کیلئے بند کر دیا جاتا ہے جہاں سالہا سال تک نہ تو اُن کی کوئی شنوائی ہوتی ہے اور نہ ہی دادرسی۔ اِسلئے کہ اُن کی پشت پر کوئی ایسی بڑی دنیاوی طاقت نہیں جو حکومت پاکستان سے اُن کے بارے میں جواب طلبی کر سکے۔ لیکن اِسی پاکستان میں جب چند ملانوں نے عیسائی مذہب کے بعض ماننے والوں کو توہین رسالت کے کے نام پر تشدد کا نشانہ بنا کر مقدمات میں ملوث کیا تو ساری مغربی دنیا کا میڈیا بلبلا اُٹھا۔ حکومتی سطح پر احتجاج کئے گئے۔ جنرل مشرف نے اقتدار سنبھالنے کے بعد بیرونی دنیا میں یہ تأثر دیا کہ وہ ایک لبرل مذہبی نظریہ رکھنے والے مسلمان ہیں۔ اُن کی کابینہ میں بھی عموماً اِسی سوچ کے لوگ شامل تھے۔ چنانچہ مغربی دنیا کی خوشنودی کی خاطر اُنہوں نے توہینِ رسالت کے قانون میں ترمیم کا حکمنامہ جاری کر دیا۔ یہ تو گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ ایک طرف پورے ملک کے دریدہ دہن ملاں گلا پھاڑ پھاڑ کر جنرل مشرف کو بے دین اور قادیانیوں کا ایجنٹ گردانے لگے۔ دوسری طرف سارے ملک میں جماعت احمدیہ کے افراد کے خلاف تشدد کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۰ء کو موضع گھٹیالیاں ضلع سیالکوٹ میں

چار مسلح افراد نے صبح سوا چھ بجے کے قریب احمدیہ مسجد میں داخل ہو کر پچیس کے قریب نمازیوں پر اندھا دھند فائر کر دی جس کے نتیجے میں ۱۲ نمازی زخمی ہو گئے۔ دو نے موقع پر ہی دم توڑ دیا اور تین ہسپتال پہنچ کر زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ بات مسلم ہے کہ پاکستانی مسلمان چاہے لبرل ہو چاہے بنیاد پرست آپ اُسے جو مرضی گالی دے لیں وہ پی جائے گا مگر اگر اُسے قادیانی کہہ دیا جائے تو وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی لیڈر ملاؤں کے قابو میں نہیں آتا تو وہ اُسے قادیانی کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ مولویوں نے یہی حربہ پرویز مشرف کے خلاف بھی استعمال کیا۔ مولویوں کے ساتھ تاجر، صنعتکار اور سیاستدان بھی ہڑتالوں میں شامل ہو گئے۔ اور شنید ہے کہ جلتی پر تیل ڈالنے کی خاطر شریف خاندان نے اِس مہم کے کرتا دھرتا مولویوں کو نوٹوں سے بھرے بریف کیس پہنچانے شروع کر دئے۔ اُن کا منصوبہ کامیاب ہوا۔ چند ہی دنوں میں شیر صورت جرنیل بھیڑ ہو گیا۔ توہین رسالت کا قانون پھر سے بحال کر دیا گیا۔ مگر ہزار صفائیاں پیش کرنے کے باوجود قادیانی کی تیخ اُن کے ساتھ ابھی تک لگی ہوئی ہے۔

جنرل مشرف نے ہر فورم پر کہا کہ اُس کا کسی سے ذاتی عناد نہیں۔ نواز شریف کے خلاف عدالتوں میں مقدمات زیرِ سماعت ہیں۔ عدالتیں جو بھی فیصلہ کریں گی اُن پر عمل درآمد ہو گا۔ عدالت نے طیارہ کیس میں نواز شریف کو عمر قید کی سزا سنائی تو یہ بڑے لوگوں کے احتساب کی ایک عُمدہ مثال تھی۔ لیکن اپنے اقتدار کی حفاظت کی خاطر ۱۰ دسمبر ۲۰۰۰ء کو نواز شریف اور اُس کے خاندان کو سعودی عرب بھیج کر جنرل مشرف نے اِس احتساب کو مذاق بنا کے رکھ دیا۔ اُن کے اِس فیصلے نے فوجی حکومت کی ساکھ کو بری طرح متاثر کیا۔ اور بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ اُن کا یہ فیصلہ اُن کی اپنی سلامتی کیلئے ایک فاش غلطی تھی۔ لیکن وقتی طور پر اُنہیں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ شریف فیملی کے پاکستان کے سیاسی منظر سے غائب ہونے سے مسلم لیگ (ن) بھی اُسی طرح سے اپاہج ہو گئی جس طرح سے بے نظیر کے بیرونِ ملک جا بیٹھنے سے پی پی پی۔

عدالتِ عظمیٰ کی آشیر باد

۱۲ مئی ۲۰۰۰ء کو سپریم کورٹ نے متفقہ طور پر جنرل مشرف کے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے اقدام کو جائز قرار دیتے ہوئے اُنہیں تین سال کی مہلت دے کر آئین میں ترمیم کے اِختیار کے ساتھ

الیکشن کرانے کا حکم دیا۔اب اُن کیلئے سیاست کا میدان صاف تھا۔اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کی خاطر اپنے فوجی بزرگوں کے آزمودہ داؤ پیچوں سے لیس ہو کر جاہ طلب اور اقتدار کے بھوکے سیاستدانوں کو انگلیوں پر نچانا شروع کر دیا۔۳ جولائی ۲۰۰۰ء کو نواز شریف کے یار غار راجہ ظفر الحق نے مولوی فضل الرحمٰن کی معیت میں جنرل پرویز کے حضور حاضر ہو کر ملک وقوم کی خاطر فوجی حکومت کیلئے اپنی خدمات پیش کیں۔اس کے بعد تو سیاستدانوں کی لائن لگ گئی۔کیا مخدوم فہیم اور کیا پیر پگاڑو، کیا راؤ سکندر اقبال اور کیا حامد ناصر چٹھہ، کیا فخر امام اور کیا عمران خان، کیا علامہ ساجد نقوی اور کیا نام نہاد عاشقان رسولؐ طاہر القادری اور شاہ احمد نورانی وغیرہ، سب نے حاضر ہو کر فوجی حکومت کے زیر سایہ ملک کی خدمت کی پیشکش کی۔ایسی خواہش کا اظہار اُن سیاستدانوں نے بھی کیا جو متعدد بار اقتدار میں رہ کر بھی ملک کی خدمت نہ کر سکے تھے۔جب فوجی حکومت نے اُنہیں گھاس نہ ڈالی تو فوج کو بلانے والے یہی سیاستدان فوجی حکومت کے خلاف اُٹھ کر جمہوریت کی بولی بولنے لگے۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی کہ ایوان صدر میں بندھا ہُوا سفید ہاتھی شریف خاندان کا خاص پروردہ تھا۔نواز شریف نے اُسے متعدد بار پیغام بھجوایا کہ وہ صدارت سے استعفےٰ دے دیں لیکن شریف فیملی سے زیادہ اُسے اپنی صدارت عزیز تھی۔محمد رفیق تارڑ اگر چہ بلا اختیار صدر تھا تاہم جنرل مشرف نے اُس پر کبھی اعتماد نہ کیا تھا۔وہ چاہتے تو اُسے فوری طور پر فارغ بھی کر سکتے تھے۔لیکن اِس کے لئے وہ کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھے۔تارڑ میاں کے دن تو گنے جا چکے تھے۔لہٰذا کچھ دن اور اُسے ایوان صدر کی کرسیوں پر بیٹھ کر آرام کرنے اور شکار شدہ ہرن کے گوشت سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا گیا۔

چیف ایگزیکٹو سے پریذیڈنٹ

آخر ایوان صدر سے تارڑ صاحب کی رخصتی کا وقت آن پہنچا۔ہوا یوں کہ اِنہی دنوں پاکستان اور بھارت کے درمیان محاذ آرائی کم کرنے کیلئے دونوں ملکوں پر امریکی دباؤ بڑھ گیا۔بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری باجپائی نے پہل کرتے ہوئے جنرل پرویز کو بھارت کے دورے کی دعوت بھجوا دی۔چیف ایگزیکٹو کا عہدہ غیر آئینی اور غیر قانونی تھا۔اگر اِس حیثیت سے وہ بھارت کا دورہ کرتے تو بھارت کے ساتھ کئے گئے تمام معاہدے غیر قانونی ہوتے۔اِس لئے اُن کیلئے لازمی

ہو گیا کہ دورہ پر جانے سے قبل آئینی عہدے کے حامل ہوں۔ اب تو سپریم کورٹ نے بھی انہیں آئین میں تبدیلی کی اجازت دے رکھی تھی۔ لہٰذا مئی ۲۰۰۱ء میں تارڑ صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ چنانچہ ۲۰ جون ۲۰۰۱ء کو ایک عبوری آئینی حکمنامے کے ذریعے اُنہیں عہدۂ صدارت سے برخاست کر کے جنرل پرویز مشرف نے صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ سینیٹ اور اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔

آگرہ کانفرنس

۱۴ جولائی ۲۰۰۱ء کو جنرل مشرف نے بھارت کا دورہ کیا جو تاریخ میں آگرہ کانفرنس کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی میڈیا نے اِس کانفرنس کی لمحہ لمحہ کی کارروائی کو ساری دنیا میں پہنچایا۔ مذاکرات کی ابتدا بھی بڑے خوشگوار ماحول میں ہوئی مگر بتدریج بھارتی وفد کے رویّے میں سختی آتی گئی۔ یہاں تک کہ کشمیر کے بنیادی مسئلہ پر تیار ہونے والے مشترکہ اعلامیہ کی تحریر کو تین بار بدلا گیا اور ہر بار تبدیلی بھارتی وفد کے اعتراضات کی بنا پر عمل میں آئی۔ اور آخر کار سابقہ مذاکرات کی طرح یہ مذاکرات بھی ناکامی کا شکار ہو گئے۔ اور دونوں ملکوں میں کشیدگی اور بھی بڑھ گئی۔

۶ اگست ۲۰۰۱ء کو نامعلوم دہشت گردوں نے بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ کر دیا جس میں اُس کے چند اہلکار مارے گئے۔ بھارت نے اِس حملے کی فلم تیار کروا کر میڈیا پر نشر کروائی۔ اِس فلم میں صرف بھارتی سیکورٹی کے اہلکاروں کو بھاگتے دوڑتے دکھایا گیا ہے۔ کسی حملہ آور کو نہ تو پکڑنے کی کوشش کی گئی اور نہ ہی اُن کی شکل دکھائی گئی اور حسبِ روایت اِس حملے کا الزام بھی پاکستان پر لگا کر ایک بار پھر عالمی سطح پر پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دیئے جانے کی مہم شروع کر دی گئی۔ اور ساتھ ہی پچاس پاکستانی شہریوں کو جو بھارتی مؤقف کے مطابق اِس دہشت گردی میں ملوث تھے کو اُن کے حوالے کرنے کا مطالبہ بھی داغ دیا۔ مگر بھارت کی طرف سے اُن کے خلاف ثبوت کی عدم فراہمی کی بنا پر حکومت پاکستان نے اُن کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ بھارت نے ردِعمل کے طور پر پاکستان سے مواصلاتی اور ہوائی رابطہ منقطع کر دیا۔ اور ساتھ ہی اپنی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر جمع کر کے جنگ کیلئے مورچہ بندی شروع کر دی۔ جواباً پاکستان کو بھی اپنی فوجیں حرکت میں لانی پڑیں۔ اِس موقع پر صدر پاکستان نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان بھارت سے محاذ آرائی نہیں چاہتا تاہم اگر ہم پر جنگ مسلط کی گئی تو ہم اُس کا بھرپور جواب دیں گے۔

گیارہ ستمبر کا سانحہ

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ نہ صرف امریکہ بلکہ پوری اسلامی دنیا کے مسلمانوں کیلئے ایک شرمناک المیہ بن کر ظاہر ہوا۔ قبل اس کے کہ امریکہ پاکستان کی طرف انگلی اٹھاتا بھارت، جس نے اپنی فوجیں پہلے ہی پاکستانی سرحدوں پر جمع کر رکھی تھیں، نے سب سے پہلے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ پاکستانی دہشت گردوں کا کارنامہ ہے۔ موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم اٹل بہار باجپائی نے امریکی صدر کو یہاں تک پیشکش کر دی کہ پاکستان اور افغانستان سے دہشت گردی کے ٹھکانوں کے خاتمے کیلئے ہندوستان غیر مشروط طور پر امریکہ سے تعاون کیلئے تیار ہے۔ اس کی خاطر وہ امریکی فوجوں کو اپنی سرزمین اور ہوائی اڈے بھی پیش کرتا ہے۔ لیکن امریکہ نے بھارتی پیشکش قبول کرنے سے پیشتر حسبِ سابق پاکستان کو ہی اپنا فرنٹ لائن اتحادی بنانا مناسب سمجھا۔ لہٰذا امریکی صدر بش نے ذاتی طور پر صدر مشرف سے فون پر استفسار کیا کہ آیا دہشت گردی کے خلاف اِس جنگ میں وہ اُن کا ساتھ دے رہے ہیں یا نہیں۔ جنرل مشرف نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیلئے کچھ وقت مانگا۔ ہنگامی طور پر کابینہ اور کور کمانڈروں کی میٹنگیں بلائی گئیں۔ مشورہ کے بعد متفقہ طور پر امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بننے کا فیصلہ کیا گیا۔ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے جب جارج بش کے سوال کے جواب کیلئے دوبارہ جنرل مشرف کو فون کیا تو وہ غیر متوقع طور پر یہ جواب سن کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے امریکہ کے تمام مطالبات منظور کر لئے ہیں۔ تاہم امریکی مطالبات منظور کرتے وقت جنرل مشرف نے کولن پاول کے سامنے چند ایک تحفظات بھی رکھے۔ کولن پاول کی طرف سے اُن تحفظات کے دور کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی۔ وہ تحفظات یہ تھے: ☆ بھارت پاکستان کے ساتھ کوئی گڑ بڑ نہیں کرے گا۔ ☆ کشمیر کے مسئلہ کو حل کرانے کیلئے پاک بھارت مذاکرات شروع کرائے جائیں گے۔ ☆ اور طالبان کے بعد افغانستان میں شمالی اتحاد کی حکومت نہیں بنے گی۔ یہ یقین دہانیاں کہاں تک پوری ہوئیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے مگر اُس وقت اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ جنرل مشرف نے اپنی کتاب "In The Line of Fire" میں اِس بات کا اقرار کیا ہے کی امریکی نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج نے تو اُنہیں یہاں تک دھمکی دی تھی کہ اگر پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دینے سے انکار کیا تو اُسے پتھر کے زمانے میں پہنچا دیا جائے گا۔

آج ایک طرف امریکہ افغانستان میں الجھا ہوا ہے اور دوسری طرف عراق میں خودکش ملاں ہر روز درجنوں امریکی فوجیوں کی لاشیں گرتی دیکھ کر سیاسی بزرجمہر مخالفت برائے مخالفت کی بنا پر جنرل مشرف کے امریکی مطالبات کو تسلیم کرنے کے فیصلے کو آئے دن اپنی تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ مگر وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اگر اس وقت پاکستان بھی افغانستان کی طرح امریکہ کے سامنے اکڑ جاتا تو پہلے تو بھارت اور امریکہ کی متحدہ افواج لاہور سے لے کر طورخم تک کے ہر بڑے پاکستانی شہر کو تورا بورا بنا ڈالتیں اور پھر ان دونوں طاقتور ملکوں کی فوجیں سکم، بھوٹان تبت اور نیپال کی طرح پاکستان کو بھی ہمیشہ ہمیش کیلئے بھارت کا زیرنگیں بننے پر مجبور کر دیتیں۔ اور آج ہمارا بھی وہی حشر ہو رہا ہوتا جو عراقیوں اور افغانستانیوں کا ہو رہا ہے۔ جرنیل بیتی کے نام سے جنرل مشرف کی سوانح حیات لکھنے والے مقبول ارشد اپنی اس کتاب میں اُن کے اس فیصلے کو درست قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جنرل پرویز نے مفروضات اور خوش فہمیوں کو بالائے طاق رکھ کر درست فیصلہ کیا تھا ورنہ آج حالات کچھ اور بھی ہو سکتے تھے۔ اگر پاکستان جنگ میں امریکہ کا ساتھ نہ دیتا تو آج پاکستان افغانستان پر حملے کی لاکھ مخالفت کرتا لیکن وہ اس کے نتیجے میں جہاں خود مشکلات کا شکار ہوتا وہاں افغانستان کو بھی نہ بچا سکتا، کیونکہ امریکہ کے معاملے میں روس کے خلاف جہاد کو مثال نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کی جدید ترین اور اندھی جنگی مشینری فوجیوں، شہریوں، مردوں، عورتوں اور بچوں کے درمیان امتیاز نہیں کرتی۔ نائن الیون کے بعد امریکی قیادت نے القاعدہ اور دہشت گردی کے نام پر اپنے عوام کو اتنا خوفزدہ کر رکھا ہے کہ وہ اپنے فوجی بیٹوں کی نعشوں کو وصول کر کے روتے دھوتے ضرور ہیں مگر پاگل نہیں ہوتے۔ وہ دور گزر گیا جب 'صبح کبھی تو آئے گی' اور 'آخری فتح' کی اُمید میں قتل گاہوں سے شہیدوں کے علم چن کر عشاق کے مزید قافلے اُٹھتے تھے۔ ...... عراق اور فلسطین میں خودکش حملے کرنے والوں کو سلام لیکن وہ دہشت گردی تو پھیلا سکتے ہیں کوئی انقلاب نہیں لا سکتے۔ ...... اِن عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے جنرل پرویز نے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کے فرنٹ لائن اتحادی بننے کا اعلان کیا تو اُن کے بقول یہ ایک مجبوری تھی اور اس میں پاکستان کی بقا اور سالمیت تھی۔'' (۱۶۸)

بہرحال امریکہ کا اتحادی بننے کے بعد جنرل مشرف امریکی صدر بش کا معتمد ترین دوست بن گئے۔ فروری ۲۰۰۲ء میں انہوں نے امریکی صدر کی دعوت پر امریکہ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں امریکی حکومت نے اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دہشت گردی کے قلع قمع اور القاعدہ کے خلاف اُن کی حکومت کی طرف سے امریکی حمایت کو بے حد سراہا گیا۔ مگر عملی طور پر پاکستان کے قرضوں کی معافی اور مالی امداد میں اُنہیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔

ریفرنڈم

امریکی حکومت کا مزاج دیکھ کر اُنہوں نے اپنی صدارت کی مدت میں مزید پانچ سال کے اضافے کیلئے براہ راست عوامی رائے سے توثیق کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس کیلئے اُنہیں کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کے سہارے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اِس کام کیلئے مخصوص مراعات کے بدلے میاں اظہر اور چوہدری برادران کی کوششوں سے مسلم لیگ (قائد اعظم) بنائی گئی۔ ۶ اپریل کو ۲۰۰۲ء کو قوم سے خطاب کے ذریعے ریفرنڈم کا اعلان کیا گیا۔ اُنہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ یہ ریفرنڈم اور آئندہ قومی اور صوبائی حکومتوں کے انتخابات مخلوط طرز اِنتخابات کی بنیاد پر ہونگے۔ اِس مقصد کیلئے اُنہوں نے سپریم کورٹ کی طرف سے دیئے گئے اختیارات کے تحت ضیاء الحق کی طرف سے کی گئی جداگانہ طرز انتخاب کی آئینی ترمیم کو منسوخ کر کے پھر سے مخلوط طرز انتخابات کا نظام بحال کر دیا۔ ریفرنڈم کے اعلان کے ساتھ ہی سیاسی حلقوں میں ہل چل مچ گئی اِسلئے کہ ایک منجھے ہوئے سیاستدان کی طرح جنرل مشرف نے یہ اعلان اپنی مقبولیت کے عروج پر کیا تھا۔ اُنہیں یقین تھا کہ عوام کی بھاری اکثریت اگلے پانچ سال کیلئے اُن کے اقتدار کی توثیق کر دے گی۔ چنانچہ پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو نے تو اپنے ایک انٹرویو میں یہاں تک کہا کہ ہم تو جنرل پرویز مشرف کو صدر قبول کرنے کیلئے تیار ہیں لیکن یہ بات اُن سے پوچھنے کی ہے کہ کیا وہ بھی میرا سیاسی کردار تسلیم کرنے کو تیار ہیں یا نہیں۔ قاضی حسین احمد جو قبل ازیں فوجی حکومت کے حق میں رطب اللسان تھے، نے ریفرنڈم کے خلاف سپریم کورٹ میں رٹ دائر کر دی۔ ۲۷ اپریل کو سپریم کورٹ نے طرفین کے دلائل سننے کے بعد فیصلہ جنرل پرویز مشرف کے حق میں دے دیا۔ ۳۰ اپریل ۲۰۰۲ء کو ریفرنڈم ہوا۔ نتائج کے مطابق قریب ۹۸ فیصد رائے دہندگان نے اُن کے حق میں ووٹ ڈالا اور وہ مزید پانچ سال کیلئے صدر منتخب ہو گئے۔

جمہوریت

اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے بعد سپریم کورٹ کے حکم کے تحت اکتوبر ۲۰۰۲ء میں ملک بھر میں قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے گئے۔ اِن اِنتخابات نے جنرل یحییٰ کے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی یاد تازہ کر دی۔ غیر جانبداری کے نام پر جس طرح مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے

کارکنوں کو کھلی چھٹی دیدی گئی تھی کہ وہ مخالف سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں کو ہراساں کر کے پولنگ سٹیشنوں سے دور رہنے پر مجبور کر دیں اُسی طرح صوبہ سرحد اور بلوچستان میں متحدہ مجلس عمل کے مدرسوں کے طلباء نے اپنی پر تشدد کارروائیوں سے چند ایک جگہوں کے سوا باقی ہر جگہ پر پولنگ سٹیشنوں پر صرف اپنی مرضی کے نمائندوں کے حق میں ووٹ ڈالنے کی اجازت دی۔ نتیجۃً متحدہ مجلس عمل کی وہ بنیاد پرست اسلامی جماعتیں جنہیں قومی اسمبلی میں چند ایک سیٹوں کے سوا کبھی کامیابی نہ ہوئی تھی ۶۳ سیٹوں کے ساتھ تیسری بڑی پارٹی بن کر سامنے آئی۔

انتخابات کے نتیجے میں ہنگ پارلیمنٹ وجود میں آئی۔ دونوں بڑی پارٹیوں یعنی مسلم لیگ (ق) اور پیپلز پارٹی میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہ تھیں کہ اپنی حکومت بنا سکتیں۔ اس کیلئے اُنہیں اتحادیوں کی ضرورت تھی۔ مسلم لیگ نواز کے پاس اگرچہ ۱۹ سیٹیں تھیں لیکن اُن کا نہ تو مسلم لیگ (ق) سے اتحاد ہو سکتا تھا اور نہ ہی پی پی پی سے۔ ق لیگ اور پی پی پی کا تو آگ اور پانی والا معاملہ تھا۔ اِسلئے متحدہ مجلس عمل کو اپنی اہمیت کا ضرورت سے زیادہ احساس ہونے لگا۔ پنجابی کی ایک مثال ہے کہ ''ہوچھے جٹ کٹورا لبا پانی پی پی آپھریا''، یعنی کم ظرف آدمی کو اگر معمولی سی اتھارٹی مل جائے تو وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر باتیں کرنی شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایم ایم اے کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ کسی بھی پارٹی سے تعاون صرف اِن شرائط پر ہوگا کہ وزیر اعظم اور سپیکر اُن کی پارٹی سے ہو۔ بلکہ اُنہوں نے تو ترنگ میں آکر یہاں تک للکارنا شروع کر دیا کہ پرویز مشرف کی جگہ قاضی حسین احمد صدر، مولانا فضل الرحمٰن وزیر اعظم اور لیاقت بلوچ قومی اسمبلی کے سپیکر ہونگے۔ مگر جنرل مشرف جنرل یحییٰ کے برعکس قسمت کے بھی دھنی نکلے۔ جہاں یحییٰ کی خفیہ ایجنسیاں بھٹو جیسے سیاستدان کو قائل کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ مل کر متحدہ حکومت بنوانے میں ناکام ہو گئیں وہاں جنرل پرویز مشرف کے مشیروں نے پہلے تو مسلم لیگ (ن) اور بے نظیر بھٹو کی پیپلز پارٹی پارلیمینٹیرین کے حصے بخرے کر کے مسلم لیگ (ق) اور پی پی پی پیٹریاٹ بنوائیں اور پھر ان دونوں پارٹیوں کا ایم کیو ایم کے ساتھ اتحاد قائم کرا کے مرکز میں اپنی مرضی کی حکومت بنوا دی۔ مولانا فضل الرحمٰن کو قائد حزب اختلاف بنا دیا جو آڑے وقت میں حکومت کے کام آنے لگے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جے یو آئی کی سربراہی میں ایم ایم اے کی حکومتیں بن گئیں۔

اِس طرح متحدہ مجلس عمل کو مرکز میں اقتدار سے دور رکھ کر ایک طرف امریکہ کی خوشنودی حاصل کی اور دوسری طرف صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں کے ذریعے اُسے یہ پیغام دیا کہ

پاکستان میں انتہا پسند مذہبی طاقتیں ابھی تک اتنی مضبوط ہیں کہ اُن کو قابو میں رکھنے کیلئے مشرف جیسے لبرل حکمران کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ نومبر ۲۰۰۲ء میں میر ظفر اللہ خان جمالی نے قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لے کر وزیر اعظم کے عہدے کا حلف اُٹھالیا۔ ایم ایم اے، پی پی پی پارلیمنٹیرین اور عمران خان نے وزیر اعظم کی مخالفت میں ووٹ دئے۔

وزارت عظمٰی کی دوڑ سے نکل کر پی پی پی پارلیمینٹیرین تو منجھی ہوئی سیاسی جماعت کی طرح اپوزیشن کے بنچوں پر جا بیٹھی مگر بھانت بھانت کی بوٹی والی متحدہ مجلس عمل تو سیکھ پا ہوگئی۔ مقبول ارشد کے بقول میری بلی مجھے میاؤں کے مصداق گاؤں کی مسجد میں چند لوگوں کو کرائے کی نماز پڑھانے والے وہ ملاں جو گاؤں کا ناظم بننے کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے فوج کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے بل بوتے پر اسمبلیوں میں پہنچ کر جنرل مشرف کی وردی کے خلاف تحریک چلانے میں لگ گئے۔ یاد رہے کہ انتخابات کے وقت جے یو آئی کے جنرل سیکرٹری حافظ حسین احمد سمیت بہت سے وہ علما جو ایک عرصہ تک صوبہ سرحد اور بلوچستان میں وزارتوں کے مزے لوٹ رہے ہیں اُن کے خلاف دہشت گردی کی عدالتوں میں کریمنل کیسز چل رہے تھے۔ علاوہ ازیں نئے انتخابی قوانین کے تحت قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے لئے کم از کم بی اے تک تعلیم یافتہ ہونا بھی لازمی قرار دیا گیا تھا۔ مولویوں کی اکثریت نے کسی باقاعدہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہ کی ہے۔ اُن کے پاس اپنے مدرسوں کی سندیں ہیں جنہیں کوئی بھی یونیورسٹی تسلیم نہیں کرتی۔ اِسلئے کہ اُن کا نصاب اُن سے بالکل مختلف ہے۔ الیکشن کمیشن میں جب اِن اسناد پر بعض مخالف اُمیدواروں کی طرف سے اعترض اُٹھائے گئے تو مولوی پھر دوڑے دوڑے اپنے سرپرستوں کے پاس گئے جن کی مداخلت سے معاملہ ٹھپ ہوگیا۔ صدر کی وردی کے معاملے کے سلسلے میں مولویوں نے سر اُٹھایا تو اُنہی ایجنسیوں نے اُن کی سندوں کو سپریم کورٹ میں چیلنج کروادیا۔ اُدھر دہشت گردی کی عدالتوں نے بھی اُن کی فائلیں از سر نو طلب کرلیں۔ اگر سپریم کورٹ اُن کی سندیں الیکشن کے لئے ناقابل قبول قرار دے دیتی تو سوائے ایک دو کے سب مولوی اسمبلیوں سے نکل کر پھر سے گاؤں کی مسجدوں میں بیٹھنے پر مجبور ہو جاتے۔ چنانچہ جنرل مشرف کے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کو وردی اُتار دینے کے وعدے پر مولویوں نے اُن کی طرف سے پیش کردہ آئینی ترامیم کے حق میں ووٹ دیدیا۔ لیکن جب یکم جنوری ۲۰۰۴ء کو پارلیمنٹ میں صدر کو اعتماد کا ووٹ دینے کا وقت آیا تو مولوی پھر مکر گئے اور اپوزیشن پارٹی میں جاملے۔ تاہم ۵۶ء۳۳ فیصد ووٹ لے کر ترمیم شدہ آئین کے تحت وہ متحدہ

مجلس عمل کی حمایت کے بغیر ہی صدر منتخب ہو گئے۔ متحدہ مجلس عمل کے اس فعل سے اُن کے اور جنرل مشرف کے درمیان طے شدہ معاہدہ بھی کالعدم ہو گیا۔ اور جنرل کو ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد بھی وردی میں رہنے کا بہانہ مل گیا۔

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے ڈاکٹر عبدالقدیر خان محض پیسے کی خاطر وہ ایٹمی راز جو قوم نے امانت کے طور پر اُن کے سپرد کر رکھے تھے گزشتہ حکومتوں کے دور میں بلا خوف و خطر بدیسیوں کے ہاتھوں بیچتے رہے تھے۔ ممکن ہے اُن کے ساتھ وہ فوجی بھی شامل ہوں جن کی سرپرستی میں وہ ایٹمی پروگرام چلا رہے تھے۔ پرویز مشرف کے دور میں اگرچہ اُن کی اِس قسم کی سرگرمیاں محدود ہو چکی تھیں لیکن فروری ۲۰۰۴ء تک امریکی خفیہ ادارے اُن کی خدمات سے فائدہ اُٹھانے والے ممالک کی ٹوہ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ بھٹو فیملی کے دوست کرنل قدافی نے تو سینٹری فیوجز سے بھرے جہاز امریکنوں کے حوالے کرتے ہوئے برملا اعتراف کیا کہ اُنہوں نے یہ مال ڈاکٹر عبدالقدیر خان سے حاصل کیا تھا۔ امریکی خفیہ اداروں کے دباؤ کے باوجود صدر مشرف نے اپنے قومی ہیرو کو پوچھ گچھ کیلئے غیر ملکی اداروں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر قدیر نے اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر ٹیلیویژن پر آ کر قوم سے معافی مانگی۔ محض پرویز مشرف کی مخالفت میں اندھے ہو کر بعض جاہ طلب سیاستدان اِس سارے معاملے کو مشکوک بنا کر اپنی سیاست کو چمکانے لگے۔ جنرل مشرف کے وردی اُتارنے اور نئے انتخابات کے بعد ہوا کا رُخ دیکھ کر اب ڈاکٹر قدیر نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا کہ اُنہوں نے ملک کو بحران سے بچانے کی خاطر سارا الزام اپنے سر لیا تھا۔ بعض سر پھرے تو اُنہیں ملک کا صدر بنانے کے چکر میں ہیں۔

جمہوریت بحال، جمالی بے حال

جنرل مشرف شروع ہی سے شوکت عزیز کو وزیراعظم بنانا چاہتے تھے مگر ایک تو وہ قومی اسمبلی کے رکن نہ تھے دوسرے یہ کام وہ سیاستدانوں کی رضامندی سے کرنا چاہتے تھے۔ ابتدا میں ایسے شخص کی ضرورت تھی جو تمام اتحادی پارٹیوں کیلئے قابل قبول ہو۔ چنانچہ قرعہ فال ملک کے سب سے پسماندہ صوبے سے تعلق رکھنے والے میر ظفر اللہ خاں جمالی کے نام نکلا۔ اپنے انتخاب پہ جمالی خود بھی حیران تھے مگر خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ ابتداء میں وزیراعظم اور صدر کے خیالات اور پالیسیوں میں ہم آہنگی رہی اور جمالی صاحب جنرل مشرف کو علی الاعلان اپنا

''بوس'' کہنے سے بھی نہ ہچکچاتے مگر کچھ عرصہ بعد وہ یہ بات بھول گئے کہ جو بلاتا ہے وہ واپس بھی بھیج سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے مشیروں کے غلط مشوروں سے وہ بھی جنیجو کی طرح اپنے آپ کو سچ مچ کا وزیرِاعظم سمجھنے لگے۔ اور انہوں نے بعض ایسے اقدام کر ڈالے جو صدارتی کیمپ کی پالیسیوں کے مطابق نہ تھے۔ صدر مشرف کچھ عرصہ تک تو اُن کی آزادانہ روش کو برداشت کرتے رہے لیکن پھر ردِّعمل کا ظاہر ہونا ایک لازمی امر تھا۔

جنرل پرویز مشرف میں یہ خاصیت ہے کہ فوجی ہونے کے باوجود وہ سیاستدانوں سے بھی زیادہ لچکدار رویہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جب مخالف فریق اکڑ جاتا ہے تو وہ اپنے رویّے میں لچک پیدا کر کے اپنی پالیسی تبدیل کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر سب سے پہلے اُنہوں نے توہینِ رسالت کے قانون کو منسوخ کیا لیکن جب مذہبی انتہا پسندوں کی طرف سے مخالفت کا سامنا ہوا تو پھر سے بحال کر دیا۔ اقلیتوں کو خوش کرنے کیلئے اُنہوں نے جداگانہ طرزِ انتخاب کی آئینی ترمیم کو منسوخ کر کے ازسرِنو مخلوط طرزِ انتخابات کو بحال کیا تو مولویوں نے نہ صرف اس کی مخالفت کی بلکہ اُن کے خلاف قادیانی ہونے کا پروپیگنڈہ بھی شروع کر دیا۔ پاکستان کے حاکموں کو ہر گالی برداشت ہے مگر قادیانی کہلانا منظور نہیں۔ چنانچہ اپنے آپ کو ''سُنّی سیّد'' ظاہر کرنے کیلئے صرف قادیانیوں کی غیر مسلم اقلیت کے طور پر علیحدہ انتخابی لسٹ بنا کر اُن کے لئے جداگانہ طرزِ انتخاب پھر سے رائج کر دیا گیا۔ ۱۱ ستمبر کے واقعہ کے بعد بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے بچوں کے ساتھ جب امریکہ میں مسلمان ہونے کے ناطے امتیازی سلوک روا رکھا جانے لگا اور خود ان لیڈروں کے امریکنوں نے ائرپورٹس پر جوتے اور کپڑے اُتروانے شروع کر دئے تو فیصلہ ہوا کہ پاسپورٹ سے مذہب کا خانہ ختم کر دیا جائے۔ مگر امریکہ مخالف مذہبی جماعتوں نے جب اس کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ اُنہیں پھر سے قادیانی کہنا شروع کر دیا تو ہڑبڑا کر پھر سے پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ شامل کر دیا گیا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ پاکستان کے سوا دنیا کے کسی بھی ملک کے پاسپورٹ میں مذہب کا خانہ نہیں ہے۔

چنانچہ اپنی اسی عادت کے تحت جنرل پرویز جمالی صاحب کو اُس وقت تک برداشت کرتے رہے جب تک اُنہیں پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ نہ مل گیا۔ اپوزیشن نے صدر کی وردی کے مسئلے کو اُچھالا تو جمالی نے مسلم لیگیوں اور دیگر وزراء کی طرح صدر کی وردی کی کھل کر حمایت نہ کی جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ بھی ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد صدر کے وردی میں رہنے کے حق میں

نہ تھے۔ صدر کا رویّہ دیکھ کر اُن کے وزراءاور مسلم لیگ (ق) کے صدر چوہدری شجاعت حسین نے بھی اُن سے سرد مہری دکھانی شروع کر دی۔ وزراء جمالی کی بجائے اب اپنے محکموں کے بارے میں شجاعت حسین سے مشاورت کرنے لگے۔ جمالی نے جب اُن کے خلاف کارروائی کرنی چاہی تو انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ آخر ایک دن صدر نے اُنہیں صدارتی کیمپ میں بلا کر مشورہ دیا کہ بہتری اسی میں ہے کہ وہ برطرف ہونے کی بجائے عزت سے گھر چلے جائیں۔ چنانچہ ۲۶ جون ۲۰۰۴ کو میر ظفر اللہ خان جمالی وزارت عظمیٰ کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ اُن کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت تین ماہ کیلئے چوہدری شجاعت حسین کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ اِس دوران میں شوکت عزیز کو قومی اسمبلی کا ممبر منتخب کروا کر اگست ۲۰۰۴ء میں جنرل پرویز مشرف اپنے مسیحا کو وزارت عظمیٰ کے عہدے تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔

اگر غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھا جائے تو جن حالات میں شوکت عزیز کو وزارت خزانہ سونپی گئی تھی اُس وقت ملک کی گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالا دینے کے لئے کسی مسیحا کی ہی ضرورت تھی۔ ملک معاشی طور پر تباہی کے دہانے پر کھڑا تھا۔ غیر ملکی قرضوں کے بوجھ تلے دب کر ملکی معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ خزانے میں اِن قرضوں کے سود کی قسط ادا کرنے کیلئے زرمبادلہ موجود نہ تھا۔ ایٹمی دھماکے کے نتیجے میں پاکستان پر اقتصادی پابندیاں عائد تھیں۔ پچھلے گیارہ سال کے جمہوری دور نے ملک کو پھر سے دیوالیہ پن کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک طرف ملک کے سیاستدان غیر ممالک سے قرض پر قرض حاصل کر کے اپنی تجوریاں بھر رہے تھے دوسری طرف شوکت عزیز جیسے ماہر اقتصادیات امریکہ میں بیٹھ کر اپنی خداداد قابلیت سے غیر ملکی بینک کو عروج پر پہنچانے میں مصروف تھے۔ ہر محبِ وطن پاکستانی پاکستان کی اقتصادی پالیسیوں پر پریشان تھا۔ اُن کے نزدیک ملک کو بہتر طریقے سے چلائے جانے سے مثبت نتائج کا حصول کوئی اتنا مشکل کام نہ تھا مگر اس کے لئے سوجھ بوجھ کے علاوہ دیانتداری نیک نیتی کا ہونا بے حد ضروری تھا۔

شوکت عزیز کیلئے وزارتِ خزانہ کا قلمدان سنبھالنے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ ملکی معیشت کی بحالی تھا۔ اِس کیلئے پیداوار اور برآمدات میں اضافے اور اخراجات میں کمی کی ضرورت تھی۔ اُن کی کوششوں سے ایک سال کے اندر اندر برآمدات کی حد ۱۲ ارب ڈالر تک پہنچ گئی۔ بڑھتے ہوئے بجٹ خسارہ پر قابو پانے کیلئے غیر ملکی مہنگے قرضوں کو کم کیا گیا۔ ۱۷ ارب مالیت کے ایشیائی ترقیاتی بینک کے ۱۴ قرضے قبل از وقت ادا کر کے ۳۰ کروڑ ڈالر کے زرمبادلہ کی بچت کی گئی۔ نواز

شریف حکومت کے خاتمے پر خزانے میں پندرہ دن کی درآمدات کیلئے زرمبادلہ نہ تھا مگر شوکت عزیز نے کچھ ہی عرصہ میں اس کی حد ۱۲ ارب ڈالر تک پہنچادی جو ایک سال کی درآمد کیلئے کافی تھا۔ ر قرضوں کی وصولی اور ٹیکس اور یوٹیلیٹی بلز کی عدم ادائیگی کے سد باب سے آمد کی مد میں اضافہ ہوا۔

لاقانونیت

شوکت عزیز کی پالیسیوں سے ملک کی اقتصادی حالت تو بہتر ہوگئی۔ ملک کے خزانے میں زرمبادلہ بھی آ گیا۔ معیشت بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوگئی۔ مگر امن وامان کی بدستور حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی گئی۔ ہر طرف مار دھاڑ، چوری چکاری، لوٹ مار، قتل و غارت اور رشوت خوری کا بازار گرم رہا۔ کسی کی نہ تو عزت محفوظ تھی اور نہ ہی زندگی۔ اغوا برائے تاوان روز مرّہ کا معمول رہا۔ کرپشن ملک کو گھن کی طرح کھاتی رہی۔ ہر دفتر، ہر تھانے، ہر شاہراہ اور ہر چوراہے میں کرپشن جبڑے کھولے خونخوار نظروں سے گھورتی رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس قدر نڈر ہوگئے کہ اُنہیں کسی محاسب کا ڈر خوف نہ رہا۔ پولیس چوہا فورس بن کے رہ گئی۔ ہر طرف انارکی کا دور دورہ رہا۔ لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔ معزول چیف جسٹس کے کراچی میں داخلے کو روکنے کیلئے پبلک ٹرانسپورٹ کے ساتھ ساتھ درجنوں کاروں کو جلا کر راکھ کرنے کے علاوہ پچاس کے قریب معصوم جانیں ضائع ہوئیں۔ راولپنڈی میں بم دھماکا ہوا۔ سارے سندھ کے سرکاری اور نجی ادارے جلا کر راکھ کردئے گئے۔ پاکستان ریلوے اور بینکوں کو کھربوں روپے کا نقصان ہوا۔ آٹا مہنگا ہوگیا، دکانیں لوٹ لو! پٹرول مہنگا ہوگیا، پٹرول پمپوں کو جلا کر راکھ کردو! بجلی کی لوڈ شیڈنگ ہوگئی کراچی اور ملتان میں واپڈا کے نہتے دفتری کارکنوں کو اُن کے دفتروں سمیت نظر آتش کردو! پیپلز پارٹی کے کارکنون نے سندھ اسمبلی میں گھس کر سابقہ وزیر اعلیٰ کی جوتوں سے پٹائی کرڈالی۔ قانون کی جنگ لڑنے والوں نے لاہور میں ڈاکٹر شیر افگن کا پہلے تو اُن کے وکیل کے چیمبر میں کئی گھنٹے تک گھیراؤ کئے رکھا اور پھر جب وکلاءٔ کے سپہ سالار نے پناہ دے کر اُنہیں باہر نکالا تو قانون کے اِن پاسبانوں نے پولیس کی موجودگی میں دونوں کی مرمت کرڈالی۔ اِن دونوں ڈاکٹروں کا قصور یہ ہے کہ وہ صدر مشرف کے حامی ہیں۔

خودکش حملے

فرقہ واریت اور مذہبی انتہا پسندی کی بنیاد پر پُر تشدّد کارروائیاں ابھی تک آئے دن کی کہانی ہے۔ پہلے تو طالبان اور القاعدہ کی کارروائیاں افغانستان اور صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں تک محدود تھیں اب تو اُن کا جال ملک کے ہر کونے میں پھیل چکا ہے۔ ہر بڑے شہر میں اُنہوں نے اپنے اڈے قائم کرر کھے ہیں۔ اسامہ بن لادن کے نائب ایمن الظواہری جنوبی وزیرستان کے علاقے وانا میں بیٹھ کر القاعدہ کی کمان کررہے ہیں۔ حکومت نے جب سی آئی اے کی مدد سے ان کے خلاف مہم چلائی تو اُس نے ایک ویڈیو ٹیپ کے ذریعے صدر مشرف کو امریکہ کا ایجنٹ اور اسلام کا غدار قرار دے کر تمام محبِ وطن مسلمانوں سے اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کی اپیل کردی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد جنرل مشرف پر خودکش حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ۲۶ اپریل ۲۰۰۲ء سے لے کر ۲۵ دسمبر ۲۰۰۳ء کے عرصے میں اُن پر چار خودکش حملے کئے گئے۔

مارچ ۲۰۰۳ء میں القاعدہ کے اہم لیڈر خالد شیخ محمد کو گرفتار کرکے پاکستانی حکام نے اُن کے نیٹ ورک پر ایک کاری ضرب لگائی۔ نائن الیون کے سلسلے میں اس شخص کا بہت اہم رول تھا۔ اپنی گرفتاری کے بعد اُس نے بڑے اعتماد سے دعویٰ کیا کہ دیکھتے ہی میں پہلے مرتا ہوں یا جنرل مشرف۔ اس کے ساتھ ہی القاعدہ صدر مشرف کے خلاف اور بھی متحرک ہوگئی۔ چنانچہ ۱۴ اور ۲۵ دسمبر ۲۰۰۳ء کے صرف گیارہ دن کے عرصہ میں اُن کے کانوائے پر دو ایسے خودکش حملے ہوئے جن میں اُن کے حفاظتی عملے کے درجنوں اہلکار کام آئے۔ جنرل مشرف کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ہر دفعہ بال بال بچ گئے۔ اور اُن کیلئے یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اُن پر یہ حملے افواج پاکستان کے نچلے درجے کے ملازمین کی منصوبہ بندی سے کئے گئے تھے۔ حملہ آوروں کی تلاش کے دوران جماعت اسلامی کے بعض عہدے داروں کے گھروں سے القاعدہ کے لیڈر پکڑے گئے۔ امن و امان قائم کرنے والے اداروں نے اُن کے خلاف کارروائی کی تو اسلام کے ٹھکیداروں نے اسلام کو خطرے کی دہائی مچا کر حکومت پر بے دین ہونے کے فتوے صادر کرنے شروع کردیئے۔

جنرل مشرف کے عہد میں انتہا پسندی اور دہشت گردی کی وبا دن بدن بڑھتی گئی۔ بم دھماکے اور خودکش حملے آئے دن کا معمول ہوگیا۔ انہوں نے اپنی سرگزشت میں اس بات پر دکھ کا

اظہار کیا ہے کہ ''وہ ملک جس کے معاشرے میں اکا دُکا شیعہ سُنّی جھگڑوں کے سوا حالات عام طور پر معمول پر رہتے تھے کیوں دِن بدن اِنتہا پسندی کی طرف جا رہا ہے؟'' جنرل مشرف سمیت پاکستان کے اُن تمام سیاسی رہنماؤں کو جو اپنے آپ کو لبرل کہلانا پسند کرتے ہیں پریشانی صرف اس بات کی ہے کہ انتہا پسند جہادی گروپس آپس میں ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ قبل ازیں جب انہی انتہا پسند مذہبی جماعتوں نے ایک پُر امن مسلمان فرقے کے افراد کو خارج از اسلام قرار دے کر اُن کی جان، مال اور عزت پر امن وامان قائم کرنے والے اداروں کے اہلکاروں کی ناک کے نیچے ڈاکے ڈالے تو اُن میں سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اور آج بھی جب کبھی باسی کڑھی میں اُبال آتا ہے تو اُن نہتوں کے اکا دُکا قتل کے ساتھ ساتھ اُن کی عبادت گاہوں میں نمازیوں کو بھی خون میں نہلا دیا جاتا ہے۔ اور ملک کی اعلیٰ عدالتیں عدم ثبوت کا بہانہ بنا کر اِن قاتلوں کو تحفظ دے دیتیں ہیں۔ پنجاب ہائی کورٹ کے ایک جج نے تو ایک مجرم کو رہا کرتے ہوئے یہاں تک چھوٹ دے دی کہ اگر کوئی مسلمان جذبات میں آکر کسی قادیانی کو قتل کر دے تو یہ کوئی قابل گرفت جرم نہیں۔ مگر ایک عدالت ایسی بھی ہے جہاں سے اُنہیں اِنصاف ملتا ہے۔ اور بعض دفعہ تو اِس قدر جلدی اور دور رَس کہ دنیاوی عدالتیں تو سالہا سال تک وہ کام نہیں کر سکتیں۔ اور وہ ہے خدائے ذوالجلال کی عدالت! ویسے تو احمدیوں کی تائید و نصرت کے ہزاروں واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں لیکن یہاں پر میں صرف ایک ایسے واقعہ کے بیان پر ہی اکتفا کروں گا جس نے نہ صرف پاکستان بلکہ اردگرد کے ہمسایہ ممالک کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

۷ اکتوبر ۲۰۰۵ء بروز جمعۃ المبارک بمطابق ۲ رمضان المبارک روزہ رکھنے کے بعد سوا پانچ بجے صبح کے قریب جماعت احمدیہ کے ۲۸ افراد موضع مونگ ضلع منڈی بہاؤالدین کے مقام پر اپنی مسجد بیت الذکر میں نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ اچانک تین نقاب پوش حملہ آور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر آئے۔ ایک نے مسجد کے اندر جا کر خود کار ہتھیار سے چھ منٹ تک اِن نمازیوں پر اندھا دھند فائرنگ کی اور دو نے باہر موٹر سائیکل سٹارٹ رکھی۔ اِس کے بعد وہ تسلی سے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر فرار ہو گئے۔ فائرنگ کے نتیجے میں آٹھ افراد ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔ ہلاک شدگان میں ایک ہی خاندان کے پانچ افراد شامل تھے۔ یاد رہے کہ اُن دنوں حکومت انتہا پسند مذہبی جماعتوں کے مدرسوں میں غیر قانونی طور پر زیرِ تربیت بدیسی جہادیوں کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ حکومت کی توجہ مدرسوں سے ہٹانے کی خاطر اس واقعے سے ایک دن قبل مولوی الیاس چنیوٹی کی قیادت میں ربوہ

ہیں احمدیوں کے خلاف کھلے عام غنڈہ گردی کی گئی۔ جس کی رپورٹنگ بی بی سی ڈاٹ کام نے اُس دن اپنے ویب سائٹ پر تفصیل سے کی جس دن یہ سانحہ پیش آیا۔ انتہا پسند مذہبی جماعتوں کی دہشت کی بنا پر عام طور پر احمدیہ جماعت کے افراد پر ظلم اور تشدد کی رپورٹنگ پاکستان کے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں شجر ممنوع ہے لیکن اس دفعہ بی بی سی کی تقلید میں اگلے دن کے اکثر پاکستانی اخباروں نے بھی اس سانحہ کی رپورٹنگ کی۔ اِن خبروں کی ابھی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ مقتولین کے لواحقین کی آہ و پکار سے خدائے بزرگ و برتر کا عرش لرز اُٹھا۔ عرشِ خدا کی ایک ہلکی سی جنبش نے اِس نام نہاد پاک سرزمین کی دھرتی کو ایسا جھٹکا دیا کہ کیا پہاڑ، کیا میدان، کیا دشت اور کیا دریا سب تہہ و بالا ہو گئے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ کی وہ عمارت جس میں احمدیوں کو دائرہ اسلام سے خارج کیا گیا تھا اُس میں دراڑیں پڑ گئیں۔ ڈر کے مارے سینیٹ کا اجلاس فوری طور پر ختم کرنا پڑا۔ آزاد کشمیر کا دارالخلافہ مظفر آباد جہاں سب سے پہلے جماعت احمدیہ کو غیر مسلم قرار دیئے جانے کی قرارداد پاس ہوئی تھی اُس کا ستر فیصد حصہ تباہ ہو گیا۔ زلزلے کا مرکز بھی اِسی کے قریب بیان کیا جاتا ہے۔ فوج کا کمبائنڈ ملٹری ہسپتال اور اُن کے قلعہ نما مورچے منہ کے بل اوندھے ہو گئے۔ ڈر اور خوف کے مارے لوگ وہاں پر دوبارہ آ کر آباد ہونے سے ڈرتے ہیں۔ اور اب دارالخلافہ وہاں سے منتقل کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کا دارالخلافہ اِسلام آباد جہاں بیٹھنے والے مولویوں کی طرف سے احمدیوں پر مظالم کی خبریں سن کر ٹس سے مس نہیں ہوتے وہاں پر ہر ایک کے سر پر موت منڈلاتی رہی۔ اسلام آباد کا دس منزلہ مرگلہ ٹاور ریت کے قلعے کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ اس ایک ارب روپئے کی عمارت میں رہنے والے ماہوار تین کروڑ روپئے کے قریب کرایہ ادا کرتے تھے۔ پاکستان کا کونسا شہر تھا جہاں تباہی رونما نہ ہوئی۔ منڈی بہاؤالدین نے بھی اپنا حصہ پایا۔ ایک دن پہلے احمدیوں پر قیامت گزری تھی۔ اگلے دن سارا پاکستان اِس قیامت کی لپیٹ میں آ گیا۔ عورتیں، بوڑھے، بچے، مرد و زن، افسر، ماتحت، غرضیکہ ملک اور حکومت کے سربراہ بھی بوکھلائے پھرتے تھے۔ لوگ ڈر کے مارے اپنے گھروں سے باہر کھلے آسمان تلے بیٹھے تھے۔ اور اپنے گھروں میں واپس نہیں جا رہے تھے مبادا پھر کوئی جھٹکا آ جائے۔ محکمہ موسمیات کے مطابق اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں زلزلے کے مزید جھٹکوں کا امکان تھا۔ اُن کی طرف سے مانسہرہ، آزاد کشمیر اور اسلام آباد کے باسیوں کو خاص طور پر متنبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو جانے سے اجتناب برتیں۔ اِن علاقوں میں رات کے وقت اِس موسم میں سردی ناقابل برداشت ہوتی

ہے۔ اس پہ مستزاد یہ کہ اِن تمام علاقوں میں رات بھر بارش ہوتی رہی۔

۱۹ اکتوبر کے اخباروں کے مطابق لاشوں کی گنتی چالیس ہزار تھی۔ ملکی اور غیر ملکی اندازوں کے مطابق چھیاسی ہزار افراد لقمہ اجل اور ستر ہزار کے قریب زخمی ہوئے۔ سب سے زیادہ نقصان مظفر آباد آزاد کشمیر میں ہوا جہاں پورے کے پورے گاؤں ملیامیٹ ہو گئے۔ اس زلزلہ کے نتیجے میں تینتیس ہزار کے لگ بھگ بلڈنگیں تباہ ہوئیں۔ چالیس لاکھ سے زائد افراد بے گھر ہوئے۔ شاید اتنا نقصان تو قوم لوطؑ کا بھی نہ ہوا ہوگا۔ بہر حال سابقہ پیغمبروں کی زیر عتاب قوموں کی طرح کچھ عرصہ کیلئے لوگوں پر خوف خدا طاری رہا جس کے نتیجے میں وقتی طور پر دلوں میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ لوگوں نے متاثرین زلزلہ کی امداد میں دل کھول کر حصہ لیا۔ سب لوگ بے ساختہ پکار اُٹھے کہ یہ عذاب الٰہی ہے۔ کوئی کہتا تھا سورہ فلَقْ اور سورہ اخلاص کا ورد کرو۔ اور کوئی کہتا تھا کہ استغفار کرو۔ نفسا نفسی اور افراتفری کا سماں تھا۔ یہ جذبہ آہستہ آہستہ ٹھنڈا پڑ تا گیا اور لوگ اِس سانحے کو بھول کر پھر سے پرانی ڈگر پر چل پڑے۔

اکتوبر کا مہینہ پاکستان کی تاریخ میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو بھارت نے ماؤنٹ بیٹن کی ملی بھگت سے مسلمان اکثریت والی ریاست جموں کشمیر کا الحاق اپنے ساتھ کرلیا۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کا قتل ہوا۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں بھارت نے سابقہ مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں اُتاریں جس کے نتیجے میں پاکستان دو ٹکڑے ہوا۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں مسٹر بھٹو کی مخالفت کے باوجود ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے فیصلہ کیا کہ ملک کا آئین پارلیمانی طرز کا ہوگا۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں جنرل ضیاءُ الحق نے انتخابات غیر معینہ مدت کیلئے ملتوی کر کے ملک کو مزید آٹھ سال تک مارشل لائیں جکڑے رکھا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو نواز شریف کو دوسری دفعہ خوار ہو کر نہ صرف حکومت چھوڑنی پڑی بلکہ ایک سال تک جیل کی کال کوٹھڑی میں رہ کر آٹھ سال تک جلا وطنی کی سزا بھی بھگتنی پڑی۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء میں مشرف نے انتخابات کروا کر ملک میں پھر سے لولی لنگڑی جمہوریت قائم کر دی۔ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو پاکستان بھر میں تباہ کن زلزلہ رونما ہوا۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو بینظیر کی وطن واپسی پر کراچی میں بم دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ اسی دن سے جنرل مشرف کی حکومت روبہ زوال ہوگئی۔

باب ۲۶

حرف آخر

ہر کمالے را زوالے ہر زوالے را کمال۔ ہر کمالے را زوالے کی تو مجھے سمجھ آتی تھی مگر ہر زوالے را کمال کی کوئی واضح مثال مجھے نہیں ملتی تھی۔ لیکن ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی کا نظارہ دیکھ کر مجھے اِس کی بھی سمجھ آ گئی۔ اور پھر بے نظیر کی آمد کے بعد شریف برادران کی اینٹری نے تو اِس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ یوں تو ۹ مارچ ۲۰۰۷ء کے بعد سے ہی مشرف حکومت کے پاؤں زمین سے اُکھڑ گئے تھے مگر اِن لوگوں کی واپسی نے تو گویا مہمیز کا کام کیا۔ عوام آٹھ سال سے مشرف کا چہرہ دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکے تھے۔ وہ اب تبدیلی چاہتے تھے۔ بے نظیر اور میاں صاحبان کو بھی عوام یکے بعد دیگرے دو دو دفعہ آزما چکے تھے۔ اِن دونوں کے دامنوں پر ملکی دولت کو لوٹنے کے دھبے آج تک موجود ہیں جنہیں پرویز مشرف نے اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کیلئے ''قومی مصالحتی حکم'' کے ذریعے واش کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے مگر پڑھے لکھے عوام کی اکثریت اُن کے اِس اقدام سے مطمئن نہیں ہے۔ پاکستان میں اگرچہ قحط الرجال نہیں۔ مگر اُن کی اکثریت کا تعلق درمیانے طبقے سے ہے۔ اور ملکی سیاست کچھ ایسی ڈگر پر چل نکلی ہے کہ درمیانہ طبقہ تو ایک طرف اب تو امرأ کے بس کا بھی روگ نہیں کہ اسمبلی تو کیا محلے یا گاؤں کے ناظم کے انتخاب میں حصہ لینے کا بھی سوچ سکیں۔ سرمایہ داروں اور وڈیروں کا ایک مخصوص طبقہ پارٹیاں ادل بدل کر ناظم سے لے کر وزیر اعظم کی سیٹ پر براجمان ہو جاتا ہے۔ اور جب اِن سیاستدانوں کی جوتوں میں دال بٹنے لگتی ہے تو انہی میں سے بعض بھاگے بھاگے فوج کے پاس جاتے ہیں اور کسی

جرنیل کے کندھے پر سوار ہو کر عوام کا خون چوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور پھر جب اُس سے اُکتا جاتے ہیں تو ''گو جرنیل گو'' کے نعرے لگانے شروع کر دیتے ہیں مگر اُس وقت تک اُس جرنیل کو اقتدار کا چسکا پڑ چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کمبل کی طرح اقتدار سے چپک جاتا ہے۔ اور اُس وقت تک چپکا رہتا ہے جب تک وہ ملک کو تباہ نہ کر دے یا پھر خود تباہ نہ ہو جائے۔

مشرف کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ دسمبر ۲۰۰۲ء تک سپریم کورٹ نے اُنہیں فوجی وردی کے ساتھ بطور صدر رہنے کی اجازت دیدی مگر ۲۰۰۲ء کے ختم ہونے سے قبل ہی جنرل ضیاءؔ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اُنہوں نے اُسی سپریم کورٹ کی آشیرباد سے ریفرنڈم کے ذریعے اپنے آپ کو اگلے پانچ سال کیلئے صدر منتخب کروالیا۔ اور پھر اسمبلیوں کے قیام کے بعد پارلیمنٹ سے اپنی صدارت کی توثیق بھی کروالی۔ اس کام کیلئے اُنہوں نے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد وردی اُتار دیں گے۔ مگر بعد میں اُنہوں نے اعلان کر دیا کہ چونکہ ایم ایم اے کے مولویوں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے پارلیمنٹ سے توثیق کے وقت اُن کی حمایت نہیں کی اِسلئے اب وہ وردی نہیں اُتاریں گے۔ حزبِ اختلاف کی طرف سے ملک بھر میں اِس کے خلاف زبردست احتجاج ہوا لیکن جرنیل صاحب ڈٹے رہے۔

اُدھر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے ہوا کا رخ دیکھ کر ''سُو او موٹو'' ایکشن لے کر حکومت کے متنازعہ فیصلوں کو کالعدم قرار دینا شروع کر دیا۔ اب چاہیئے تو یہ تھا کہ آٹھ سال تک وردی سمیت اقتدار کے مزے لوٹنے کے بعد جنرل مشرف ملک میں انتخاب کرواتے اور اقتدار قوم کے نمائندوں کے حوالے کر کے عزت سے رخصت ہو جاتے۔ مگر ''رنڈیاں تے وسدیاں نیں بھر مشٹنڈے نئیں وسن دیندے'' کے مصداق یار لوگوں نے اُن کے کان میں پھونک ماردی کہ ''بھاجی اگلی ٹرم واسطے وی سنے وردی ڈٹے رہو! اسیں تہاڈے نال آں۔'' جرنیل صاحب نے کہا ''بھائیو گل تے تہاڈی ٹھیک اے بھر افتخار چودھری سے ڈر لگتا ہے۔ وہ تو ہمارے سارے فیصلے اُلٹائی جارہیا ہیگا۔ اپنے سوٹا نما ' **سُو او موٹو** ' کے ذریعے کبھی سٹیل مل کا سودا کینسل کروا دیتا ہے اور کبھی گوادر کی زمین کی فروخت رکوا دیتا ہے اور کبھی اسٹیبلشمنٹ کے اعلیٰ افسران کو اپنی کچہری میں طلب کر کے سارا سارا دن ایک ٹانگ پر کھڑا رکھتا ہے اور دھمکیاں دیتا ہے کہ گمشدہ افراد کو بازیاب کرو ورنہ جیل بھجوا دوں گا۔ وہ بیچارے میرے پاس آکر روتے پیٹتے ہیں کہ اِس سے ہماری جان چھڑواؤ ورنہ ہمارے لئے نوکری کرنا بہت مشکل ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے منتخب کروا بھی دیا تو وہ

اسے غیر قانونی اور غیر آئینی قرار دے دیگا اور پھر مجھے بے عزت ہو کر جانا پڑے گا۔ اُس کی تو ٹرم بھی ۲۰۱۳ء تک ہے اور اس سے پہلے میرے پاس اُس کو فارغ کرنے کا اختیار بھی نہیں۔'' شوکت عزیز اینڈ کو نے مشورہ دیا کہ سر یہ کون سی مشکل بات ہے! ہم اُس کی چارج شیٹ تیار کرتے ہیں۔ آپ اُسے بلا کر سمجھائیں اور سفیر وغیرہ لگا دینے کا لارا لگا کر اُس سے استعفیٰ لے لیں۔ اگر مان جائے تو ٹھیک۔ نہ مانے تو چارج شیٹ جوڈیشل کونسل میں بھجوا کر اپنی مرضی کے ججوں سے فارغ کروا دیں۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔ چوہدریوں سے مشورہ کیا گیا تو انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ ''جان چھڑاؤ جی! خواہ مخواہ دی بلا پال رکھی اے۔ اک بندے نے ساری حکومت نوں وخت پایا ہویا اے۔ کم مکا کے مٹی پاؤ جی!'' ڈاکٹر شیر افگن کی رائے لی تو انہوں نے بھی کہا کہ یہ آئین کے بالکل مطابق ہے۔ جنرل مشرف کو اپنے مشیروں کا مشورہ پسند آیا۔

عدلیہ سے پنگا

چنانچہ ۹ مارچ ۲۰۰۷ء کو افتخار محمد چودھری چیف جسٹس آف پاکستان کو صدارتی کیمپ آفس میں بلایا گیا جہاں صدر جنرل پرویز مشرف نے فوج کے سینئر جرنیلوں کی موجودگی میں اُن کے خلاف الزامات کی تفصیل بتا کر مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائیں تو یہ سب نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بصورت دیگر اُنہیں مجبوراً اُن کے خلاف قانونی کارروائی کرنی پڑے گی۔ چیف جسٹس آرمی چیف کے سامنے اکڑ گئے۔ جنرل مشرف کو اِس کی توقع نہ تھی۔ اِسلئے وہ اُنہیں اپنے جرنیلوں کے سپرد کر کے خود نماز کے بہانے وہاں سے کھسک گئے۔ بقول چودھری افتخار اُنہیں شام گئے دیر تک حبس بے جا میں رکھ کر جرنیلوں نے ڈرایا دھمکایا مگر جب وہ مستعفی ہونے پر رضا مند نہ ہوئے تو اُنہیں جبری چھٹی پر بھیج کر گھر پر نظر بند کر دیا گیا۔ جسٹس افتخار کے بعد سینیارٹی کے اعتبار سے قائم مقام چیف جسٹس رانا بھگوان داس کا نمبر تھا لیکن وہ اُن دنوں لکھنؤ میں چھٹیاں گزار رہے تھے۔ اُن کی غیر حاضری میں اُسی دن جسٹس جاوید اقبال کو قائم مقام چیف جسٹس کا حلف دیا گیا جس کی سربراہی میں اُسی دن رات گئے سپریم جوڈیشل کونسل کا اجلاس ہوا جس میں حکومت کی طرف سے جسٹس افتخار محمد چودھری کیخلاف ریفرنس پیش کیا گیا۔ اُس کے خلاف چیدہ چیدہ الزامات کی تفصیل کچھ یوں تھی:

☆ سرکاری اہل کاروں کو ڈرا دھمکا کر اپنے بیٹے کو میڈیکل کالج میں داخل کروایا۔ ☆ بعد میں اُس کی محکمہ

صحت میں ۱۷ گریڈ میں تعیناتی کروائی۔☆ اپنے اثر ورسوخ کو بروئے کار لا کر اُسے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں گریڈ ۱۸ کا آفیسر لگوایا۔☆ اپنی حیثیت سے تجاوز کر کے ۱۷۰۰ سی سی کی کار کی بجائے ۳۰۰۰ سی سی کی مرسیڈیز کار زیر استعمال رکھی☆ اپنے خاندان کیلئے لاہور اور اسلام آباد میں متعدد دیگر کاڑیاں استعمال میں رکھیں۔☆ اپنی حیثیت سے بڑھ کر پروٹوکول کیلئے ائر پورٹ پر استقبال کیلئے سینئر آفیسرز کو طلب کیا۔☆ نجی تقریبات میں شمولیت کیلئے سرکاری خرچے پر جہاز اور ہیلی کوپٹر استعمال کیا۔☆ زبانی اور تحریری فیصلوں میں تضاد۔

وکلاء تحریک

ملک بھر کے وکلاء نے چیف جسٹس کی معطلی کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ ۱۳ مارچ سے سپریم جوڈیشل کونسل نے ریفرنس کی سماعت شروع کی۔ معزول چیف جسٹس اپنی رہائش گاہ سے پیشی کیلئے سپریم کورٹ کی طرف روانہ ہوئے تو وکلاء کا ایک جلوس اُن کیساتھ شامل ہوگیا۔ جلوس کو روکنے کی کوشش میں پولیس کے بعض اہل کاروں نے معزول چیف جسٹس سے بھی بدسلوکی کا مظاہرہ کیا۔ ۲۱ مارچ کی پیشی پر وکلاء اور سیاسی جماعتوں نے پھر سپریم کورٹ کا گھیراؤ کیا۔ اِس اثنا میں رانا بھگوان داس نے چھٹی سے واپس آکر ۲۴ مارچ سے جسٹس جاوید اقبال کی جگہ قائم مقام چیف جسٹس کا عہدہ سنبھال لیا۔ وکلاء اور سیاسی پارٹیوں کی طرف سے حکومت کے خلاف بھرپور احتجاج جاری رہا۔ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کی کال پر ملک بھر کی وکلاء تنظیمیں عدالتوں کا بائیکاٹ کر کے سڑکوں پر آگئیں۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ معزول چیف جسٹس کو بحال کیا جائے۔

معزول چیف جسٹس وکلاء اور سیاستدانوں کے کندھوں پر سوار ہوگئے۔ ۵ مئی کو معزول چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ بار کو خطاب کیلئے اسلام آباد سے روانہ ہوئے تو اُن کے قافلے نے جلوس کی شکل اختیار کر لی۔ راستے میں ہر شہر سے وکلاء کے جلوس اُن کے قافلے میں شامل ہوتے گئے۔ اِس طرح سے یہ جلوس پانچ کی بجائے ۲۵ گھنٹے میں لاہور پہنچا۔ روز روز کے احتجاجی جلسے جلوسوں سے حکومت ایک طرح سے اپاہج ہو کر رہ گئی۔ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کی خاطر حزب اختلاف کی سیاسی پارٹیوں نے وکلاء کے ساتھ مل کر کراچی میں بھی اِس قسم کا جلوس نکالنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر منیر اے ملک کے ذریعے اعلان کروایا گیا کہ ۱۲ مئی کو معزول چیف سندھ ہائی کورٹ بار کے ممبران سے خطاب کریں گے۔ مگر اِس دفعہ کراچی کے

ان ان کی آؤ بھگت کیلئے پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ چنانچہ معزول چیف جسٹس کے قافلے کی کراچی آمد سے پہلے ہی انتظامیہ نے ائر پورٹ سے باہر نکلنے کے تمام راستے بند کر دئے۔ شہر سے ائر پورٹ کی طرف جانے والے تمام راستوں پر بڑے بڑے کنٹینر کھڑے کر کے ہر قسم کی آمد و رفت بند کر دی گئی۔ مزید برآں حکومتی پارٹی ایم کیو ایم کے کارکن بھی جلوس کے مقابلے کیلئے تیار تھے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ طرفین کے درمیان بھرپور تصادم ہوا جو تمام دنیا نے الیکٹرانک میڈیا کی حسن کارکردگی سے لائیو دیکھا۔ بپھرے ہوئے سیاسی کارکن نئی نویلی گاڑیوں کو ڈنڈوں سوٹوں سے پاگلوں کی طرح توڑ پھوڑ رہے تھے۔ لوگوں کا سیلاب جوشئے سامنے آتی اُسے بہائے چلے جارہا تھا۔ دونوں طرف سے کھلے عام ہتھیاروں کا استعمال ہوا۔ میدان کارزار کا سا سماں تھا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے بے بس دکھائی دیتے تھے۔ اربوں روپے کے قومی نقصان کے علاوہ چالیس قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ معزول چیف جسٹس اپنی نوکری کی بحالی کی خاطر چالیس انسانی جانوں کی بھینٹ چڑھا کر وکلأ اور سیاسی ٹولے کے ہمراہ واپس لوٹ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

لال مسجد کا پھڈا

انگریزی کی مثال ہے کہ بدقسمتی انسان پر اکیلے وارد نہیں ہوتی۔ ویسے تو لال مسجد کے مولوی عبدالعزیز اور اُس کے برادر خورد غازی عبدالرشید اور بیوی ام حسان نے کئی سالوں سے حکومتی حساس اداروں کی ناک کے نیچے اسلام آباد کے دل میں اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ اور قرون وسطیٰ کے مطلق العنان حاکموں کی طرح لال مسجد سے ملحقہ حکومتی املاک کو ایک ایک کر کے مسجدوں اور مدرسوں کے نام سے اپنی جاگیر میں شامل کرتے گئے تھے۔ پتہ نہیں کس مصلحت کے تحت حکومتی ادارے خاموش رہے۔ جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ نامی مدارس میں زیر تعلیم طلبأ اور طالبات کو سخت مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ جہاد کے نام پر فنون سپاہ گیری میں بھی ماہر بنایا جارہا تھا۔ ان اداروں میں ملکی اور غیر ملکی تشدد پسند جہادیوں نے بھی پناہ لے رکھی تھی جن میں ایسے مفرور اشتہاری بھی تھے جو حکومت کو بم دھماکوں اور دیگر قتل کے مقدموں میں مطلوب تھے۔ سی ڈی اے کے مطابق اُنہیں متعدد بار ان ناجائز تجاوزات کو ہٹانے کے نوٹس دیئے گئے مگر بعض حکومتی وزرأ کی سرپرستی کی میں وہ اُنہیں درخور اِعتنا نہیں سمجھتے تھے۔

۲۷ جنوری ۲۰۰۷ء کو سی ڈی اے نے اِن مساجد کو گرانا شروع کیا تو لال مسجد کی ڈنڈا بردار

فوج نے سخت مزاحمت کی۔ اُنہوں نے اردگرد کی قومی عمارات کو توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا اور جامعہ حفصہ سے ملحقہ حکومت کے زیرِ انتظام چلنے والی بچوں کی لائبریری پر قبضہ کر کے وہاں پر اپنی سر سے لیکر پاؤں تک سیاہ برقعوں میں ملبوس ڈنڈا بردار زنانہ فوج داخل کر دی۔ ان کے خوف اور دہشت سے سارا علاقہ کانپ اُٹھا۔ اس کے بعد مولوی عبدالعزیز کے خطبات میں حکومت کے خلاف متشددانہ اور باغیانہ رنگ پیدا ہو گیا۔ لال مسجد کے اندر غیر قانونی طور پر قائم کردہ ریڈیو سٹیشن سے حکومت کو غیر اسلامی قرار دے کر عوام الناس کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا جانے لگا۔ اور پھر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر ۲۷ مارچ ۲۰۰۷ء سے جامعہ حفصہ اور جامعہ فریدیہ کے طلبا اور طالبات کے جتھوں کے ذریعے اسلام آباد اور اس سے ملحقہ علاقوں میں طالبان کی طرز پر بدی کے خلاف مہم کے نام پر عوام الناس کو ہراساں کیا جانے لگا۔ اُس روز جامعہ حفصہ کی برقعہ پوش ڈنڈا بردار طالبات آنٹی نسیم نامی ایک خاتون کے گھر میں زبردستی داخل ہوئیں۔ اُس عمر رسیدہ خاتون اور اُس کی بیٹی اور بہو کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئیں۔ جہاں اُنہیں کئی دن قید رکھا۔ اُن پر الزام یہ تھا کہ وہ اپنے گھر میں بدمعاشی کا اڈا چلاتی ہیں۔ پولیس نے مداخلت کی کوشش کی تو اُن کے دو اہلکاروں کو بھی یرغمال بنالیا گیا۔

۶ اپریل سے لال مسجد انتظامیہ نے شریعت کورٹ قائم کر کے غیر اسلامی اور غیر اخلاقی جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو سزائیں سنانا شروع کر دیں۔ آنٹی نسیم اور اُس کے خاندان کو توبہ کروا کر رہا کر دیا گیا۔ انہی دنوں وفاقی وزیر صحافت نیلوفر بختیار نے اپنے فرانس کے دورہ میں ایک چیریٹی شو میں حصہ لے کر پیراشوٹ جمپ لگایا۔ اُن کی اِس بہادری پر فرانسیسی پیراشوٹ انسٹرکٹر نے فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر اُنہیں گلے لگا لیا۔ اِس خبر کو میڈیا نے خوب ہوا دی۔ لال مسجد کے مولوی عبدالعزیز نے اُن کے خلاف کھلے عام فحاشی اور بے حیائی کا فتویٰ دیکر اُن کی اِس حرکت کو قابلِ تعزیر قرار دے دیا۔ لال مسجد کے طلبا لاٹھیاں لے کر سارے اسلام آباد میں دندنانے لگے۔ حجاموں کی دکانوں میں داخل ہو کر شیو کروانے والوں کو ڈرایا دھمکایا جانے لگا۔ مزاحمت پر موقع پر سزا کے طور پر پٹائی ہونے لگی۔ ویڈیو اور سی ڈی شاپس سے لاکھوں روپے کا مال نظرِ آتش کیا جانے لگا۔ لوگ سراسیمہ ہو کر بلبلانے اٹھے۔ پولیس نے مداخلت کی تو افسران سمیت اُن کے اہلکاروں کو اغوا کر کے یرغمال بنالیا گیا۔ اِن حالات کو دیکھ کر روزنامہ خبریں کی جانی پہچانی کالم نویس پروین عاطف صاحبہ نے اپنی تشویش کا اظہار کچھ اِس انداز سے کیا:

''جامعہ حفصہ اور لال مسجد اسلام آباد میں جو نئی حکومت' بن رہی ہے ناقابل، یقین اور حیرتناک ہے۔ حکومت خاموش ہے جبکہ ڈنڈا برداروں کا کھیل اب سنجیدہ صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ یہ وہی مولوی ہیں جو گیارہ برس تک ضیا کے زمانہ میں کہتے رہے ہیں کہ عورت کو چادر اور چاردیواری میں بند کریں گے۔ اب انہوں نے عورتوں کا ایک جم غفیر آٹھ آٹھ فٹ کی لاٹھیاں پکڑا کر پتہ نہیں کس کو مارنے کیلئے گھروں سے باہر نکال لیا ہے۔ پھر اُن کے گرد چھدری اور گھنی داڑھیوں والے، اونچی شلواروں اور پوشیدہ چہروں والے ان گنت لٹھ بردار ہیں۔ لال مسجد کے خطیب جس طرح پریذیڈنٹ اور پرائم منسٹر ہاؤس کے کچھ ہی فاصلے پر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ حکومت قائم کرنے کا دعویٰ کررہے ہیں اس کے پیچھے کوئی سازش نظر آتی ہے۔ لال مسجد اسلام آباد حکومت کی موجودگی میں اپنی حکومت قائم کرلے گی۔ اور وہاں پر دس مفتی بیٹھ کر ارد گرد کے لوگوں پر اپنے قانون لاگو کریں گے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور اب جبکہ وہ چاروں طرف ایک عجیب سی سنسنی اور خوف پھیلانے میں کامیاب ہوچکے ہیں حکومت چپ سادھے کھڑی ہے۔ یہ کونسا اسلام ہے جس میں خواتین کا لٹھ بردار لشکر درودیوار سے اُمڈ رہا ہے۔ اور ہر ایک سے لڑنے کو تیار ہے۔...... یہ کیسی خواتین ہیں جن کے سر پر خون سوار ہے۔...... جو مولوی حضرات نوجوان نسل کو تشدد اور انتہاپسندی کی تعلیم دے رہے ہیں اُن کا اپنا پس منظر کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔ لال مسجد کے مولوی عبدالعزیز جس اعتماد سے حکومت کو دھمکیاں دے رہے تھے وہ دہلا دینے والا تھا۔ ہم دھات اور پتھر کے زمانے کے لوگوں کی طرح ڈنڈے اور پتھر اُٹھا کر ایک دوسرے کی طرف پھینک رہے ہیں اور لوگوں کی ایسی اخلاقیات کے ٹھیکیدار بننے کی کوشش کرتے ہیں جو صرف خدا اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے۔''

کاش پروین عاطف جیسے کالم نویسوں کا ضمیر اُس وقت بھی ملامت کرتا جب انہی ملانوں کو خوش کرنے کیلئے ذوالفقار علی بھٹو نے احمدی فرقہ کے لوگوں کو قومی اسمبلی کے ذریعے دائرہ اسلام سے خارج کروایا۔ جس کے نتیجے میں وہ آج تک اپنے ہی وطن میں ہر قسم کے انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ وہ خاموشی سے ہر ظلم برداشت کرتے جارہے ہیں اور انتقامی روش پر یقین نہیں رکھتے۔ اور اپنے امام کی ہدایات پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے پاکستان کی خوشحالی اور سلامتی کیلئے دعاؤں کے ساتھ ساتھ کینہ پرور دشمن کیلئے قرآنی تعلیم کے مطابق اللهم مزقهم كل ممزق و سحقهم تسحيقَ کے ورد کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا اُن کی اِسی پکار کی گونج کی تھرتھراہٹ سے پاکستان لرز رہا ہو۔ افلا یتفکرون!

ایک طرف مولوی پرویز مشرف کی حکومت کیلئے دردسر بنے ہوئے تھے دوسری طرف معزول چیف جسٹس نے اُنہیں قانونی داؤ پیچ میں الجھا رکھا تھا۔ تیسری طرف وکلاً اور سیاسی پارٹیوں نے

وردی کے معاملے میں اودھم مچا رکھا تھا۔ پرویز مشرف کا کہنا تھا کہ وردی اُن کی کھال ہے۔علی احمد کرد کا اعلان تھا کہ ہم اُس کی کھال اُتار دیں گے۔عجیب گرما گرمی کا سماں تھا۔۱۵ مارچ ۲۰۰۷ء کے اکانومسٹ میں Sacking Pakistan's chief justice کے عنوان سے ایک مضمون چھپا تھا۔اُس کا تجزیہ بھی پیش خدمت ہے۔لکھتا ہے:

"THE enemies of General Pervez Musharraf, Pakistan's president, are multiplying. Militants want to kill him, political parties seek to drive him from power and, in recent weeks, his American allies have expressed doubts about his counter-terrorism efforts. This week, the attack came from a new quarter: Pakistan's lawyers, who began unruly protests across the country to denounce the president's attempt to sack the country's top judge, Iftikhar Chaudhry, on March 9th."

۸ مئی کو معزول چیف جسٹس کے سپریم جوڈیشل کونسل کے بعض ججوں کے خلاف تحفظات کی بنا پر قائم مقام چیف جسٹس نے اِس کیس کو سننے کیلئے جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے کی سربراہی میں ۱۳ رکنی فل کورٹ قائم کر دی۔۱۴ مئی سے فل کورٹ نے باقاعدہ کارروائی شروع کی۔ہوا کا رخ دیکھ کر حکومت کے خلاف وکلاء اور ججوں کے گٹھ جوڑ میں سیاسی پارٹیاں بھی کود پڑیں۔بعض لوگوں کا دعویٰ تھا کہ اِس ساری تحریک کے پیچھے شریف برادران کا ہاتھ ہے اور وہی باہر سے نوٹوں کے بریف کیس بھر بھر کر بھیج رہے ہیں۔

بہر حال ذکر چل رہا تھا لال مسجد کے لٹھ برداروں کا۔کہتے ہیں گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ شہر کی کا رُخ کرتا ہے۔چھ ماہ تک حکومت کی خاموشی کو اُس کی بے بسی جان کر اب مولویوں نے چینیوں کے ساتھ پنگا لینے کا پروگرام بنایا۔چنانچہ ۲۳ جون کو لال مسجد کی ڈنڈا بردار فوج کے کارندوں نے اسلام آباد کے اُس علاقے کا رُخ کیا جہاں پر امراء اور غیر ملکیوں کی اکثریت کا آنا جانا ہے۔اِن خدائی خدمتگاروں نے چینیوں کے ایک اکوپنکچر اور مساج سینٹر میں داخل ہو کر پہلے تو وہاں پر موجود عملہ سمیت سب لوگوں کو مارا پیٹا اور پھر سینٹر کے سامان کو شکست و ریخت کا نشانہ بنا کر چینی نژاد عملہ کی چھ خواتین اور ایک مرد کو اغوا کر لیا۔اِن کے مطابق یہ فحاشی کا اڈہ تھا۔اِس پر چینی حکومت کی طرف سے سخت احتجاج ہوا۔اِس واقعہ کی دنیا بھر کے مہذب ممالک نے مذمت کی۔چینی حکومت نے حکومت پاکستان سے اپنے باشندوں کے تحفظ کی ضمانت کا مطالبہ کیا۔وزیر داخلہ آفتاب شرپاؤ کو بیجنگ جا کر چینی حکومت سے معافی مانگنی پڑی۔اور مجرموں کے خلاف کارروائی کی

یقین دہانی بھی کروائی۔ لیکن معاملہ اب خاصا گمبھیر شکل اختیار کر گیا تھا۔ لال مسجد اب مسجد نہیں بلکہ ایک مضبوط قلعہ تھا جس کے اندر جدید قسم کا سامان حرب اور خوراک وافر مقدار میں ذخیرہ کی جا چکی تھی۔ حساس اداروں کی ناک کے نیچے سے ٹماٹروں کے ٹرکوں میں بھر بھر کر اسلحہ کوئٹہ جیسے دور دراز علاقوں سے لال مسجد میں پہنچتا رہا مگر ان ٹرکوں کو چیک کرنے کی کسی کو فرصت نہ ملی۔ یا پھر لال مسجد کے مولویوں کی دہشت سے جرأت نہ پڑی۔ پڑتی بھی کیسے مرحوم جنرل ضیاء اور اُس کے صاحبزادے کے لاڈلے جو تھے۔

اگر یہ سب کچھ امریکی باشندوں کے ساتھ ہوا ہوتا تو حکومت شاید اب بھی خاموش رہتی۔ اسلئے کہ اِن لوگوں کا ہوّا کھڑا کر کے تو جنرل مشرف نے آج تک امریکی حکومت کو وردی سمیت اپنا حمایتی بنایا ہوا تھا۔ مگر چینیوں کے ساتھ یہ بہانہ بازی نہیں چل سکتی تھی۔ چنانچہ حکومت کے وہ وزراء جن کی ان مولویوں کو سرپرستی حاصل تھی اُن کے ذریعے اِنہیں سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ وہ سرکاری املاک کو خالی کر کے کچھ عرصہ کیلئے خاموشی اختیار کر لیں اور حکومت کی رٹ کو چیلنج نہ کریں۔ لیکن پانی اب سر سے گزر چکا تھا۔ مولوی اب حکومت کے خلاف جہاد کی تیاری کر چکے تھے۔ اُنہیں یقین تھا کہ جونہی حکومت اُن کے خلاف کارروائی کرے گی اُن کی کال پر ملک بھر میں اُن کے حق میں مظاہرے ہونے لگیں گے۔ اسلام آباد کے باسی اُن کی مدد کیلئے گلیوں میں نکل آئیں گے۔ صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں کے جہادی فدائی (خودکش) حملوں سے سارے ملک میں دہشت پھیلا کر حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔ لہٰذا مولویوں نے اِن وزرا کی سنی ان سنی کر دی۔ حکومت کے پاس طاقت استعمال کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔

چنانچہ ۳ جولائی کو رینجرز، پولیس اور ایلیٹ فورس کے جوانوں کو لال مسجد کے اردگرد کی سڑکوں پر تعینات کر کے علاقے کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ لال مسجد کے طلباء نے فائر کر کے رینجرز کے ایک سپاہی کو ہلاک کر دیا۔ جامعہ حفصہ کے طلباء اور طالبات مدرسے سے باہر نکل کر اردگرد کی سرکاری عمارتوں میں توڑ پھوڑ کرنے لگیں۔ مشتعل طلباء نے وزارت ماحولیات کی عمارت کو آگ لگا دی۔ سیکورٹی فورسز کے ساتھ جھڑپوں میں دو طالبات سمیت ۱۲ افراد جان بحق اور دو سو کے قریب زخمی ہوئے۔ بعض سیاستدانوں کی مخالفت کے باوجود وزارت داخلہ اور فوجی حکام کی رائے میں قلعہ بند دہشتگردوں کو وہاں سے نکالنے کیلئے اُن کے خلاف آپریشن ناگزیر تھا۔

۴ جولائی کو سیکورٹی فورسز نے لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا محاصرہ کر کے دہشت گردوں کو الٹی

میٹم دیا کہ یرغمال شدہ طلباء کو رہا کر کے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیں ورنہ سب کو ہلاک کر دیا جائیگا۔ اِس اعلان پر طلباء اور طالبات نے ہتھیار ڈال کر اپنے آپ کو حکام کے حوالے کرنا شروع کر دیا۔ برقع پوش طالبات کے ایک گروہ کیساتھ لال مسجد کے خطیب نام نہاد مولانا عبدالعزیز برقع پہن کر فرار ہونے کی کوشش میں پکڑے گئے۔ یاد رہے کہ یہ مولانا عوام الناس کو اپنے خطبات میں یہ بیان کر کے حکومت کے خلاف بغاوت پر اُکساتے تھے کہ حضور پاک ﷺ نے ۳۰۰ سے زائد مرتبہ ان کو خواب میں آ کر جہاد کا حکم دیا ہے۔ خبریں اخبار کے مطابق تو مولوی عزیز نے وہاں سے فرار ہوتے وقت سب کو ہدایت کی کہ جس کو برقع میسر ہو وہ بھاگ جائے باقی لوگ سرنڈر کر دیں۔ بہر حال جب یہ پکڑے گئے تو باقیوں کا راستہ بند ہو گیا۔ تاہم اِن سے پہلے چند ایک دہشت گردوں کا برقع پہن کر فرار ہو جانے کا امکان ہے۔ بڑے بھائی کے برقع سمیت پکڑے جانے کے بعد غازی رشید کو بعد میں اِس قسم کا حربہ استعمال کرنے کی جرأت نہ پڑی۔ جس کی وجہ سے اُس کے رویے میں اور بھی سختی آ گئی۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے اندر مورچہ بند دہشت گردوں اور فورسز کے عملہ کے درمیان کراس فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا جس کے نتیجے میں رینجرز اور طلبا سمیت ۲۲افراد ہلاک ہوئے۔

آپریشن سائیلنس کے نام سے جامعہ حفصہ پر گولہ باری جاری رہی۔ اِس دوران غازی عبدالرشید سے چوہدری شجاعت حسین کی سربراہی میں حکومت کی طرف سے مذاکرات کے ذریعے اُسے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی مگر وہ اپنے ساتھیوں اور ہتھیاروں سمیت فرار کیلئے محفوظ راستے کے سوا کسی اور پیشکش کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا غیر ملکی دہشت گردوں نے اُسے یرغمال بنا رکھا تھا۔ ۸ جولائی کی رات فوج کی کمانڈو بٹالین کا کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل ہارون الاسلام مسجد کی عقبی دیوار میں نقب لگانے کی کوشش میں دہشتگردوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا۔ اِس واقعہ نے محصورین کے سرنڈر کے سوا سارے راستے بند کر دئے۔ مذاکرات کی ناکامی کے بعد ۱۰ جولائی کو علی الصبح سیکورٹی کے جوانوں نے گولہ باری کے ساتھ جامعہ حفصہ اور لال مسجد پر ہلہ بول دیا۔ اِس گولہ باری سے سارا دارالخلافہ لرز اُٹھا۔ مزاحمت کار خاموش اور لال مسجد لہو سے مزید لال ہو گئی۔ تہہ خانے میں محصور غازی عبدالرشید سمیت ۵۰ افراد لقمۂ اجل ہوئے۔ اِن میں دہشتگردوں کے علاوہ یرغمال بنائی گئی بچیاں بھی شامل تھیں۔ سیکورٹی کے تین جوان کام آئے۔ اخبارات میں چھپنے والی تصاویر سے صاف ظاہر تھا کہ لال مسجد انتظامیہ نے

باقاعدہ منصوبے کے تحت اس جگہ کو ایک مضبوط قلعے کی شکل دے رکھی تھی جس میں بیٹھ کر وہ اسلام کے نام پر حکومت کے ساتھ پنجہ آزمائی پر اُتر آئی تھی۔

جامعہ حفصہ کے خلاف آپریشن کے خاتمے کے ساتھ ہی معزول چیف جسٹس کے خلاف ریفرنس کی سماعت بھی اختتام کو پہنچ گئی۔ فیصلہ معزول چیف جسٹس کے خلاف ہونے کی صورت میں کورٹ کے باہر وکلا کی سپریم کورٹ کو آگ لگا دینے کی دھمکیوں اور کورٹ کے اندر جسٹس رمدے کے ریمارکس سے صاف عیاں تھا کہ فیصلہ کیا ہوگا۔ اور گاہے بگاہے قائم مقام چیف جسٹس کی طرف سے بھی بیان شائع ہونے لگے کہ جلد ہی قوم خوشخبری سنے گی۔ اور عدالت کی طرف سے بھی یہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ جج کسی کے دباؤ میں نہیں ہیں۔ تاہم معزول چیف جسٹس کے وکیل مسٹر اعتزاز احسن کا لب ولہجہ صدر مملکت اور اُن کے وکلاء کے خلاف نہایت نامناسب اور سخت تھا جسے عدالت برداشت کرتی رہی جبکہ فریق مخالف کے وکلاء پر جج صاحبان بھی فقرے کستے رہے۔ شریف الدین پیرزادہ جیسے بزرگ قانون دان بھی اُن کے تند و تیز طعن و تشنیع کا نشانہ بنتے رہے۔

حسب توقع ۲۰ جولائی ۲۰۰۷ء کو فل کورٹ کے اکثریتی فیصلہ کے مطابق معزول چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری بحال ہو گئے۔ یہ حکومت کی ناکامی اور وکلاء اور سیاسی پارٹیوں کی جیت تھی۔ اس سے نواز لیگ کے لیڈران کے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے۔ اور اب شریف بردران ملک میں واپس آکر پرویز مشرف سے انتقام لینے کا کھلے عام اعلان کرنے لگے۔ صدر کی طرف سے چیف جسٹس کے بارے میں خیر سگالی کے بیانات اخبارات میں چھپتے رہے اور چیف جسٹس بھی صدر کو قابل احترام، صاف گو اور مثبت سوچ رکھنے والے انسان کے طور پر یاد کرتے رہے۔ مگر اُن کے فیصلوں کا سلسلہ حکومت کے خلاف جاری رہا۔ ۲۴ اگست کو چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی سربراہی میں شریف برادران کی وطن واپسی کی درخواست پر فیصلہ سنایا گیا۔ اس فیصلے کی رو سے اُن کو ملک میں واپس آنے کی اجازت کے ساتھ حکومت کو تنبیہ کی گئی کہ وہ نہ تو شریف برادران کی وطن واپسی میں رکاوٹ ڈالے اور نہ ہی اُنہیں ملک بدر کرے۔ صدر نے بھی اِس فیصلے کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا مگر جب میاں نواز شریف ۱۰ ستمبر کو اسلام آباد ائرپورٹ پر پہنچے تو سپریم کورٹ کے فیصلے کے برخلاف اُنہیں وہیں سے جدہ بھجوا دیا گیا۔ اور اُس وقت کے وزیر اطلاعات ونشریات کی طرف سے بیان دیا گیا کہ میاں صاحب نے جیل جانے کی بجائے جدہ جانا پسند کیا۔ حکومت کی اس کارروائی کے خلاف اے پی ڈی ایم کی تمام جماعتوں نے اگلے دن یوم سیاہ بنایا۔ وکلاء نے

احتجاج کے طور پر ہڑتال کی۔ سپریم کورٹ نے اِس پر حکومت کو توہین عدالت کا نوٹس جاری کردیا۔

پرویز مشرف منتخب اور نہیں بھی!

اُدھر حکومتی پارٹی کی طرف سے پرویز مشرف کو وردی سمیت دوبارہ صدر منتخب کروانے کی بھرپور تیاریاں شروع تھیں۔ مگر اپوزیشن کی تمام پارٹیاں اس بات پر تلی ہوئی تھیں کہ جنرل مشرف کو کسی صورت بھی صدر منتخب ہونے نہیں دینا۔ ایک طرف وکلا تنظیموں نے اُن کے خلاف تحریک شروع کررکھی تھی، دوسری طرف عدلیہ کا ایک گروہ اُن کے خلاف تھا اور تیسری طرف حزب مخالف کی چند ایک سیاسی پارٹیاں تو اُن کے خون کی پیاسی تھیں۔ ۲۰ ستمبر کو جاری کردہ صدارتی الیکشن کے شیڈول کے مطابق ۲۷ ستمبر کاغذات نامزدگی جمع کرانے کی آخری تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ اِس پر اے پی ڈی ایم میں شامل تمام سیاسی جماعتوں نے ۲۹ ستمبر سے اسمبلیوں سے استعفے دیکر حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا منصوبہ بنایا۔ اُن کا خیال تھا اِس طرح اسمبلیاں تحلیل ہو جائیں گی۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ صدارتی انتخابات سے پہلے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے جائیں جو بعد میں صدر کا انتخاب کریں۔ لیکن صدر مشرف اور اُن کی حمایتی پارٹی کو نوشتۂ دیوار نظر آرہا تھا۔ موجودہ اسمبلیوں میں مجموعی طور پر اُن کو اکثریت حاصل تھی۔ اِسلئے وہ اُنہیں اِن اسمبلیوں سے دوبارہ منتخب کرانا چاہتے تھے۔ لہٰذا صدر کے مشیروں نے بی بی اور مولانا فضل الرحمٰن کو رام کر کے اے پی ڈی ایم کے اسمبلیاں تحلیل کروانے کے منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ وکلاء کے احتجاج کی اُنہیں پرواہ نہ تھی۔ ڈر تھا تو عدلیہ کے جسٹس افتخار محمد چوہدری گروپ کا جس میں رانا بھگوان داس، خلیل الرحمٰن رمدے اور اُن کے ساتھی شامل تھے۔ اِن ججوں کا تا حال حکومت مخالفانہ رویہ جاری تھا۔ ۲۷ ستمبر کو پرویز مشرف کے صدارتی اُمیدوار کے طور پر کاغذات نامزدگی جمع ہوتے ہی اُن کو دوعہدے رکھنے کی بنا پر نااہل قرار دئے جانے کیلئے سپریم کورٹ میں دائر شدہ آئینی درخواست کی سماعت کیلئے ۲۸ ستمبر کی تاریخ مقرر کردی گئی۔ نو رکنی بنچ میں سے ۶ ججوں کے اکثریتی فیصلے کے مطابق اُنہیں وردی سمیت الیکشن لڑنے کی اجازت تو مل گئی مگر بنچ کے سربراہ رانا بھگوان داس اور دیگر دو ججوں کے اختلافی فیصلے سے ہوا کا رُخ عیاں تھا۔

۱۲ اکتوبر کو مشرف کے مخالف صدارتی اُمیدواروں مخدوم امین فہیم اور جسٹس (ر) وجیہ الدین نے اُن کے کاغذات نامزدگی کو منظور کیے جانے کے خلاف سپریم کورٹ میں درخواست دائر کردی

جس کی سماعت کیلئے ایک ۱۰ رکنی لارجر بنچ تشکیل دیا گیا۔ اس درخواست کی سماعت کیلئے ۱۵ اکتوبر کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اصولی طور پر ۲۸ ستمبر کے سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں اس درخواست کو ناقابل سماعت قرار دے کر مسترد کر دیا جانا چاہئے تھا مگر فل بنچ نے درخواست دہندگان کی حکم امتناہی کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے پرویز مشرف کو الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت تو دیدی مگر اس حکم کیساتھ کہ الیکشن کمیشن آئینی درخواست کے فیصلے تک حتمی نتیجے کا نوٹیفکیشن جاری نہیں کرے گا۔ اور حسب سابق معاملے کو طول دینے کیلئے اس درخواست کو آئینی معاملہ قرار دیکر اس کی باقاعدہ سماعت کیلئے ۱۷ اکتوبر کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ شیڈول کے مطابق ۶ اکتوبر کو صدارتی انتخاب ہوا۔ اپوزیشن پارٹیوں کے اسمبلیوں سے استعفوں اور پی پی پی کے بائیکاٹ کے باوجود صدر پرویز مشرف ۵۸ فیصد ووٹ لیکر کامیاب ہو گئے۔ پرویز مشرف کا مؤقف تھا کہ اگر وہ دوبارہ صدر منتخب ہو گئے تو آرمی چیف کا عہدہ چھوڑ دیں گے۔ مگر اپوزیشن کی سیاسی پارٹیاں اور وکلا تنظیمیں اس بات پہ تلی ہوئی تھیں کہ وہ اُنہیں کسی صورت میں بھی بطور صدر قبول نہیں۔ اس کیلئے اُنہیں سپریم کورٹ کے فیصلے کی ضرورت تھی۔ سپریم کورٹ کی کارروائیوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ بھی صدر مشرف سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ مگر اس کیلئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ ملک کی دو بڑی اپوزیشن پارٹیوں کے سربراہ ملک سے باہر تھے۔ صدر جنرل پرویز مشرف کے خلاف فیصلے کی صورت میں اُن کی غیر حاضری میں عوام کو متحرک کر کے عملی جامہ پہنانے کی پوزیشن میں کوئی نہ تھا۔ ۱۸ اکتوبر کو بی بی ملک واپس آ رہی تھیں۔ چنانچہ سپریم کورٹ نے اِسی نسبت سے اُن کی آمد سے ایک دن پہلے کی تاریخ مقرر کی۔ صدر نے بی بی کو مشورہ دیا کہ وہ اُن کی صدارت کے بارے میں عدالتی فیصلے سے قبل واپس نہ آئیں۔ اُدھر آئینی ماہرین نے پیشگوئیاں کرنی شروع کر دیں کہ اگر ۱۵ نومبر تک جنرل مشرف نے حلف نہ اُٹھایا تو سینیٹ کے چیئرمین محمد میاں سومرو قائم مقام صدر بن جائیں گے۔ ۱۷ اکتوبر کو گیارہ رکنی بنچ نے درخواست دہندگان کی فل کورٹ کی درخواست مسترد کر کے سماعت کی اگلی تاریخ ۲۴ اکتوبر مقرر کر دی

۱۸ اکتوبر کو بی بی بڑی شان سے دبئی سے کراچی پہنچیں۔ حکومت نے خودکش حملوں کے خطرے کے پیش نظر اُنہیں جلوس کی شکل میں اپنی رہائشگاہ تک جانے سے متنبہ کیا مگر وہ نہ مانیں۔ حسب اندیشہ اُن کے ٹرک کے قریب یکے بعد دیگرے دو زوردار بم دھماکے ہوئے جن کے نتیجے میں ڈیڑھ سو کے قریب معصوم جانیں ضائع ہوئیں۔ سارے جلوس کا مزہ کرکرا ہو گیا۔ بہر حال چند

ہی دنوں میں ہوش وحواس درست کر کے بی بی صاحبہ نے بتدریج جنرل صاحب سے کئے گئے وعدوں سے انحراف کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اُن کے خلاف بیان بازی شروع کر دی۔ بینظیر کے آنے کے بعد ۲۳ اکتوبر سے صدر کے خلاف آئینی درخواستوں کی سماعت شروع ہوئی۔ کوئی ہفتہ بھر عدالتی کارروئی جاری رہی۔ کارروائی کا تفصیلی جائیزہ لینے سے یہ بات عیاں تھی کہ جج صاحبان کی اکثریت کا رجحان زیادہ تر استغاثہ کے حق میں تھا۔ جسٹس رمدے کے ریمارکس تو کھلم کھلا اعلان جنگ کا رنگ رکھتے تھے۔ لارجر بنچ کے سربراہ کے ۲ نومبر کے ریمارکس ملاحظہ ہوں:

'''صدر کی اہلیت کے خلاف دائرآئینی درخواستوں پر فیصلے کے دوران کسی قسم کا دباؤ قبول نہیں کریں گے۔ اور نہ کسی قسم کی ڈکٹیشن لی جائے گی۔ مقدمات کے فیصلے میں تاخیر سے یہ تأثر لیا جارہا ہے کہ شاید یہ عدالت کی وجہ سے ہورہا ہے۔ ہم یہ تأثر زائل کرنے کیلئے اپنے پہلے شیڈول کو تبدیل کرتے ہوئے ہفتہ کو بھی سماعت کرنا چاہتے تھے تاہم اب وکلأ کی درخواست پر پیر (۵ نومبر) کو ہوگی۔ یہ ریمارکس انہوں نے جمعہ کے روز مقدمہ کی سماعت کے دوران دئے۔ اِس دوران دونوں طرف کے وکلأ کے درمیان نوک جھونک ہوتی رہی اور مارشل لأ لگنے یا ایمرجنسی نافذ کئے جانے کی قیاس آرائیاں بھی کی جاتی رہیں۔ لیکن ججز کا مؤقف تھا کہ وہ نہ تو مارشل لأ سے خوف زدہ ہیں اور نہ ہی ایمرجنسی کے نفاذ سے۔ وہ فیصلہ آئین کے مطابق کریں گے۔...... ملک قیوم کا کہنا ہے کہ صدر مشرف ۱۵ نومبر کے بعد بھی وردی رکھ سکیں گے جبکہ اعتزاز احسن کہتے ہیں کہ ۱۵ نومبر کے بعد وہ وردی نہیں رکھ سکیں گے۔ لگتا ہے تاخیر کا سارا ملبہ عدالت پر ڈالا جارہا ہے'' (۱۶۹)

صدر مشرف عجیب مخصمے میں گھرے ہوئے تھے۔ امریکہ اور مغربی ممالک کا دباؤ تھا کہ ملک میں جلد از جلد انتخابات کروا کر جمہوریت بحال کی جائے۔ مگر جیسا کہ خود عدالت کے سربراہ نے محسوس کیا، تأثر واقعی یہ مل رہا تھا کہ کورٹ معاملے کو حیلے بہانے سے لمبا کر رہی ہے۔ اِسلئے کہ ۲۳ تاریخ کی کارروائی میں جسٹس جاوید اقبال نے خود کہا تھا کہ اگلے ہفتے کے آخر تک فیصلہ سنا دیا جائیگا۔ ۲۹ اکتوبر کی کارروائی کے دوران بھی اِس بات کی یقین دہانی کرائی گئی کہ ۲ نومبر بروز جمعہ تک عدالت فیصلہ کر دے گی مگر جمعہ کے روز وکلأ کی مصروفیت کی بنا پر کیس کی سماعت ۵ نومبر پر ڈال دی گئی۔ عدالت کی طرف سے یہ تأثر مل رہا تھا کہ مارشل لأ یا ایمرجنسی سے بھی بچا جائے اور معاملے کو کسی نہ کسی بہانے ۱۵ نومبر سے آگے تک کھینچ کر جنرل پرویز مشرف کی صدارتی مدت کے اختتام کے بعد تک لیجایا جائے۔ تاکہ اُس وقت تک اگلی مدت کیلئے حلف نہ لے سکنے کی بنا پر سینیٹ

کے چیئرمین قائمقام صدر بن جائیں۔ جسٹس افتخار محمد چوہدری محمد میاں سومرو سے حلف لے کر اُنہیں ایوان صدر میں پہنچا دیں۔ اور اِس عدالتی فیصلے کے چھاتے تلے آرمی ہاؤس میں بیٹھے جنرل پرویز مشرف کو وکلاء اور اپوزیشن کی سیاسی پارٹیاں عوامی ریلیوں کے زور پر ''گو مشرف گو'' کے نعروں کے ساتھ چلتا کریں۔

ایک طرف لارجر بنچ کے سربراہ صدر کے کیس کو لٹکا رہے تھے دوسری طرف جناب چیف جسٹس صاحب نے سوا و موٹو کے ذریعے اِنٹیلی جینس ایجنسیوں کے حکام کی دوڑ لگوائی ہوئی تھی۔ اُن کی دوبارہ بحالی کے بعد یہ لوگ اِس قدر بوکھلا گئے تھے کہ اُن کے ایک ''دبکے'' پر خودکش حملوں میں ملوث دہشت گردوں کو بھی چھوڑ دیتے۔ حافظ عبدالباسط، جسے چیف جسٹس نے بالخصوص برآمد کروایا، بعد میں بینظیر قتل کیس میں بھی ملوث پایا گیا۔ یکم نومبر کو چھ ماہ سے لٹکے ہوئے چیف جسٹس سے بدسلوکی میں ملوث پولیس کے اعلیٰ ترین افسران کو مختلف میعاد کی سزائیں سنا کر آئندہ کیلئے ایسے حالات میں اُنہیں انتظامیہ کے احکام کو ماننے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اِن سب واقعات کے تناظر میں آئندہ کے حالات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ ۳ نومبر کے بی بی سی اُردو ڈاٹ کام میں چھپنے والا پاکستان کے اُس وقت کے حالات کا علی احمد خان کا سیاسی تجزیہ ملاحظہ ہو:

''پاکستان میں ہر چیز بے یقینی کی کھونٹی پر لٹکی نظر آتی ہے۔ صدر صاحب کا انتخاب ہو یا اُن کی وردی، مصالحتی آرڈیننس ہو یا انتخابات، کسی چیز کے بارے میں کوئی بھی وثوق سے کچھ کہنے کیلئے تیار نہیں۔ اور اگر کوئی آئیں بائیں شائیں کرتا بھی ہے تو اُس سے نئے وسوسے اور خدشات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اب تازہ ترین یہ ہے کہ ملک میں مارشل لاء یا ایمرجینسی لگ سکتی ہے۔ اِس سلسلے میں وزیر اعظم شوکت عزیز سے دریافت کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ جو بھی ہوگا آئین اور قانون کے مطابق ہوگا۔ ایک اور وزیر فیصل صالح حیات نے کہا ہے کہ ایمرجنسی بھی لگ سکتی ہے اور انتخابات بھی ایک سال کیلئے ملتوی ہو سکتے ہیں۔ بقول اُن کے، یہ بھی آئین اور قانون کے مطابق ہوگا۔

اِس بے یقینی کا سبب وہ مقدمات بھی ہیں جو سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہیں۔ ہر مقدمہ اتنی اہمیت کا حامل ہے کہ جو بھی فیصلہ آئے گا ہنگامہ خیز ہوگا۔ چنانچہ صدر مشرف سمیت پورے ملک کی نظریں سپریم کورٹ کی طرف لگی ہوئی ہیں اور ایک سسپنس کی کیفیت ہے یعنی اگر یہ فیصلہ آگیا کہ صدر صدارت کیلئے نااہل ہیں تو پھر کیا ہوگا۔ اگر یہ فیصلہ آگیا کہ مصالحتی آرڈیننس نافذ العمل نہیں ہو سکتا تو پھر کیا ہوگا۔ اگر یہ فیصلہ آگیا کہ نواز شریف کو واپس بھیج کر عدالت کے فیصلے کی توہین کی گئی ہے اُنہیں فوراً واپس بلایا جائے اور اگر یہ فیصلہ آگیا کہ ۱۸ اکتوبر کے سانحہ میں حکومتی ادارے ملوث ہیں تو پھر کیا ہوگا۔ لوگ اپنے آپ سے

یہ سوال کرنے میں بھی حق بجانب ہیں کہ ملک میں اب ان سوالوں کا جواب دینے والا کوئی رہا ہی نہیں۔''

چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ۳ نومبر کو صدر جنرل مشرف نے اپنے فوجی اختیارات کے تحت ملک بھر میں ایمرجنسی نافذ کر دی۔ آئین کو معطل کر کے عبوری آئینی حکم جاری کر دیا گیا۔ اس حکم کے تحت ملک میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں، منتخب اداروں، قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ کو بحال رکھا گیا۔ رات دیر گئے اپنے قوم سے خطاب میں اُنہوں نے عدلیہ کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ اُن کے صدارتی انتخاب کے خلاف درخواستوں کے فیصلے میں غیر ضروری تاخیر سے ملک میں شدید غیر یقینی کی صورت حال پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے ملک اقتصادی انحطاط کا شکار ہو رہا تھا۔ ملک کی سلامتی کو اندرونی اور بیرونی خطرات در پیش تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس غیر یقینی صورت حال کی تشہیر کر کے نجی اور غیر سرکاری الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے منفی رجحان کو تقویت دی۔ انہوں نے کہا کہ ۹ مارچ کو وزیر اعظم کے کہنے پر اُنہوں نے ایک ریفرنس قانونی اور آئینی تقاضوں کے عین مطابق سپریم جوڈیشل کونسل کو بھیجا۔ سماعت کے دوران اُس کے مندرجات پر غور تک نہیں کیا گیا بلکہ اُسے سیاسی رنگ دے کر ملک کو عدم استحکام کا شکار بنا دیا گیا۔ اُنہوں نے عدلیہ کے فیصلے کو خندہ دلی سے قبول کر کے ملک میں افہام و تفہیم کی فضا بحال کرنے کی کوشش کی مگر عدلیہ کے حکومت مخالف رویّے سے حکومتی نظام مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ حکومتی اہلکار عدالتوں کے چکر لگا رہے تھے، اُن کی بے عزتی کی جا رہی تھی، اُن کو سزائیں دی جا رہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ سپریم کورٹ میں سو سے زیادہ از خود نوٹسز کے تحت دائر کئے گئے مقدمات چل رہے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں درخواستیں زیرِ التوا ہیں۔ یہ درخواستیں زیادہ تر حکومتی اداروں کے خلاف ہیں جن کی بنا پر پولیس کے دو انسپکٹر جنرل سمیت کئی حکام کو سزائیں دی جا چکی ہیں۔

نئے پی سی او کے تحت سپریم کورٹ اور چاروں صوبوں کی ہائی کورٹس کے ججوں کیلئے لازم قرار دیا گیا کہ وہ دوبارہ اپنے عہدوں کا حلف اُٹھائیں۔ جسٹس افتخار محمد چوہدری سمیت ۶۰ ججوں نے حلف اُٹھانے سے انکار کیا۔ چنانچہ حلف نہ اُٹھانے کی بنا پر وہ اپنے عہدوں سے برطرف قرار دئے گئے۔ معزول چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے بیرسٹر اعتزاز احسن کی درخواست پر چھ دیگر ججوں کا بنچ بنا کر ایمرجنسی اور پی سی او کے اجرا کے خلاف حکم امتناعی جاری کر دیا۔ حکومت نے اِن ججوں کو اپنی رہائش گاہوں میں نظر بند جبکہ اعتزاز احسن، منیر اے ملک اور علی احمد کرد کو گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا گیا۔ ۳ نومبر کو ہی جسٹس عبدالحمید ڈوگر نے پی سی او کے تحت حلف اُٹھا کر سپریم کورٹ

آف پاکستان کے ۲۱ویں چیف جسٹس کا عہدہ سنبھالا۔ انہوں نے جسٹس افتخار کا جاری کردہ حکم امتناعی منسوخ کردیا۔ ۷ نومبر کو قومی اسمبلی نے ایمرجنسی اور پی سی او کی توثیق کردی۔ ۱۵ نومبر کو اسمبلیاں اپنی پانچ سال کی مدت پوری کرکے تحلیل ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی وفاقی اور صوبائی حکومتیں بھی ختم ہوگئیں۔ ۱۶ نومبر کو مرکز میں محمد میاں سومرو کی سربراہی میں نگران حکومت قائم ہوئی۔ حسب دستور حزب مخالف کی جماعتوں نے اُس پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔

الیکشن ۲۰۰۸ء

۲۰ نومبر کو الیکشن کمیشن نے انتخابات کا شیڈول جاری کردیا۔ اِس کے مطابق ۸ جنوری ۲۰۰۸ء کو قومی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ایک ساتھ ہونے کا اعلان کیا گیا۔ کاغذات نامزدگی جمع کرانے کی آخری تاریخ ۲۶ نومبر مقرر کی گئی۔ ۲۳ نومبر کو سپریم کورٹ نے صدارتی انتخابات کو درست قرار دے کر صدر پرویز مشرف کو پابند کیا کہ وہ یکم دسمبر سے پہلے وردی اُتار کر دوسری مدت کیلئے صدارت کا حلف اُٹھائیں۔ ۲۴ نومبر کو الیکشن کمیشن نے پرویز مشرف کی صدارتی انتخاب میں کامیابی کا نوٹیفیکیشن جاری کردیا۔ شاہ عبداللہ کی کوششوں سے ۲۵ نومبر کو انتخابات میں حصہ لینے کی غرض سے شریف برادران بھی وطن واپس پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ اگلے دن دونوں بھائی بڑی دھوم دھام سے جلوس کی شکل میں کاغذات نامزدگی داخل کرانے کیلئے ریٹرننگ آفیسر کے دفتر پہنچے۔ پڑتال کے بعد اُن کے کاغذات نامزدگی مسترد کردیے گئے۔ دونوں بھائیوں نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اِس کے خلاف پی سی او ججوں کے پاس اپیل کرنے سے انکار کردیا اور الیکشن میں حصہ لینے سے محروم رہ گئے۔ ۲۸ نومبر کو صدر جنرل پرویز مشرف نے فوج کی کمان جنرل اشفاق پرویز کیانی کے حوالے کرکے اگلے دن بطور سویلین صدر حلف اُٹھالیا۔

۱۵ دسمبر ۲۰۰۸ء کو ایمرجنسی اور پی سی او ختم کرکے آئین بحال کردیا گیا۔ اِس کے ساتھ ہی سیاسی پارٹیوں کی طرف سے الیکشن کی گہما گہمی شروع ہوگئی۔ اے پی ڈی ایم کی وہ سیاسی جماعتیں جنہیں اِس الیکشن میں ناکامی دکھائی دیتی تھی اُنہوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کرکے سب سے زیادہ اودھم مچانا شروع کردیا۔ عمران خان، قاضی حسین احمد اور لیاقت بلوچ تو کیا حکومت کیا الیکشن میں حصہ لینے والی حکومت مخالف جماعتیں سب پر یکساں طور پر برس رہے تھے۔ اُن کے شور شرابے کا لب لباب یہ تھا کہ جیسے بھی بن پڑے صدر مشرف کو اقتدار سے ہٹا کر اُن پر غداری کا مقدم چلایا

نواز شریف کا مطمع نظر بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن وہ انتخابات کے ذریعے حکومت میں آ کر جائے۔ نواز شریف کا مطمع نظر بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن وہ انتخابات کے ذریعے حکومت میں آکر معزول شدہ ججوں کے ذریعے یہ کام کروانا چاہتے تھے۔ اسلیئے اُن کے انتخاب کا نعرہ ہی ججوں کی بحالی تھا۔ بینظیر کی وطن واپسی چونکہ امریکی حکومت کی وساطت سے طے شدہ قومی مصالحتی آرڈر کے ذریعے ہوئی تھی اسلیئے انہوں نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز بھی ابتدائیں دھیمے انداز میں کیا۔ لیکن جب اُسے محسوس ہوا کہ بھوک افلاس کا مارا سارا ملک اینٹی امریکہ اور پرویز مشرف فوبیا کا شکار ہے تو وہ بھی اپنے جیالوں کے جذبات کی عکاسی پر اُتر آئیں۔ اُنہوں نے بھی چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو بحال کر کے اُن کے گھر پر دوبارہ پاکستان کا جھنڈا لہرانے کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ حساس اداروں کے انتباہ کے باوجود اُنہوں نے اپنی سیکورٹی کے انتظامات کو بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اور اِس بات پر ڈٹی رہیں کہ مسلمان اپنی بہن کو نہیں مارتے۔ یہ بات کہتے ہوئے وہ اِس حقیقت کو بھول گئیں کہ اُن کے اپنے صوبہ سندھ میں روزانہ کتنی بہنیں غیرت کے نام پر موت کے گھاٹ اُتار دی جاتی ہیں جس کا ازالہ وہ اپنی حکومت کے دو دورانیوں میں بھی نہ کر سکیں۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں محترمہ نے ایک انتخابی جلسہ میں لاکھوں کے مجمع کو خطاب کیا۔ اُس دن وہ پورے جوبن پر تھیں۔ اُن کی ہر بات ہجوم میں ایک ارتعاش کی لہر سی پیدا کر دیتی۔ وہ اپنے سامعین کو ایک منجھے ہوئے موسیقار کی طرح اپنے ہاتھوں کے اشاروں پر نچا رہی تھیں۔ بالکل اپنے باپ کی طرح۔ کامیاب جلسہ کے بعد جب وہ محفوظ راستہ سے واپس جانے لگیں تو پر جوش ہجوم نے اُن کی بلٹ پروف گاڑی کو مری روڈ پر آ گھیرا۔ اپنے جیالوں کے نعروں کے جواب میں وہ اپنی بلٹ پروف جیپ کی چھت میں بنے ہوئے ہوا لگنے والے سوراخ سے سر باہر نکال کر کھڑی ہو گئیں۔ اور ہاتھ ہلا ہلا کر جیالوں کے نعروں کا جواب دینے لگیں۔ اِسی اثنا میں ایک خودکش حملہ آور نے اُن پر پستول سے تین فائر کئے اور خود کو دھماکے سے اُڑا دیا۔ بی بی کے سر میں گولی لگی اور وہ زخمی ہو کر نیچے سیٹ پر گر گئیں اور ہسپتال پہنچتے پہنچتے دم توڑ گئیں۔ بی بی کے علاوہ ۲۰ آدمی ہلاک اور ۶۰ زخمی ہوئے۔

جب تک بی بی زندہ تھیں وہ مجھے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ لیکن جب وہ شہید ہو گئیں تو مجھے احساس ہوا کہ اُن کی جگہ لینے والا عالمی سطح کا سیاستدان تو ہمارے ملک میں کوئی بچا ہی نہیں۔ اُس دن مجھے پہلی دفعہ اُس کی کمی محسوس ہوئی۔ اُس دن میں اور میرا سارا خاندان بہت رویا۔ اور آج بھی جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہیں۔ اُن کی شہادت پر

ساری دنیا نے ماتم کیا۔ قاتل اور قتل کا منبع تلاش کرنے میں حکومت کے حساس اداروں نے برطانوی خفیہ اداروں تک کی امداد حاصل کی لیکن آج تک قتل کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ اسی مقام پر آج سے ستاون سال قبل پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو بھی ایک انتخابی جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے گولی ماردی گئی تھی۔ اُن کے قتل کا سراغ بھی آج تک نہیں ملا۔ بی بی کی موت کی خبرسن کر سارا ملک جل اُٹھا۔ سب سے زیادہ نقصان سندھ میں ہوا۔ آتش زنی، لوٹ مار، قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ امن وامان قائم کرنے والی فورسز کے حرکت میں آنے تک بیسیوں جانیں ضائع ہوچکی تھیں۔ اربوں روپے کی قومی اورنجی املاک جلا کر راکھ کردی گئی تھیں۔ ریل اور روڈ کے وسائل منقطع ہونے سے کئی روز تک رسدو رسائل کا سلسلہ بند ہوگیا۔ ہر طرف سے ''پاکستان نہ کھپے'' کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ سیاسی پارٹیوں کے احتجاج کے باوجود عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکومت نے انتخابات چالیس دن کیلئے مؤخر کردئے۔ انتخابات کی تاخیر سے عوام کو ہوش آیا تو ملک معاشی تباہی کی طرف چھلانگیں مارتا جارہا تھا۔ بازار سے آٹا غائب تھا۔ دالوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی تھیں۔ سبزی غریب آدمی کی پہنچ سے باہر تھی۔ چاول چینی خوشی غمی میں بھی اُن بیچاروں کی سوچ سے باہر تھے۔ خوردنی تیل اور گھی نایاب تھا۔ دو روپے کی روٹی پانچ روپے میں بھی دستیاب نہ تھی۔ بھوک کے مارے لوگ خودکشیاں کرنے لگے۔ جہاں کہیں آٹا نظر آتا لوگ گِدھوں کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑتے۔ یوٹیلیٹی سٹورز پر عجیب دل ہلا دینے والا سماں ہوتا۔ زورآور دو دو تھیلے چھین کرلے جاتا اور کمزور بیچارا سارا سارا دن قطاروں میں خوار ہوکر شام کو خالی ہاتھ لوٹتا۔ عجیب نفسانفسی کا ماحول تھا۔ قیامت کا منظر اور کیا ہوگا۔

بی بی کی موت نے اُن کے جانشینوں کو شریف برادران کی بی ٹیم بنادیا۔ دونوں پارٹیوں نے مل کر مہنگائی کا ملبہ حکومتی پارٹی پر ڈال دیا اور عوامی مشکلات کو بھول کر ججوں کی بحالی کا ڈنکا بجانے لگے۔ بھوکے ننگے عوام نے سمجھا ججوں کی بحالی میں اُن کے افلاس کا حل ہے۔ چنانچہ وہ اِن کے ڈنکے کی چوٹ پر ناچتے ہوئے ۱۸ فروری کو اُن کے حق میں ووٹ ڈال کر آٹے اور دال کا انتظار کرنے لگے۔ عوامی مسائل کو بھول کر دونوں پارٹیوں کا زور انتقامی سیاست پر تھا۔ اپنی اپنی پسند کے 'غیر جانبدار' ججوں کی بحالی کے طریق کار پر متفق ہونے میں پانچ ہفتے لگادئے۔ مسلم لیگ نواز کے سربراہ اور سپریم کورٹ بار کے صدر بیرسٹر اعتزاز احسن کا مؤقف تھا کہ منتخب وزیراعظم ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے معزول ججوں کو بحال کرے۔ پی سی او کے تحت کام کرنے والے ججوں کو اُن کی

عدالتوں سے نکال کر بحال شدہ ججوں کو اُن کی جگہ بٹھا دیا جائے۔ ضرورت پڑنے پر پولیس فورس کو استعمال کیا جائے۔ جبکہ پی پی پی کے سربراہ کا مؤقف تھا کہ ججوں کی بحالی آئینی پیکیج کے ذریعے ہو جس میں عدلیہ کی آزادی کے ساتھ ساتھ اُن کی تعداد، مدت ملازمت اور اختیارات کو اسمبلی میں ایک بل کے ذریعے پاس کرایا جائے۔ دونوں بڑی اتحادی پارٹیوں نے حکومت بنانے کے تیس دن کے اندر اندر ججوں کو بحال کرنے کا عہد کیا۔ ۲۴ مارچ کو پیپلز پارٹی کے سید یوسف رضا گیلانی نے وزیر اعظم منتخب ہونے کے بعد قومی اسمبلی سے اپنے پہلے خطاب میں جو سب سے پہلا حکم جاری کیا وہ یہ تھا: ''میں گرفتار شدہ اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان کو فوری رہا کرنے کا حکم دیتا ہوں۔'' اگرچہ یہ حکم غیر آئینی اور نا قابل عمل تھا مگر اس حکمنامے پر فوری طور پر عمل درآمد ہوا۔ غیر آئینی اِسلئے کہ اُنہوں نے اُس وقت تک اپنے عہدے کا حلف نہیں اُٹھایا تھا اور نا قابل عمل اسلئے کہ اُن کی وزارتِ عظمیٰ کا ابھی تک نوٹیفکیشن جاری نہیں ہوا تھا۔ بہر حال ایوان صدر کو مرعوب کرنے کی خاطر پہلے سے بنائے گئے منصوبے کے تحت وزیر اعظم کے حکم کو ٹی وی پر سنتے ہی جسٹس افتخار محمد چوہدری بیرسٹر اعتزاز احسن اور اُن کے دیگر وکلأ ساتھیوں کے ہمراہ اپنی رہائش گاہ کی بالکونی پر نمودار ہوئے اور اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا کر لوگوں کے نعروں کا جواب دینے لگے۔ بہر حال جج رہا تو ہو گئے مگر اُن کی بحالی کا سلسلہ ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔

وکلأ کی طرف سے دی گئی تیس دن کی مدت ختم ہونے سے قبل ججوں کی بحالی کیلئے شریف برادران نے دبئی مذاکرات کے ذریعے آصف زرداری کو منانے کی بھرپور کوشش کی مگر اُن کا ایک ہی جواب تھا کہ تیس دن کی مدت کوئی حدیث نہیں۔ آئینی پیکیج تیار ہو رہا ہے۔ جونہی تیار ہو گیا تمام سیاسی پارٹیوں کو اُس پر غور و خوض کیلئے بھجوا دیا جائے گا۔ اِس کے بعد یہ آئینی پیکیج بحث کیلئے قومی اسمبلی میں پیش کر دیا جائے گا۔ قومی اسمبلی سے توثیق کے بعد اُس پر عمل درآمد کر دیا جائے گا۔ حسب وعدہ تیس دن گزرنے کے بعد مسلم لیگ نواز حکومتی اتحاد میں رہتے ہوئے مرکزی حکومت کی وزارتوں سے علیحدہ ہو گئی۔ وزیر قانون کی سربراہی میں تیار کردہ ۶۲ نکاتی آئینی پیکیج اپوزیشن سمیت تمام اتحادی پارٹیوں کو دیدیا گیا۔ جس پر اُن کے آئینی گروپ غور و خوض کر رہے ہیں۔ وکلأ تنظیموں کی طرف سے شروع کی گئی اُلٹی سیدھی گنتی کا ''چالیسواں'' بھی گزر گیا لیکن عمران خان کے بقول جس کے خلاف عوام نے مینڈیٹ دیا ہے وہ تو ابھی تک ایوان صدر میں بیٹھا ہے اور جن ججوں کی بحالی کے نام پر حکومتی پارٹیاں جیتی ہیں وہ ابھی تک معزول اور غیر فعال ہیں۔ ۱۰ جون

سے وکلاءَ نے معزول ججوں کی بحالی کیلئے ملک بھر میں ریلیوں اور لانگ مارچ کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ ان ریلیوں کی دلچسپ اور عجیب بات تو یہ ہے کہ ان میں حکومت کی اتحادی پارٹیاں بھی حصہ لے رہی ہیں اور سب سے آگے مسلم لیگ نواز ہے جو پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب پر حکومت کر رہی ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے وکیلوں، سیاسی لیڈروں، ریٹائرڈ جرنیلوں، لیبر یونین کے ممبران اور عوام نے بھرپور حصہ لیا۔ میاں نواز شریف، اعتزاز احسن، سعد رفیق، چوہدری نثار احمد اور وکلاءَ برادری کے مسخرے علی احمد خورد نے جی بھر کے فوج اور پرویز مشرف پر طعن و تشنیع اور دشنام طرازی سے گولہ باری کی۔ اعتزاز احسن نے ممبران پارلیمنٹ کو وارننگ دی کہ اگر ججوں کو فی الفور بحال نہ کیا گیا تو احتجاج کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اور پھر دھمکی دی کہ ''ہمارے ججوں کو آ لینے دو، پی سی او والوں سے بھی نپٹ لیں گے''۔ اپوزیشن لیڈر چوہدری پرویز الٰہی کا کہنا تھا کہ جناب آپ یہ مظاہرے کس کے خلاف کر رہے ہیں؟ آپ خود حکومت میں ہیں۔ ججوں کو بحال کرنے سے آپ کو کون روک رہا ہے؟ کیوں نہیں بحال کر دیتے؟ پی پی پی والے کہتے تھے کہ ہم جج تو بحال کر سکتے ہیں مگر ڈر لگ رہا ہے کہ اِس کارروائی سے کہیں ہم سب کی چھٹی نہ ہو جائے۔

کہتے ہیں کہ چیونٹی کی جب موت آتی ہے تو اُس کے پر نکل آتے ہیں اور وہ اُڑنے کی کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ اِسی قسم کا معاملہ کچھ پرویز مشرف کے ساتھ پیش آیا۔ اچھا بھلا ایوان صدر میں بیٹھا تھا۔ شاید اُسے یہ آرام پسند نہیں آیا۔ انگریزی کی ایک مثال ہے کہ Let the sleeping dog lie! لیکن مشرف نے اُس عوام کی بھوک ننگ اور افلاس کے غم میں جو پچھلے نو سال سے اُس کی ٹوٹی پھوٹی اُردو سن کر اُس سے بیزار تھے ایوان صدر سے نکل کر صوبائی دارالحکومتوں کے دوروں میں اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے حکومتی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اِس پر پیپلز پارٹی چوکنی ہو گئی۔ اور قبل اس کے کہ پرویز مشرف اُن کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتے حکومتی اتحادیوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ججوں کی بحالی سے پہلے صدر کا مواخذہ کر کے اُنہیں فارغ کیا جائے۔ مواخذے کی تحریک سے پہلے چاروں صوبائی اسمبلیوں نے قراردادوں کے ذریعے صدر سے مطالبہ کی یا تو وہ پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ لیں یا پھر مستعفی ہو جائیں۔ اِن حالات میں اُن کے وہ ساتھی جو بادل نخواستہ اُن کا ساتھ نبھانے پر مجبور تھے بھی عوامی دباؤ کے تحت اُن کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ دو ہفتے کی کھینچا تانی کے بعد ۱۸ اگست ۲۰۰۸ء کو مشرف نے قوم سے خطاب میں اپنے اوپر لگائے گئے تمام الزامات کو غلط ٹھہراتے ہوئے اپنی تمام

پالیسیوں کو قوم کے بہترین مفاد میں قرار دیا۔ اور دعویٰ کیا کہ حکومت کی طرف سے مواخذے کی تحریک کو وہ ناکام بنا سکتے ہیں۔ مگر ایوان صدر اور حکومتی اتحاد میں ٹکراؤ جاری رہے گا جو ملک کے مفاد میں نہیں ہے۔ اِس لئے ملک اور قوم کے بہترین مفاد میں اس کھینچا تانی سے بچنے کی خاطر وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہوتے ہیں۔ پرویز مشرف کے استعفے کی خبر سن کر لوگ اُسی طرح گلیوں میں نکل کر ناچنے لگے جس طرح آج سے نو سال قبل نواز شریف کا تختہ اُلٹنے کی خبر سن کر پیپلز پارٹی کے کارکنوں سمیت لوگوں نے بھنگڑے ڈالے تھے اور مٹھائیاں بانٹی تھیں۔ پاکستان کی تاریخ ہر دس بارہ سال کے بعد اپنی اس روایت کو دہراتی چلی آرہی ہے۔ بہرحال جنرل اپنے ساتھیوں سے آخری سلامی لے کر باعزت طریقے سے رخصت ہو گیا ہے۔ سانپ نکل گیا ہے اور سپیرے لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔ اِس قصے کو میں پرویز مشرف کے آخری خطاب کے آخری کلمہ پر ختم کرتا ہوں ''پاکستان کا اللہ ہی حافظ! پاکستان زندہ باد!''

سیاسی جگادریوں کی پیشگوئیوں کا تو مجھے علم نہیں مگر پاکستان کے سیاسی حالات ہو بہو اُسی نہج پر جا رہے ہیں جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ مشرف کے جانے کے ایک ہفتے کے اندر اندر مسلم لیگ نون اور پی پی پی کے غیر فطری اتحاد کا تیاپانچا ہو گیا۔ آصف زرداری نے اپنے مفادات کی خاطر ایک دفعہ پھر شریف برادران کے قرآن پر لئے گئے حلفیہ معاہدے کو یہ کہتے ہوئے اٹھا کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا کہ یہ کوئی قرآن یا حدیث کا صحیفہ نہیں جس میں حالات کے مطابق تبدیلی نہ ہو سکے۔ میاں صاحبان کو کھسیانی بلی کھمبہ نوچے کے مصداق بادلِ نخواستہ حزب مخالف کا رول اختیار کرنا پڑا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے: '' کچی یاری لڈواں دی لڈو مک گئے یارانے ٹٹ گئے۔''

حسب توقع پرویز مشرف کی رخصتی کے بعد آصف علی زرداری صدارتی اُمیدوار کے طور پر میدان میں اُترے۔ مسلم لیگ ن نے کھل کر مخالفت کی۔ میاں برداران نے اِس دفعہ بھی اپنے ایک ایسے وفادار سپریم کورٹ کے سابقہ جج کو زرداری کے مقابلے کیلئے میدان میں اُتارا جس نے قبل ازیں اُن کے دور میں اپنے باس مگر میاں برادران کے ناپسندیدہ چیف جسٹس آف پاکستان سجاد علی شاہ کے خلاف بغاوت کی۔ اُسے مستعفی ہونے پر مجبور کیا اور پھر اُس کی جگہ خود سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بنا۔ بہرحال میاں صاحبان کو منہ کی کھانی پڑی۔ غیر جانبدار عدلیہ کے دعویداروں کا جانبدار مہرہ پٹ گیا اور جیالوں کا جیالا آصف علی زرداری بھاری اکثریت سے منتخب ہو کر پاکستان کے طاقتور ترین صدر کی حیثیت سے ایوان صدر میں جا پہنچا۔

تاہم آج پاکستان کی عوام ایک عجیب مخمصے کا شکار ہے۔ مہنگائی، بے روزگاری، کم آمدن، گیس اور بجلی کی اذیتناک لوڈشیڈنگ، پٹرول اور سی این جی کی نایابی، اشیائے خورد ونوش کی قلت کے ساتھ ساتھ آسمان سے چھوتی قیمیں، سیاسی جماعتوں کی آپس کی محاذ آرائی، وکلاء کی طرف سے عدالتوں کا بائیکاٹ اور ہنگامہ آرائی، سیاسی کارکنوں کی بلاجواز مجمع سازی اور نعرہ بازی، سرکاری اہلکاروں کی کرپشن، لوٹ مار اور قتل وغارت، بدامنی اور سیاسی ابتری، تشدد اور دہشت گردی، فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی، ڈرگ مافیا اور سمگلنگ، اغوابرائے تاوان اور کلاشن کوف کلچر اور خودکش حملوں کی بھرمار نے سب کو بے سدھ کررکھا ہے۔ ملکی اور غیرملکی ماہرین سرتوڑ کوشش کررہے ہیں لیکن نہ تو ملکی معیشت سنبھل رہی ہے اور نہ ہی امن وامان بحال ہورہا ہے۔ ملک کی جوان نسل بدیس کی طرف رخ کیئے ہوئے ہے۔ انسانی سمگلر لوگوں کو بیرون ملک سنہرے خواب دکھا کر اُن کی عمر بھر کی پونجی دونوں ہاتھوں سے لوٹنے کے ساتھ ساتھ اُن کی زندگیوں سے بھی کھیل رہے ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے بے بس نظر آتے ہیں۔ اُن کی بے بسی سے تنگ آکر لوگ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے پر مجبور ہیں۔ مجرموں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے اُنہیں سرعام زندہ جلایا جارہا ہے۔ اور پھر ان بھیانک مناظر کو متعدد بار ٹیلیویژن پر دکھایا جاتا ہے۔ غضب خدا کا اب تو پولیس کے اعلیٰ حکام نے بھی علی الاعلان لوگوں کو ترغیب دلانی شروع کردی ہے کہ عوام الناس اگر ڈاکوؤں کو پکڑ کر موت کے گھاٹ اُتاردیں تو ایک طرح سے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی امداد ہوگی۔ ایسے میں عوام کی طرف سے مینڈیٹ یافتہ جمہوری جماعتیں آپس میں مل کر ملک کی اقتصادی اور امن وسلامتی کی حالت کو سنوارنے کی بجائے من پسند ججوں کی بحالی کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں کوشاں ہیں۔ آصف زرداری اور نواز شریف نے بلاول بھٹو زرداری اور حسن نواز کیلئے پاکستان کو جس پرامن اور خوشحال ریاست بنانے کا عہدوپیمان کیا تھا اُسے فراموش کرکے آج دونوں لیڈر پھر سے سابقہ حساب کتاب چکانے پر تلے دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک طرف گورنر پنجاب سلمان تاثیر نے خادم پنجاب شہباز شریف کو مولا بنا کر پنجرے میں بند کرنے کا عزم کررکھا ہے تو دوسری طرف نواز شریف نے مڈٹرم انتخابات کا شوشہ چھوڑ کر یوسف رضا گیلانی کو پریشان کررکھا ہے۔ ساری سیاسی پارٹیوں کے کرتا دھرتا اپنے آباؤاجداد کے نقش قدم پر گامزن محلاتی سازشوں میں سرگرم عمل ہیں۔

ایک طرف ملکی اور غیرملکی طالبان اور نیٹو فورسز نے ملک کی سرحدوں کی حرمت کو پامال کررکھا

ہے تو دوسری طرف پاکستان کا ازلی دشمن ممبئی قضیے کو پاکستان کے سر تھوپ کر امریکہ اور اسرائیل کی شہہ پر پاکستان کو جنگ کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ ملک کی سلامتی سخت خطرے میں ہے۔ لیکن ہمارے سیاستدان ہیں کہ ان خطرات سے بے نیاز آپس میں دست و گریبان ہیں۔ زرداری حکومت کی ناکامی ثابت کرنے کی خاطر نواز شریف نے تو ایک غیر ملکی ٹی وی چینل پر پاکستان کو ناکام ریاست تک کا لقب دے دیا ہے۔ اور زرداری صاحب نے اپنی حکومت کی خامیوں پر پردہ ڈالنے کی خاطر پاکستان کو ایشیا کا مردِ بیمار کے خطاب سے نواز ڈالا۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا کے مصداق اپنی نااہلیت کو چھپانے کی خاطر پچھلے ایک سال سے ناقابل گرفت گرانی، بجلی، گیس اور پٹرول کی نایابی کا سارے کا سارا ملبہ مشرف حکومت پر ڈالا جا رہا ہے۔ عوام کو بیوقوف بنانے کی کوشش میں پی پی پی اور اُس کے اِتحادی بڑی ڈھٹائی سے بعض مخصوص ایجنڈے کی حامل نجی ٹی وی چینلز پر آکر آئے دن یہ رٹ لگاتے رہتے ہیں کہ پرویز مشرف کے دور میں شوکت عزیز نے مصنوعی اعداد و شمار سے افراطِ زر اور مہنگائی کو قابو کر رکھا تھا۔ اِس پر ایک منچلے اینکر نے اُس مہمان اداکار سے جب یہ سوال کیا کہ عوام کی بہبود کی خاطر آپ بھی شوکت عزیز والا فارمولہ کیوں بروئے کار نہیں لاتے تو وہ بغلیں جھانکنے لگے۔ جس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک حاکموں، سیاستدانوں، سول اور ملٹری کے بیوروکریٹوں، صنعتکاروں اور تاجروں کے اربوں روپئے کے ذاتی اثاثے یورپ اور امریکہ کے بینکوں میں پڑے سڑ رہے ہوں اُس ملک کی معیشت کیسے ترقی کر سکتی ہے۔ جس ملک کے عوام الناس کا ملکی کرنسی اور بینکوں پر سے اعتبار اِس حد تک اُٹھ جائے کہ وہ اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائدادوں کے بدلے ڈالر لے کر اپنے گھروں میں چھپالیں اُس ملک سے افراطِ زر اور مہنگائی کیسے دور ہو سکتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں اِس دکھ بھری داستان کو ختم کیسے کروں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اِس ملک کے لیڈروں اور حاکموں کو نیکی اور ہدایت کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ پرویز مشرف نے شاید اِنہیں حالات کے پیشِ نظر قوم سے اپنے الوداعی خطاب کو اِن الفاظ پر ختم کیا تھا: ''پاکستان کا اللہ ہی حافظ!''

ہم تو خود آج سے دو دہائیاں قبل اِنہیں لوگوں کے بزرگوں کی ناانصافیوں کا شکار ہو کر اُس پاکستان کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے تھے جس کی بنیادوں کو ہمارے بزرگوں نے اپنے خون سے استوار کیا تھا۔ پچھلی دو دہائیوں سے ہم بہت امن اور سکون میں ہیں لیکن ہمارے بہن بھائی ابھی تک اِس نام نہاد ارضِ مقدس میں تمام انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ آج بھی ہماری مساجد اور

قبرستانوں کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ آج بھی احمدی نمازیوں پر گولیاں برسائی جاتی ہیں۔ آج بھی ہمارے مردوں کو قبروں سے نکال کر درندوں کی چیر پھاڑ کیلئے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس پاکستان میں صرف جماعت احمدیہ کو ووٹ کا حق حاصل نہیں ہے۔ اسلئے کہ اسلام کے ٹھیکیدار اُس وقت تک انہیں مخلوط انتخابات کا حصہ بنانے کیلئے تیار نہیں جب تک یہ اُن کی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو غیر مسلمان تسلیم نہیں کر لیتے۔ ہمیں یہودیوں کا ایجنٹ کہنے والے خود اُن کی روش پر عمل کرتے ہوئے پہلے ہمارے بچوں سے کالجوں میں اُن کے عقیدے کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور جب وہ اُن کو اپنے عقیدے کے بارے میں پوچھے گئے سوالوں کا جواب دیتے ہیں تو ان پر قادیانیت کی ممنوعہ تبلیغ کرنے کا الزام لگا کر اُنہیں کالجوں سے نکال دیتے ہیں۔ اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ جون ۲۰۰۷ء میں اِنہیں الزامات کی بنا پر پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد کے پرنسپل نے بیک جنبش قلم ۲۳ احمدی طلباً و طالبات کو کالج سے خارج کر دیا۔ اِن میں پانچ طلباً ایسے بھی تھے جو اگلے چند ماہ میں ڈاکٹر بننے والے تھے۔ احمدیوں کی اِس ظلم کے خلاف آواز پر نہ کسی وزیر نے، نہ کسی وکیل نے اور نہ ہی کسی جج نے کان دھرا۔ کہاں تھا خودکش حملہ آوروں کے خلاف حکومتی کارروائی کے خلاف سواوموٹو کارروائی کرنے والا غیر جانبدار چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری؟ کیا اُسے احمدی بچے بچیوں کی چیخ و پکار سنائی نہیں دی تھی؟ کیا اُس وقت اُس کے کان بہرے اور ہاتھ شل ہو گئے تھے؟ کہاں تھا آزاد عدلیہ کا علمبردار اعتزاز احسن؟ کہاں تھا طارق عظیم جس کی احمدیوں سے رشتہ داریوں کے ہمیں ہر روز طعنے سننے پڑتے ہیں؟ یاد رکھو اور کان کھول کر سن لو! اور اگر ہو سکے تو لکھ لو کہ جب تک تم مسیح محمدیؑ اور اُس کے خلفاً کی شان میں گستاخی سے باز نہیں آؤ گے، جب تک تم اِس مہدی کے ماننے والوں کو ظلم کا نشانہ بنانے سے ہاتھ نہیں روکو گے، جب تک تم اُن کے انسانی حقوق بحال نہیں کرو گے اُس وقت تک نہ تم چین سے جی سکو گے اور نہ ہی تمہاری نسلیں۔ تم اِسی طرح ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہو گے۔ اندرونی طور پر تم بھوک، افلاس اور باہمی چپقلش کا شکار رہو گے اور بیرونی طور غیر ملکی طاغوطی طاقتوں کی محکومی کے خطرات ہر وقت تمہارے سروں پر منڈھلاتے رہیں گے۔ تمہاری بقا صرف اور صرف وقت کے مسیحا کی پیروی میں ہے جو آج سے سو سال پہلے فرما گئے ہیں:

وقت ہے وقت مسیحا نہ کسی اور کا وقت　　　میں نہ آتا تو کوئی اور ہی آیا ہوتا

ضمیمہ

لندن

10.11.86

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

پیارے مکرم عبدالوحید ظفر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا خط موصول ہوا۔ جو حالات آپ نے لکھے ہیں افسوسناک ہیں۔ احمدیت جس دور سے گزر رہی ہے وہ بڑا تکلیف دہ ہے۔ انشاء اللہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے لازوال فضلوں سے نوازے گا اور دشمن کو اپنے اعمال کی سزا ضرور ملے گی۔ مکافاتِ عمل کی چکی جب چلے گی تو بہتوں کیلئے قابلِ عبرت سبق چھوڑ جائے گی۔

آپ کیلئے اگر ممکن ہے تو آسٹریلیا وغیرہ چلے جائیں۔ اپنا خرچ کریں اور ضروری معمولی خرچ ہو انشاء اللہ دے دیا جائے گا۔ آپ محترم چوھدری حمید اللہ سے راھنمائی لیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات دور فرمائے۔

والسلام

خاکسار

مرزا طاہر احمد

خلیفۃ المسیح الرابع

حوالہ جات

۱) سردار شوکت حیات خاں، گم گشتہ قوم، صفحہ ۱۹۵

۲) ڈبلیو جی چوہدری، Documents and Speeches on Constitution of Pakistan
Green Book house,Dacca 1967 صفحہ ۲۲۔۲۳

۳) سردار شوکت حیات خاں گم گشتہ قوم صفحہ ۲۸۳۔۲۸۶

۴) جسٹس محمد منیر چیف، جسٹس آف پاکستان، From Jinnah to Zia صفحہ ۳۰۶

۵) الطاف گوہر، Ayub Khan, Pakistan` s First Military Ruler صفحہ ۹۰۔۹۱

۶) حمید یوسف، Pakistan, a Study of Political Developments 1947-97 صفحہ ۴۵۔۴۶

۷) چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں، تحدیث نعمت صفحہ ۵۹۸۔۹۹

۸) جنرل فضل مقیم خان، The Story of The Pakistan Army صفحہ ۱۸۰۔۸۱

۹) تنویر احمد میر و مرتضیٰ علی شاہ، پاکستان کے مذہبی اچھوت صفحہ ۵۲۔۵۵

۱۰) ایضاً صفحہ ۷۰۔۷۵

۱۱) سر مورس جیمز، Pakstan Chronicle صفحہ ۱۴

۱۲) جنرل فضل مقیم خان، The Story of The Pakistan Army صفحہ ۱۸۰۔۱۸۱

۱۳) سر مورس جیمز، Pakstan Chronicle صفحہ ۱۴۔۱۵

۱۴) ایضاً صفحہ ۱۸۳

۱۵) چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں، تحدیث نعمت صفحہ ۵۹۹۔۶۰۰

۱۶) جنرل فضل مقیم خان، The Story of The Pakistan Army صفحہ ۱۸۴۔۱۸۵

۱۷) سر مورس جیمز، Pakstan Chronicle صفحہ ۱۵

۱۸) جسٹس محمد منیر چیف جسٹس آف پاکستان,From Jinnah to Zia صفحہ۴۳

۱۹) جنرل فضل مقیم خان، The Story of The Pakistan Army صفحہ۱۸۵۔۱۸۷

۲۰) چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں، تحدیث نعمت صفحہ ۶۰۱

۲۱) الطاف گوہر، Ayub Khan, Pakistan` s First Military Ruler صفحہ ۱۰۶

۲۲) صد سالہ تاریخ احمدیت، شعبہ اشاعت لجنہ اماء اللہ کراچی صفحہ ۳۶۱۔۳۶۲

۲۳) مولانا مودودی، حقیقت جہاد صفحہ ۱۰۔۱۱

۲۴) وسیم گوہر، المیہ مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو صفحہ ۸۵۔۸۷

۲۵) الطاف گوہر، Ayub Khan, Pakistan` s First Military Ruler صفحہ۱۰۳

۲۶) مرتضیٰ انجم، پاکستان میں فوجی حکومتیں ۲۷۔۳۲

۲۷) اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء

۲۸) گزٹ آف پاکستان ۱۹۵۸ء

۲۹) الطاف گوہر، Ayub Khan, Pakistan` s First Military Ruler صفحہ۱۲۵۔۱۲۶

۳۰) کارل جے نیومین، Pakistan unter Ayub Khan, Bhutto und Zia-ul-Haq صفحہ۳۲

۳۱) الطاف گوہر، Ayub Khan, Pakistan` s First Military Ruler صفحہ۱۶۴

۳۲) ایضاً

۳۳) فضل مقیم، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۳۸

۳۴) حمید یوسف، Pakistan, a Study of Political Developments 1947-97 صفحہ۱۱۲۔۱۱۴

۳۵) وسیم گوہر، المیہ مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو صفحہ۱۶۵

۳۶) سردار شوکت حیات، گم گشتہ قوم صفحہ۳۴۹۔۴۸۳

۳۷) چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں، The Agony of Pakistan صفحہ۱۱۸

۳۸ چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں، The Agony of Pakistan صفحہ۱۱۵

۳۹) چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں، The Agony of Pakistan صفحہ۱۲۶۔۱۲۷

۴۰) تنویر قیصر شاہد، An interview with History صفحہ۸۰

۴۱) جنرل فضل میم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۴۶

۴۲) حمید یوسف، Pakistan, a Study of Political Developments 1947-97 صفحہ۱۲۱۔۱۲۲

۴۳) Daily Dawn Karachi 28 Dec 70

۴۴) وسیم گوہر، المیہ مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو صفحہ۲۰۴۔۲۰۶

۴۵) ایضاً صفحہ۲۰۷۔۲۰۸

۴۶) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۴۶
۴۷) ایئر مارشل محمد اصغر خان، جرنیل سیاست میں صفحہ ۲۰۹۔۲۱۰
۴۸) ایضاً صفحہ ۲۱۴
۴۹) سردار شوکت حیات خاں، گم گشتہ قوم، صفحہ ۳۶۷
۵۰) وسیم گوہر، المیہ مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو، صفحہ ۲۱۸۔۲۱۹
۵۱) ایضاً صفحہ ۲۲۰
۵۲) جی ڈبلیو چوہدری، The Last Days of United Pakistan, صفحہ ۲۳۷
۵۳) سر مورس جیمز، Pakstan Chronicle صفحہ ۱۷۴۔۱۷۵☆
۵۴) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۴۸۔۴۹
۵۵) چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں، The Agony of Pakistan صفحہ ۱۳۲
۵۶) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۵۰
۵۷) روزنامہ ڈان کراچی 16 فروری
۵۸) سردار شوکت حیات خان، گم گشتہ قوم صفحہ ۳۷۶۔۳۷۷
۵۹) جنرل کے ایم عارف، ضیاء کے ہمراہ صفحہ ۴۵۔۴۷
۶۰) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۵۳
۶۱) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صفحہ ۵۱
۶۲) روزنامہ اِمروز لاہور ۲ مارچ ۱۹۷۱ء
۶۳) روئیداد خان، پاکستان اِنقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۶۱
۶۴) پاکستان آبزرور ڈھاکہ ۲ مارچ ۱۹۷۱ء
۶۵) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صفحہ ۴۸۔۵۴
۶۶) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۵۶۔۵۸
۶۷) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صفحہ ۵۷
۶۸) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۵۹
۶۹) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صفحہ ۵۸۔۵۹
۷۰) جنرل کے ایم عارف، ضیاء کے ہمراہ صفحہ ۴۷۔۴۹
۷۱) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۶۵
۷۲) راؤ رشید صفحہ، جو میں نے دیکھا صفحہ ۶۷
۷۳) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صفحہ ۵۹

۷۳) ایضاً صفحہ [illegible]

۷۴) [illegible] 1971

۷۵) ذوالفقار علی بھٹو، The Great Tragedy

۷۶) [illegible] پاکستان [illegible] ذوالفقار علی بھٹو، صفحہ ۲۴۱ و ۲۸۹

۷۸) مرتضیٰ انجم، پاکستان میں فوجی حکومتیں، صفحہ ۲۳۶

۷۹) سردار شوکت حیات خاں، گم گشتہ قوم، صفحہ ۳۸۵

۸۰) ایضاً صفحہ ۳۸۶

۸۱) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صفحہ ۷۰۔۷۱

۸۲) سردار شوکت حیات خاں، گم گشتہ قوم، صفحہ ۳۸۶۔۳۹۰

۸۳) تنویر قیصر شاہد، An interview with History صفحہ ۷۱۔۷۸

۸۴) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، صفحہ ۷۵

۸۵) ایضاً صفحہ ۷۵۔۸۵

۸۶) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۳۲

۸۷) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، صفحہ ۸۵۔۸۶

۸۸) ایضاً صفحہ ۹۳۔۹۴

۸۹) جنرل کے ایم عارف، ضیاء الحق کے ہمراہ، صفحہ ۸۵

۹۰) بنگلہ دیش کی دستاویز

۹۱) میجر جنرل سکھونت سنگھ، The Liberation of Bangladesh صفحہ ۹۳

۹۲) جنرل کے ایم عارف، ضیاء الحق کے ہمراہ، صفحہ ۵۸

۹۳) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۱۱۶

۹۴) ایضاً صفحہ ۹۰۔۹۱ -

۹۵) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، صفحہ ۱۰۴

۹۶) ایضاً صفحہ ۱۰۲۔۱۰۳

۹۷) ایضاً صفحہ ۱۰۹۔۱۱۰

۹۸) ایضاً صفحہ ۱۱۱۔۱۱۳

۹۹) مرتضیٰ انجم، پاکستان میں فوجی حکومتیں، صفحہ ۲۴۳۔۲۴۴

۱۰۰) حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ ماخوذ از روزنامہ جنگ

۱۰۱) حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ ماخوذ از روزنامہ جنگ

۱۰۲) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۱۳۶۔۱۳۷
۱۰۳) جنرل کے ایم عارف، ضیأ الحق کے ہمراہ، صفحہ ۷۰
۱۰۴) پروفیسر جی ڈبلیو چودھری، (The Last Days of United Pakistan) صفحہ ۱۹۵
۱۰۵) مرتضیٰ انجم، پاکستان میں فوجی حکومتیں، صفحہ ۲۴۵
۱۰۶) سردار شوکت حیات خاں، گم گشتہ قوم، صفحہ ۴۰۴۔۴۰۵
۱۰۷) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۳۵
۱۰۸) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۱۹۳
۱۰۹) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۱۳۴۔۱۳۵
۱۱۰) مرتضیٰ انجم، پاکستان میں فوجی حکومتیں، صفحہ ۲۴۶۔۲۴۷
۱۱۱) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۱۲۶۔۱۶۸
۱۱۲) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صفحہ ۱۴۰
۱۱۳) ایضاً صفحہ ۱۳۹۔۱۴۳
۱۱۴) ایضاً صفحہ ۱۳۶
۱۱۵) سراج الاسلام، History Of Bangladesh صفحہ ۶۲۲۔۶۷۵
۱۱۶) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۱۲۹
۱۱۷) صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صفحہ ۱۹۷۔۱۹۸
۱۱۸) ایضاً ۱۹۸
۱۱۹) جنرل کے ایم عارف، ضیأ الحق کے ہمراہ، صفحہ ۹۰
۱۲۰) ایضاً صفحہ ۸۹۔۸۱
۱۲۱) ایضاً صفحہ ۸۴
۱۲۲) ایضاً صفحہ ۸۰
۱۲۳) ایضاً صفحہ ۶۴۔۶۵
۱۲۴) وسیم گوہر، المیہ مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو صفحہ ۲۸۶۔۲۸۷
۱۲۵) جنرل کے ایم عارف، ضیأ الحق کے ہمراہ، صفحہ ۸۲
۱۲۶) وسیم گوہر، المیہ مشرقی پاکستان اور ذوالفقار علی بھٹو صفحہ ۲۸۴
۱۲۷) روزنامہ ڈان ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء
۱۲۸) جنرل فضل مقیم خاں، Pakistan`s Crisis in Leadership صفحہ ۲۱۵۔۲۱۶
۱۲۹) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۳۷۔۳۸

۱۳۰) ایضاً ۷۳

۱۳۱) جنرل کے ایم عارف، ضیاُ الحق کے ہمراہ، صفحہ ۶۷۔۶۸

۱۳۲) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۷۶

۱۳۳) حمید یوسف، Pakistan, a Study of Political Developments 1947-97 صفحہ ۱۱۴

۱۳۴) ایضاً صفحہ ۱۴۷

۱۳۵) ایضاً صفحہ ۱۵۰

۱۳۶) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۷۸

۱۳۷) ایضاً صفحہ ۱۰۵

۱۳۸) ایضاً صفحہ ۹۳

۱۳۹) بھٹو صاحب کا 13 جون 1974 کو قوم سے نشری خطاب

۱۴۰) شورش کاشمیری، اقبال اور احمدیت، صفحہ ۵۱۵

۱۴۱) اسرار وڑائچ، قادیانیت کا سیلاب اور ہماری حکمت عملی، صفحہ ۱۶۳

۱۴۲) تنویر احمد میر و مرتضیٰ علی شاہ، پاکستان کے مذہبی اچھوت، صفحہ ۱۰۶

۱۴۳) حمید یوسف، Pakistan, a Study of Political Developments 1947-97 صفحہ ۱۵۹

۱۴۴) جنرل کے ایم عارف، ضیاُ الحق کے ہمراہ، صفحہ ۱۰۶۔۱۰۷

۱۴۵) الطاف گوہر، Ayub Khan, Pakistan` s First Military Ruler صفحہ ۴۳۷۔۴۳۸

۱۴۶) جنرل کے ایم عارف، ضیاُ الحق کے ہمراہ، صفحہ ۱۰۶

۱۴۷) مرزا غلام احمد قادیانی، روحانی خزائن جلد ۳ ازالہ اوہام شائع کردہ 1891 صفحہ ۱۹۰

۱۴۸) کرنل رفیع الدین، بھٹو کے آخری 323 دن، صفحہ ۱۸

۱۴۹) جنرل کے ایم عارف، ضیاُ الحق کے ہمراہ،

۱۵۰) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۸۲۔۸۳

۱۵۱) جنرل کے ایم عارف، ضیاُ الحق کے ہمراہ، صفحہ ۲۹۱

۱۵۲) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۸۳

۱۵۳) جنرل کے ایم عارف، ضیاُ الحق کے ہمراہ، صفحہ ۲۹۷

۱۵۴) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۱۰۸

۱۵۵) ایضاً صفحہ ۹۵

۱۵۶) کرنل رفیع الدین، بھٹو کے آخری 323 دن، صفحہ ۱۱۳۔۱۲۹

۱۵۷) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۸۵۔۸۷

۱۵۸) جنرل کے ایم عارف، ضیاالحق کے ہمراہ، صفحہ ۹۲۵
۱۵۹) اسرار وڑائچ، قادیانیت کا سیلاب اور ہماری حکمت عملی، صفحہ ۲۳۰
۱۶۰) تنویر احمد میر و مرتضیٰ علی شاہ، پاکستان کے مذہبی اچھوت، صفحہ ۱۳۶
۱۶۱) ایضاً صفحہ ۱۳۶
۱۶۲) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۱۱۰
۱۶۳) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۱۶۰
۱۶۴) منیر احمد، نواز شریف مجرم کیوں، صفحہ ۱۶
۱۶۵) روئیداد خان، پاکستان انقلاب کے دہانے پر، صفحہ ۲۶۱
۱۶۶) منیر احمد، نواز شریف مجرم کیوں، صفحہ ۱۴۷۔۱۴۸
۱۶۷) مقبول ارشد، جرنیل بیتی، صفحہ ۹۶
۱۶۸) مقبول ارشد، جرنیل بیتی، صفحہ ۱۶۹۔۱۷۰
۱۶۹) روزنامہ خبریں آن لائن مورخہ ۳ نومبر ۲۰۰۷

کچھ مصنف کے بارے میں

☆میجر عبدالوحید ظفر نے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۶۱ء میں گریجوایشن کیا

☆نومبر ۱۹۶۳ءمیں وہ پاکستان میں بطور کیڈٹ شامل ہوئے۔

☆۱۹۶۵ءکی ہندوپاک جنگ میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ حصہ لیا۔

☆دسمبر ۱۹۶۶ء تا اگست ۱۹۶۹ سابقہ مشرقی پاکستان میں تعینات رہے۔

☆اسی دوران اگرتلہ سازش کیس میں ملوث ملزمان کی حفاظت کی ذمہ داری ان کی یونٹ کے سپرد کردی گئی۔سوا سال تک انہیں اس کیس کے ملزمان سے واسطہ رہا۔اس اثناء میں ان کی اس کیس کے بڑے ملزم شیخ مجیب الرحمٰن سے شناسائی ہوگئی جو ہوتے ہوتے دوستی میں بدل گئی۔

☆۱۹۷۱ءمیں بطور میجر سیالکوٹ کے ظفروال سیکٹر پر دادِ شجاعت دیا۔

☆۱۹۷۶ءمیں کمانڈ اینڈ سٹاف کالج کوئٹہ سے گریجوایشن کیا۔

☆جولائی ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے بعد پی پی اور پی این اے کے سرکردہ رہنماؤں کو فوجی حفاظت میں لے کران کی پلٹن کی تحویل میں دے دیا گیا۔تین ہفتے تک ان لیڈروں کی حفاظت اور خدمت کے دوران انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

☆۱۹۷۹ءمیں انہیں فوج سے ریٹائرڈ کردیا گیا۔

☆ریٹائرمنٹ کے بعد آٹھ سال تک مذہبی تعصب کی بنا پر جنرل ضیاء کی حکومت کی استحصالی پالیسیوں کا شکار رہنے کے بعد ۱۹۸۷ءمیں اپنے امام کے حکم پر ہجرت کرکے جرمنی چلے گئے۔

☆وہاں پرانہوں نے کولون یونیورسٹی سے جرمن زبان سیکھی۔تین سال تک جرمن قانون پڑھا۔اور پھر جرمن عدلیہ اور انتظامیہ میں بطور مترجم کام کرنا شروع کردیا۔

☆اسی دوران میں اُنہوں نے اپنی زندگی کے تجربات کو ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا۔

☆پاکستان کی شکست وریخت کے ذمہ دار سیاسی اور فوجی رہنماؤں کو اُنہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

☆قصوروار کون؟میں انہوں نے پوری تحقیق کیساتھ پاکستان کو ایک اعتدال پسند ریاست سے انتہاپسند ریاست میں تبدیل کرنے والوں کی نشاندہی کی۔

- یہ کتاب مصنف نے اپنی فوجی اور غیر فوجی زندگی کے تجربات کی بنا پر ذاتی سرگزشت کی صورت میں لکھی ہے۔ بچپن سے لے کر آج تک انہوں نے پاکستان کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حلقوں میں جو کچھ رونما ہوتے دیکھا اسے انہوں نے اپنے جذبات اور احساسات کی ملونی سے بالاتر ہو کر اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔
- یہ کتاب ان کے پاکستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کے گہرے مطالعے کا نچوڑ ہے۔
- اگرتلہ سازش کیس کے بڑے کرداروں سے ان کو براہ راست واسطہ پڑا۔
- مشرقی پاکستان میں گھیراؤ جلاؤ کے عمل کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔
- ایوب خان کا عروج اور زوال دیکھا۔ فوجی جرنیلوں اور بھٹو کی ملی بھگت سے ایوب کی حکومت کو گرتے اور پاکستان کو دولخت ہوتے دیکھا۔
- بھٹو کا عروج اور پھر بے یار و مددگار تختۂ دار پر لٹکتے دیکھا۔
- پاکستان کی اعتدال پسند ریاست کو دولخت کر کے انتہا پسندی، فرقہ پرستی اور تشدد کی راہ پر ڈالنے والوں کے انجام کو دیکھا۔
- آج ہر پاکستانی پاکستانی کی بجائے اپنی علاقائی شناخت کا خواہاں ہے۔ ہر شخص پاکستان سے فرار چاہتا ہے۔ کیوں؟

ان تمام سوالات کا جواب مصنف نے اپنی اس حقیری کوشش میں مہیا کرنے کی سعی کی ہے۔